امين الملڪ نواب

مير محمد معصوم بکري

تاليف

ر حسام الدين راشدي

مترجم

ڪٽر نوازعلي شوق

سنڌي ادبي بورڊ

امین الملک نواب

میر محمد معصوم بکھری

(944ھ- 1014ھ)

(مؤرخ، شاعر، سپاهی، امیر اور ڈپلومیٹ)

تالیف

پیر حسام الدین راشدی

مترجم

ڈاکٹر نواز علی شوق

سندھی ادبی بورڈ

جام شورو، سندھ

2011ء

کتاب ہذا کے جملہ حقوق سندھی ادبی بورڈ کے پاس محفوظ ہیں

اشاعت اول　　　اگست 2011ء　　　تعداد ایک ہزار

کتاب ہذا کے کسی بھی حصہ کو ادارے کی اجازت کے بغیر، الیکٹرانک یا کسی دوسرے طریقے،
جس میں اسٹوریج یا ریٹریول سسٹم شامل ہو، بروئے کار نہیں لا سکتا۔

قیمت: چار سو تیس روپے

[Price Rs: 430-00]

ISBN 978-969-406-027-9

خریداری کیلئے:

سندھی ادبی بورڈ کتاب گھر

تلک چاڑھی، حیدر آباد سندھ

(Ph: 022-2633679, Fax: 022-9213422)
Email: sindhiab@yahoo.com
www. Sindhiadabiboard.org

یہ کتاب میسرز سندھیکا اکیڈمی کراچی سے مسٹر الھڈتو وگھیو سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ نے شایع کی۔

فہرست

پبلشر نوٹ	الھڈتو گھیو	(ج)
مترجم کا نوٹ	ڈاکٹر نواز علی شوق	(د)
باب پہلا	خاندان اور ان کے بزرگ	1
باب دوسرا	حسب نسب اور نسب نامہ	15
باب تیسرا	سید میر صفائی	26
باب چوتھا	میر سید کلاں کھابڑوٹی سیوہانی	44
باب پانچواں	سید صفائی کے دور میں سندھ کی سیاسی اور ملکی حالت	52
باب چھٹا	سید صفائی کے آثار	72
باب ساتواں	میر معصوم کی ولادت	77
باب آٹھواں	میر معصوم: نام، لقب، تعلیم اور تربیت	85
باب نواں	زندگی کے کشمکش کی ابتداء	98
باب دسواں	اکبری دربار میں شروعاتی زندگی	109
باب یارھواں	گجرات کی مہم اور قیام	117
باب باروان	گجرات سے لاہور روانگی	132
باب تیرھوان	سندھ پر یلغار	135
باب چودھواں	لاوارث سندھ پر غیروں کی یورش	147
باب پندرھواں	بکھر میں قیام، سیوی کی فتح	155
باب سولھواں	قندھار میں فوجی خدمت اور قیام	161

باب سترھواں آسیر (خاندیش) کی مہم ---------- 172
باب اٹھارواں ایران کی سفارت اور سفر کی روئیداد ---------- 183
باب انیسواں ایران سے واپسی، اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی ---------- 230
باب بیسواں بکھر کی طرف واپسی ---------- 237
باب اکیسواں وفات ---------- 242
باب بائیسواں ذاتی زندگی، سیرت اور کردار ---------- 248
باب تیئیسواں علم و فضل اور تصانیف ---------- 268
باب چوبیسواں یادگار اور آثار ---------- 288
باب پچیسواں اولاد ---------- 326
باب چھبیسواں بھائی ---------- 340
باب ستائیسواں معصومی خاندان کی چند قابل ذکر افراد ---------- 344
باب اٹھائیسواں ھمکار اور احباب ---------- 348
باب انتیسواں شاعری ---------- 374
باب تیسواں کتبات ---------- 443

اضافہ

تاریخ سندھ میر معصوم ---------- 493

اشاریہ

رجال ---------- 497
اماکن ---------- 509

پبلشر نوٹ

کتاب "امین الملک نواب میر محمد معصوم بکھری" مغل دوُرِ حکومت کے ایک جید عالم، صفیر، ادیب، شاعر اور تاریخ نویس کی شخصیت اور علمی کارناموں سے متاثر ہو کر سندھ کے نامور محقق اور تاریخدان جناب پیر حسام الدین راشدی نے تصنیف کی۔

اس کتاب میں میر معصوم جیسی عظیم شخصیت کے متعلق مکمل معلومات کے ساتھ میر صاحب کے دوُر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے باوجود اس تذکرے میں پیر صاحب نے مغلیہ دوُرِ حکومت کے اس عظیم سیاستدان اور منتظم کے متعلق جو حالات قلمبند کیے ہیں وہ سندھ کی تاریخ کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ویسے تو کسی علمی ادبی اور تاریخی شخصیت کے متعلق مکمل اور دُرست حالات جمع کرنا بہت مشکل اور کٹھن کام ہے، جس کیلئے شخصیتون کو نہیں بلکہ اداروں کو مثبت کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن پیر صاحب نے جس محنت سے اس کتاب کو تاریخی حقائق سے سنوارا ہے اس کا اندازہ پڑھنے سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

اس تاریخی کتاب کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے ادارے کی پبلیکیشن کمیٹی نے کتاب کے اردو ترجمے کی منظوری دی اور یہ کام جناب ڈاکٹر نواز علی شوق صاحب کو سونپا گیا۔ جنہوں نے نہایت ہی خوش اسلوبی اور کم وقت میں اس ضخیم کتاب کا سلیس زباں میں ترجمہ کر کے ادارے کے سپرد کیا۔ جس کیلئے ادارہ ڈاکٹر صاحب کا شکر گذار ہے۔

میں ادارے کے سربراہ جناب قبلہ مخدوم جمیل الزماں صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے کتاب کی اشاعت کے متعلق مفید مشوروں سے نوازا، جس کی وجہ سے یہ کتاب تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں اور ادب دوستوں کے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔

امید ہے کہ ہماری یہ کاوش شائقین علم وادب میں مقبول پائی جائیگی۔

جام شورو سندھ	الھڈتو گھیو
۵ رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ	سیکریٹری
۶ اگست ۲۰۱۱ء	سندھی ادبی بورڈ

مترجم کا نوٹ:

پیر حسام الدین راشدی ایک عالمی شہرت یافتہ عالم اور محقق تھے۔ وہ ابتدائی دور میں صحافت سے وابستہ رہے اور صحافتی زندگی میں ھی ان کے ادبی ذوق و شوق کو فروغ ملا۔ سالہاسال سکھر میں مقیم رہے، جو ایک تاریخی شہر ھے۔ دریا کے اس پار روھڑی کا قدیم شہر اور بیچ میں بکھّر کا تاریخی قلعہ، روھڑی اور سکھر میں میر معصوم کے آثار خاص طور پر میر معصوم کا تاریخی مینار سکھر کے بیچ میں بلند و بالا ھر وقت نظر آنے والا تاریخ اور تاریخی آثار سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو اپنی بے زبانی سے تحقیق کی دعوت دیتا ھوا نظر آتا ھے۔ اس مینار کو ھر روز دیکھنے کے بعد لازمی طور ایک محقق کے دل میں تحقیق کا جذبہ اُبھرتا ھے۔ اور اس جذبے کے تحت میر معصوم کی گو ناگوں شخصیت کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ان کے دیگر تاریخی آثار کو دیکھنے کی آرزو بیدار ھوتی ھے۔

پیر صاحب نے اپنی اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ھے:

"میر معصوم بکھری کی شخصیت سے میں اس وقت متاثر ھوا، جب ۱۹۲۸ء میں سکھر آکر میں نے مینار اور قبرستان دیکھا۔ اس وقت عام اعتقاد کے مطابق میں نے میر معصوم کو ایک ولی اللہ سمجھا اور مینار کے متعلق مشہور روایت پر، کہ میر صاحب نے ایک غیر مسلم لڑکی کے عشق میں گرفتار ھو کر یہ مینار تعمیر کروایا مجھے اعتبار کرنا پڑا۔

میر صاحب کے لئے زیادہ اُنس ھوا اور ان کے احوال و آثار کے سلسلے میں تجسس تب بڑھا جب ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء کی ایک شام، سخت سردی کے موسم میں پرانے سکھر کے معصومی خاندان نے اپنے ایک معزز شخص کی دستار بندی کی مجلس منعقد کی، ایک شاندار جلسہ کا اھتمام کیا، مختلف لوگوں نے تقاریر کیں، سکھر میں مسلسل قیام کے سبب میری دلچسپی بڑھتی گئی اور میں نے میر کے متعلقات کا مواد جمع کرنا شروع کیا۔

یہ ایک حقیقت ھے کہ پیر صاحب کی زیادہ دلچسپی تاریخ و تذکرہ کی کتب سے تھی انھوں نے مختلف خاندانوں کے کتب خانوں سے تاریخ و تذکرے کے مختلف مخطوطات خرید کر سندھی ادبی بورڈ میں محفوظ کئے اور پھر ان میں سے کچھ بنیادی ماخذ مدوّن کر کے ادبی بورڈ اور دوسرے اداروں سے شائع کروائے۔ اسی طرح انھوں نے سندھ کی علمی

و تہذیبی زندگی کو حیات نو عطا کی۔

پیر صاحب کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ سندھ تاریخی دفینوں اور دیگر تاریخی آثار سے مالا مال ھے، سندھ کے ان تاریخی و ثقافتی ورثوں کی شناخت، نشاندھی اور تدوین بہت ضروری تھی۔ اس لئے انھوں نے ایک جامع منصوبہ بندی کے تحت دستاویزات، مخطوطات و دیگر نوادرات جمع کئے۔

میر معصوم کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف بلند پایہ شاعر تھے، بلکہ تاریخ نویس، سفارت کار، عمارت سازی کے دلدادہ اور کتبہ نویسی کے ماہر تھے۔ انھیں باغات سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ ایک سخی مرد، بہادر سپاھی، حسن اخلاق اور شرافت کے پیکر تھے۔ ایسی ھمہ جہت شخصیت پر کتاب لکھنا، آسان کام نہیں تھا، لیکن پیر صاحب کا یہ کمال ھے انھوں نے سالہا سال کی محنت سے میرمعصوم کی شخصیت اور ان کے علمی و تاریخی آثار پر ایک جامع کتاب لکھی۔

پیرحسام الدین راشدی میرے محسن تھے۔ میں نے ان کی رھنمائی میں Phd کا مقالہ لکھااور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوا اور ان کی محبتوں اور شفقتوں نے مجھے ان کا گرویدہ بنادیا۔ ان کے احسانات کا بدلہ مجھ سا فقیر آدمی کیا دے سکتا ھے۔ بس میں نے سوچا کہ بقیہ زندگی ان کی نذر کرکے ان کی سندھی میں لکھی ہوئی کتابوں کا اردو ترجمہ کروں گا۔ اس طرح ان کی یاد بھی تازہ ھوتی رھے گی اور اردو زبان میں کتب شائع ھونے سے ان کی کتابیں پڑھنے والوں کا دائرہ وسیع ھوجائے گا۔ اور اُردو میں سندھ کی تاریخ کے حوالے سے اضافہ بھی ھو گا۔

کتاب **"میرمعصوم بکھری"** آپ کے ھاتھوں میں ھے اور دوسری کتاب **"مکلی نامہ"** بھی شائع ھوچکی ھے حدیقۃ الاولیاکااردو ترجمہ مکمل کرلیا ھے اور ابھی ان کی ایک اھم کتاب "تذکرہ امیر خانی" پر کام جاری ھے۔ انشاء اللہ جلد ھی یہ کتابیں بھی شائع ھوجائیں گی۔ میں سندھی ادبی بورڈ کے چیئرمین عالیٰ جناب مخدوم جمیل الزماں صاحب، صوبائی وزیر محکمہ بین الصوبائی امور کا بے حد ممنون ھوں کہ ان کی دلچسپی اور تاکید کے سبب یہ کتاب اس خاص موقع پر شائع ھوئی ھے۔ مجھے امید بلکہ یقین ھے کہ ان کی سر پرستی اور رھنمائی میں سندھی ادبی بورڈ مثالی ترقی کرے گا۔

کراچی۔ 12 فروری 2011ء

نواز علی شوق

باب ۔ ا

خاندان اور ان کے بزرگ

میر معصوم کے خاندان کا تعلق ترمذی سادات کی اس شاخ سے ہے جس کا سلسلہ حضرت امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے۔ قبل اس کے کہ نسب نامے پر بحث کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خاندان کے کچھ قدیم بزرگوں کا ذکر کیا جائے جن کے متعلق معلومات دست یاب ہوسکی ہیں۔

ا ۔ بابا حسن ابدال

میر معصوم نے اپنی تاریخ سندھ میں قندھار کا احوال لکھتے وقت اس بزرگ کا ذکر کیا ہے اور تاریخ کے دیباچے اور اپنے کتبوں میں اپنا سلسلہ ان سے ملایا ہے۔

بابا حسن ابدال ترمذ [1] کے صحیح نسب سادات میں سے تھے۔ انھوں نے ابتدائی زندگی میں وطن چھوڑ کر زیارتِ حرمین کے لیے سفر کیا۔ جہاں کچھ سال گزارنے کے بعد شاہ رخ مرزا، والی خراسان (۸۰۷-۸۵۰ھ) [2] کے زمانے میں ترکی (روم) کے راستے سے سبزوار [3] پہنچے۔ شاہ رخ مرزا کی ان کے ساتھ عقیدت تھی اس لیے ان کے ساتھ قندھار کے قریب "لنگر" گاؤں میں آئے اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کی۔ میر معصوم کا بیان ہے کہ اس بزرگ نے اپنے مریدوں سے کہا تھا کہ اس مٹی سے مجھے محبت کی خوشبو آرہی ہے [4]۔

زندگی کے کاروبار (مصروفیات) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اسی گاؤں میں مدفون ہوئے۔ یہ گاؤں ارغنداب کے قریب ایک سرسبز و شاداب مقام ہے۔ جس کے متعلق میر معصوم نے لکھا

ہے کہ: "یہ فیض والا مقام اور کمال صفائی والی جگہ ہے"۔ اور لکھا ہے کہ آتے جاتے لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ "اس جیسے مقام کی مثال مشکل ہی سے ملے گی"۔[۵]

میر معصوم نے قندھار کے آس پاس کے ان چند مقامات کا بھی ذکر کیا ہے جن کا کسی نہ کسی طور پر بابا حسن ابدالی کی کرامات سے تعلق تھا۔ مثلاً:

۱۔ جس پہاڑ کے دامن میں بابا حسن ابدال کا مزار ہے، اس پہاڑی کے اوپر ایک گنبد نما عمارت ہے جس کے لیے مشہور ہے کہ بابا حسن ابدال نے وہ عمارت خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی۔ گنبد کی تعمیر (بناوٹ) اتنی تعجب خیز ہے کہ ہر کوئی اسے ان کی کرامت کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ دیکھنے والوں کے مطابق یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ کوئی ایسی عمارت تعمیر کرسکے۔[۶]

۲۔ اسی طرح ان کے آستان کے سامنے ایک دوسرا گنبد ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بھی انھوں نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی تعمیر غیر تراشیدہ پتھروں سے بغیر مسالوں کے کی گئی ہے۔ پتھروں کی چنائی اس طرح کی گئی ہے کہ بیچ میں کوئی دراڑ نظر نہیں آتی اسے دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک ایک پتھر پانچ من سے کم وزن کا نہیں۔ اسی مقام پر حسن ابدال چلّہ کشی کرتے تھے۔

۳۔ قندھار کے مغرب میں ایک گاؤں ہے جس کو پنجوانی[۷] کہا جاتا ہے۔ اسی کے قریب ایک پہاڑی اور اس میں ایک غار ہے، جسے تراش کر اس میں اترنے کے لیے زینے اور بیٹھنے کے لیے چبوترہ اور آنگن بنایا گیا ہے۔ اندر سے ندی/ برساتی نالہ بہتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا حسن ابدال وہاں سے اندر جا کر ایک سونے کی اینٹ لے آئے تھے۔ اسی

غار کا دوسرا سرا پہاڑی کی دوسری طرف سے نکلتا ہے۔ جہاں مشہور "چہل زینہ"[8] اور اس کا پیش طاق (برآمدہ) ہے۔ جس پر بابر بادشاہ نے کتبہ کندہ کروایا تھا۔ اور اکبر کے دور میں میر معصوم نے اس میں اضافہ کر کے اس کو اکبر کے دور تک مکمل کیا۔[9]

بابا حسن ابدال کے مزار پر پتھر کا ایک لمبا کتبہ نصب ہے جس پر بھکر کے حاکم سلطان محمود بھکری (۹۶۲-۹۸۲) کے والد میر فاضل کو کلتاش (م: ۹۲۸ھ) نے سال ۹۲۰ھ میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ کروائی۔ اس زمانے میں شاہ بیگ ارغون قندھار کے خود مختار والی تھے اور میر فاضل کو کلتاش اس کا امیر، دوست اور دست راست تھا۔

کتبے کا سامنے والا حصہ

هو الحی القائم القیوم و سبحان الملك الحی الذی لا یموت له الحکیم وله الحمد وله الکبر یاء والجبروت.

بر لوح ضمیر زایران روضۀ ادراك، وخاطر خطیر عاکفان خطۀ خاك، ظاهر و پیدا و روشن و هویدا خواهد بود که:

خلاصی از مضایف ایام و رستگاری از مذلت اقدام، به زیارت ارباب قبور و استعانت از اصحاب حضور، منوط و مربوط است، چنانچه کلام خجسته فرجام حضرت رسالت پناه علیه من ا الصلوٰة افضلها ومن التحیات اکملها خبر از ین معنی میدهد.

"اذا تحیرتم فی الامور فاستعینو امن اهل القبور"

کاشف این حکایت و شاهد این روایت است . اسعاف حاجات وانجاح مهمات زایرین این

مشهد مقدس و معتکفان این مرقد منور است . اعنی مرقد سلطان الطریقة و برهان الحقیقه، قطب فلك الهدایت و مرکز دایره ولایت، مهبط انوار الاهی و مظهر اسرار نا متناهی، قدو ة الواصلین زبدة الکاشفین، سرحلقهٔ ارباب و جد وحال، بابا حسن ابدال، نور الله مرقده و عطر مشهده، که در عالم طریقت کسوت و خرقه ای از حضرت سلطان الاولیاء و برهان الاتقیا ... فی العالم ابراهیم ادهم [10] داشته اند. وبه نیل سعادات و رفع درجات فایز و فایق ... و مجذوب سالك بوده اند . وخوارق عادات از خدمت ایشان به ظهور می انجامیده، چنانچه در افواه و السنه جاری است . و ارباب ملك و ملت و اصحاب دین و دولت روی نیاز و ابتهال بدین درگاه- که کعبهٔ آمال و امانی این دیار است- آورده مقصودمی یا بند.

چو کعبه، قبلهٔ حاجات خلق گردید
نهند روی به درگاهت، از دیار بعید

و حضرت خاقان مرحوم و مغفور شاه رخ مرزا از روی اخلاص و ارادت، درین مقام ملاقات کرده، آنچه از خدمت بابا شنوده بودند، به رای العین مشاهده آمد . واین موضوع که موسوم است به- "قریهٔ لنگر"- به رسم زکوة وقف حضرت بابا فرموده از مالیه و ... کل تکالیف معاف و مسلم داشته اند . و در زمان حضرت سلطان مشار الیه به فحوای مصدوقه:

المومنون لا یموتون بل ینعلون الی ...

از دار فنا به داربقا رحلت فرمودند، وچون زمام

سلطنت منتقل بحضرت سلطان مرحوم و مغفور ابوالغازی سلطان حسین بهادر ... گشت ۹۱۱ھ اهل بغی و عناد در ... بلاد سربه فتنه بر آورده گردن کشی آغاز کرده بودند، و رعایا منفرد و متفرق گشته از اوطان خود جلاء می شدند، هر چند که فرزندان کامگار و مردان نامدار می فرستادند، این دیار قراری پیدا نمی کرد...برین تقدیر حضرت امیر کبیر عالمگیر، المؤید من السماء المظفر علی الاعداء، افتخار الاعظم الامیر المرحوم المغفور امیر شجاع الدوله والدین ذوالنون بهادر بردالله مضجعه، درین ولا از ولایت ماوراء النهر... شان اتفاق افتاد ، و اهل شر و فساد دفع و ... عالی بنام مبارك حضرت مشا ر الیه شرف صدوری یافت ۹۲۰ھ آن حضرت با برادران نامدار و فرزندان کامگار وچندی از خاصان (متوجه-عازم) این حدود گشتند، به عون عنایت الاهی ویاری دولت نا متناهی، به ضرب تیغ آبدار، این دیار را، از شرو مفسدان باغی، پاك و صافی گردانید (ند) در آن [ایام] از کنارهٔ آب سند تا خطه کابل و از بلخ تا ... ناحیت دار السلطنة هرات و از سر حد سجستان تا دامن ... در قبضهٔ تصرف پاد شاهانه در آورده، لو ای عدالت و شفقت درین اقلیم ... سلطان غازی سلطان محمود بن سبکتگین نورالله مرقده، از صفحه خاطر جهانیان واهل زمان محو و منسی گردید.

کتبے کا دوسرا رُخ

وبحمداللّٰہ تعالیٰ کہ این دولت ابد پیوند، ولد ارجمند عالیحضرت مشار الیه وهو حضرت امیر روشن رای، صافی ضمیر، عالیجاه، ممالك پناه، عدالت دستگاه، النیر الفلك الارتفا، مبارز الدوله شاه شجاع [۱۳] خلد اللّٰه دولت الی یوم الدین، این بلاد و دیار ... به فراغ دل و حضور، روز گار می گذرا نند و اوقات بسر می برند. ظل ظلیل مرحمت و عاطفت این حضرت الی یوم التناد برسر سکان ... عباد آفاق گیر باد . وهذا ... فاصلاح الاصناف ... مشار الیه ... کافه رعایا و برایا ... ابنیه عالیۂ مصروف و معطوف است. ارکان دولت و اعیان حضرت ... مساعی جمیله به ظهور می رسانند.

درین ایام خجسته فرجام توفیق رفیق حال فرخنده مال، حضرت کوکلتاش مشارالیه وهو جناب رفعت مآب، امارت پناه، شجاعت دستگاه، امیر عاقل عامل عادل باذل امیر ناصر الدین فاضل [۱۴] ابدالدولته بر ... لوح عرش فرسای ... عالی... توفیق یافت. والحمد اللّٰه علی التوفیق، لکاتبه:

میر فاضل، یادگاری ماند در عالم زخیر
باد باقی دولت او تاجهان فانی است
چونکه درماه ربیع ا لثانی، شد ا تمام او
سال تاریخش همین، ماه ربیع الثانی است [۱۵]
۹۲۰ھ

مذکوره بالا کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابا حسن ابدال شاہ رُخ مرزا کے ساتھ اس گاؤں میں نہیں آیا تھا۔ [۱۶] بلکہ بابا حسن ابدال

پہلے ہی وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ شاہ رخ مرزا جب وہاں سے گزرے تو اس وقت عقیدت کے سبب سے ان سے ملا اور وہ گاؤں جو "لنگر" کے نام مشہور ہوا وہ خانقاہ کے اخراجات یعنی کہ "لنگر" کے لیے دیا گیا تھا جس پر لگان معاف تھا۔ شاید اسی سبب سے گاؤں کا نام "لنگر" پڑ گیا۔ اسی طرح ان کی تربت کو "مزار بابا ولی" کہا جاتا ہے۔

قندھار شہر کے پانچ دروازے ہیں۔ مشرقی دروازے کو "دروازۂ بابا ولی" کہا جاتا ہے۔ جس سے باہر نکل کر مزار کی طرف راستہ جاتا ہے۔[۱۷]

۲۔ سید حسین زنجیرپا

یہ بزرگ بھی میر معصوم کے قدیم رشتہ داروں میں سے ہیں۔ بقول ان کے ان کا شجرہ سبزوار کے "سادات ذو السعادات" سے ملتا ہے۔ اور انیس پشتوں پر حضرت امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے۔

یہ سید حسین زنجیرپا مذکورہ بالا حسن ابدال کے بھانجے تھے ان کے والد کا نام سید عین الدین ہے۔ میر معصوم کا کہنا ہے کہ بابا حسن ابدال جب حجاز مقدس سے زیارتیں اور فرائض ادا کرنے کے بعد واپس لوٹے اس وقت اپنی بہن بی بی فاطمہ کا نکاح سید عین الدین سے کروایا۔ جو "اجلۂ سادات سبزوار" سے تھے۔ شادی کے بعد انیس برس بعد سید حسین زنجیرپا پیدا ہوئے۔

میر معصوم نے سید حسین زنجیرپا کی کچھ کرامات بیان کی ہیں مثلاً: وہ سات برس کی عمر میں گھر سے غائب ہو گئے اور سات ماہ کے بعد ایک دن اچانک گھر پہنچ گئے۔ کہنے لگے انھیں جنات لے گئے تھے۔ جو "ارباب ایمان" (اہل ایمان) میں سے تھے۔ انھوں نے اسے اپنے ماموں بابا حسن ابدال کے ہاں ہندوستان(؟) پہنچایا[۱۸]۔ جہاں وہ ایک سال رہے ان ہی اہل ایمان یعنی جنات کے

ذریعے کچھ درویشوں کی خانقاہوں پر پہنچا۔ ان کے پاس چھے برس تک درویشوں سے روحانی تعلیم اور تربیت حاصل کر کے سیدھا اسی خانقاہ سے ابھی ابھی گھر پہنچا۔

ایک دن سید حسین زنجیرپا اپنے ماموں کے ہاں لنگر میں ٹھہرے ہوئے تھے اچانک کئی معتقد اور مہمان آگئے۔ پانچ سیر گوشت اور دس سیر قندھاری وزن کا آٹا ملا کر سید حسین زنجیرپا نے دیگ چولھے پر رکھی۔ بابا حسن ابدال اگرچہ خود بھی صاحبِ کرامات تھے لیکن وہ یہ سمجھ نہ سکے کہ اتنے سارے مہمانوں کے لیے اتنا مختصر کھانا کس طرح پورا ہوگا۔ زنجیرپا نے انھیں یقین دلایا کہ (فکر مت کرو) کھانا پورا ہوجائے گا! میر معصوم "از ثقات مروی است" کی بنیاد پر لکھتے ہیں کہ نہ صرف اس پندرہ سیر سے ڈیڑھ سو مہمانوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا بلکہ دیگ پہلے کی طرح ہی بھری رہی اسی طرح کی (سید حسین زنجیر پا کی) ایک آدھ کرامت بیان کرنے کے بعد میر معصوم قصہ مختصر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چون کرامات و خوارق ایشان ازان زیادہ است کہ
درین صفحہ اندراج یابد، بر اندکی اختصار نمود۔" ۱۹۔

سید موصوف کا مزار غالباً اسی لنگر نامی گاؤں میں ہے۔ میر معصوم نے وضاحت سے نہیں لکھا ہے لیکن ان کی ایک کرامت کا ذکر کیا ہے جو لنگر گاؤں میں ظاہر ہوئی یعنی ان کی کرامت کے سبب سے پنیر کے ٹکڑے پتھر ہوگئے۔ جن کو آستانے کے دروازے پر رکھا گیا۔ میر معصوم نے جو ٹکڑے دیکھے، تب خادموں نے وہ ٹکڑے مرقد منور پر لا کر رکھ دیے۔ ۲۰۔

اس سے ظاہر ہے کہ سید زنجیر پا کا مزار اسی گاؤں میں ہے اور بابا ولی کی شہرت نے سید کے مزار کی جداگانہ حیثیت کو ابھرنے نہیں دیا۔

۳۔ سید محمود شیر قلندر

یہ بزرگ مذکورہ بالا سید حسین زنجیرپا کے فرزند تھے۔ ریاضت اور سلوک کے ذریعے خود کو "درجات عالیہ" پر پہنچایا اور ہمیشہ "لب تشنگان بادیہ طلب را از سر چشمۂ معرفت سیراب می ساختند"۔ ان کے کشف اور کرامات کا بھی شمار نہیں تھا۔ میر معصوم نے اسی لیے لکھا ہے کہ:

"ازان متصاعد است کہ مہندس اندیشہ از عہدۂ استیفای آن تو اند بر آمد۔" ۲۱۔

اس کے باوجود بطور نمونہ کچھ کرامتیں درج کی گئی ہیں، مثلاً ایک مرتبہ قندھار کے حاکم امیر ذو النون ارغون سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی۔ جس پر سید نے اپنا انسانی قالب بدل کر شیر کی صورت اختیار کرلی جس پر ذو النون ارغون نہ صرف خوف زدہ ہو کر تائب ہو گیا بلکہ اس دن سے سید کا لقب "شیر قلندر" پڑ گیا۔

میر معصوم کی معلومات کے مطابق سید شیر قلندر کی وفات عاشورہ کے دن ماہِ محرم سال ۹۳۳ھ میں ہوئی ۲۲۔ اس وقت سندھ پر ذو النون ارغون کا پوتا شاہ حسن ارغون قابض تھا اور ہرات اور کابل قندھار سے قافلوں کے قافلے بھگوڑے اور موقع پرست پناہ گیر سندھ آرہے تھے۔

شیر قلندر کا مزار "اشکلچہ" ۲۳۔ گاؤں میں ہے۔یہ گاؤں قندھار کے مغرب میں دس کوس پر ہے۔ میر مغصوم کا کہنا ہے کہ اب تک قندھار اور زمین داور کے لوگ مرادیں حاصل کرنے کے لیے اس "مزار فیض آثار" پر ٹولیوں کی شکل میں آتے رہتے ہیں۔ اور درگاہ پر لنگر کا چولھا ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ ۲۴۔

میر معصوم ۱۰۰۵ھ میں جب قندھار میں تھے اس وقت انھوں نے اس مزار پر اپنی عادت کے مطابق ایک کتبہ بطور یاد گار نصب کیا جس کی عبارت اس طرح ہے:

دریـــــن آرام گـــــاه بـــــی ره و رو
اگـــر مـــردی! مـنـــه دل یك سرمـو
از ین منزل، که یار ان در رحیل اند
تـــرا آن جـمـلـــه در رفتن و کیل اند
تـرا گـر آسـمـان مـنزل نشین است
هـم آخـر جـای تـو زیـر زمین است
بیـا نـامـــی! بـــه کـــار خود بگرییم
زمـــانـــی، بـــر مـزار خـود بـگـرییم

بـــه تـاریخ ۱۰۰۵ھ حسب الحـکـم از بـکـربـه کـمك قـنـدهـار آمـد و بـه زیارت مزار جد بزرگوار سید شیر قلندر سبزواری ولد میر بزرگوار سید امیر انصاری(؟) ترمذی مشرف شد.

الـعبد مـحـمـد معصوم نامی ابن سید صفائی ابن میر مرتضیٰ به یاد گار این جا را تعمیر نمود . در ایام دولت شـاهـنشـاه ظـل الـلّـه جلال الدین محمد اکبر پادشاه غازی سمت تحریر یافت۔

نوزدهم شهر شوال [۱۰۰۵ھ] ۲۵۔

کتبے کی عبارت بعض جگہ غیر مربوط ہے۔ اسی طرح سید شیر قلندر کو میر بزرگوار سید امیر انصاری کا بیٹا بیان کیا گیا ہے۔ جو خود میر معصوم کے اپنے بیان کے برعکس ہے۔

بہر حال یہی بزرگ جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے میر معصوم کے قدیم عزیزوں میں سے ہیں ان تین کے سوا میر معصوم کے والد سید صفائی تك دوسرا کوئی ایسا بزرگ نہیں گزرا جس کی شہرت یا کرامت مشہور ہوئی ہو...... یا خود میر صاحب کو متوجہ کرسکا ہو۔ یہی سبب ہے کہ میر معصوم نے ان تین بزرگوں کے احوال پر اکتفا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افغانستان کے مزار شریف اور دولت آباد کے اوپر تاجکستان روسی سرحد واقع ہے۔ تقی کاشی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ میر معصوم والد کی طرف سے ترمذ کے حسینی سادات اور والدہ کی طرف سے سبزوار کے موسوی سادات میں سے تھے۔

"از جانب پدر بزر گوار به سادات حسینی نسب، ترمذ می رسد واز جانب دیگر به سادات کبار موسوی حسب، بلدۂ طیبۂ سبزوار، راجع می گردد۔"

(خلاصة الاشعار نسخه مانچسٹر ورق ۴۸۲ الف)

نیز رسالہ پارس کراچی (۱۔ص۲) نے تقی کاشی کا مندرجہ ذیل شعر مذکورہ بالا عبارت کے بعد درج کیا ہے۔ ؎

هم نبوت در نسب، هم پادشاهی در حسب
کو سلیمان، تا در انگشتش کند انگشتری

"پادشاهی در حسب" اسی لیے کہا ہے کہ صفوی بادشاہ خود کو موسوی سادات کہتے تھے جو غلط ہے۔

۲۔ ولد امیر تیمور گورگان: شاہ رُخ مرزا ۱۴ ربیع الآخر ۷۷۹ھ کو سمرقند میں پیدا ہوئے۔ اور وفات کے بعد امیر تیمور کے مقبرے میں سمرقند میں دفن ہوئے۔ (ملاحظہ ہو تفصیل ترخان نامہ کے شجرے "L" میں)۔

۳۔ سبز وار خراسان میں نیشا پور کی اراضی ہے

۴۔ از ین زمین بوی محبتی به مشام من می رسد۔ (تاریخ سند، ص ۱۳۴)

۵ـ الحق جای پُر فیض و منزل در کمال صفا ست، واز اکثر وارد و صادر شنیده شد که: مثل این جا، کم به نظر درمی آید. (ص: ۱۳۴)

۶ـ تاریخ سندھ ص: ۱۳۴

۷ـ قندھار سے ۲۷ کلو میٹر دور پنجوائی ۳۳ قریات کا مجموعہ ہے۔ ارغنداب اس کے مشرق سے شروع ہو کر جنوب سے گزرتا ہے۔ یہاں گندم، جو، جوار اور چاول کی فصلیں ہوتی ہیں۔ پھلوں میں انار، انگور، سیب، ناخ، خوبانی، انجیر، شفتالو اور شکر پارے ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں دو پہاڑ ہیں جن میں سے ایک کا نام مار کوہ ہے۔ جس میں غار ہے۔ جس کو "شمشیر غار" کہا جاتا ہے۔اس کے متعلق متعدد افسانے مشہور ہیں، لوگ انھیں دیکھنے آتے ہیں۔ (قاموس جغرافیائی افغانستان، ج ۲ ـ ص ۳۵۲)

۸ـ مجمع التواریخ کے مصنف مرزا احمد خلیل مرعشی نے چھل زینہ کا بیان اس طرح کیا ہے۔ "ھفتم قلعه کوه چهل زینه" که در زمان شاه جهان که علی مردان خان قلعه قندهار را به اهل هند داد، حسب الحکم شاه جهان پادشاه قلیچ خان قلعه دار، حصاری بردور کوه "چهل زینه" کشید. واین کوه چهل زینه کوهی است واقع در مابین شمالی و شرقی قلعه قندهار، و مشرف بر قلعه ای که درزمان بابر پادشاه حسب الحکم، سنگ تراشان چهل زینه، سنگیَ تراشیده بر سر آن کوه را پیدا کرده بودند، وچون آن کوه اشراف زیادی داشت، بابر پادشاه عمارتی مختصر بر قلعهٔ آن کوه ساخت و شبهای ماهتاب بر فراز آن کوه رفیع بر آمده سیر ماهتاب می نمود. به سبب اشراف آن کوه قلیچ خان حصاری بردور آن کشیده آنرانیز داخل قلعه نمود". (ص: ۱۳، مطبوعه عباس اقبال تهران

۱۳۲۸ء شمسی اور دیکھیے "تاریخ افغانستان در عصر گورگانی" از عبدالحئی حبیبی کابل ۱۳۴۱، ص: ۳۰۵)

۹۔ کتبہ کتاب میں آگے آئے گا۔

۱۰۔ سال وفات میں اختلاف ہے۔ سن ۱۳۰، سن ۱۶۱، سن ۱۶۲، سن ۱۶۶ میں حضرموت یا شہر صور میں فوت ہوئے۔ (ریحانۃ الادب، ۱: ۵۴)

۱۱۔ سال جلوس: ۸۶۳ھ

۱۲۔ میر معصوم نے لکھا ہے: امیر ذوالنون ۸۸۴ھ میں اپنے لشکر کے ساتھ، (غور اور زمین داور کی طرف روانہ ہوئے اور اسے ان علاقوں کے فسادات (ہزارہ اور تکدری) ختم کرنے میں تین چار سال لگ گئے۔ اس نے وہ علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔(ص ۸۰۔ ۸۱)

۱۳۔ یعنی شاہ بیگ ارغون جو ۹۱۳ھ میں اپنے والد کے قتل کے بعد اس ملك کا والی ہوا اور بابر کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد سندھ کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھ پر قبضہ کر بیٹھا۔

۱۴۔ یعنی میر فاضل کو کلتاش (وفات ۹۲۸ھ) بن عادل خواجہ۔ یہ میر فاضل سلطان محمود بکھری کے والد تھے۔

۱۵۔ آریانا کابل شمارہ ۱۰ سال ۶ اور تحفۃ الکرام (مرتبہ حسام الدین راشدی) ص: ۱۹۲ تا ۱۹۴۔ یہ کتبہ افغان دانشور جناب محمد ابراہیم خلیلی نے مذکورہ بالا رسالے میں اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے: مرزا بابا حسن ابدال کہ در قندھار واقع شدہ۔ این مزار آنجا بعرف "مزار بابا ولی" اشتہار دارد و مقام بسیار قشنگ و زیبا و سر سبز است، دردامنہ کوہ این مد فن مقدس است۔

۱۶۔ میر معصوم نے غلط لکھا ہے کہ ......در سفر ہند بابارا تکلیف نمودہ باخود بردند و در حین مراجعت در موضع لنگر قندھار

رحل اقامت انداختہ۔ (ص:۱۳۴) یعنی ہندوستان کے سفر میں انھیں ساتھ لے جارہے تھے اور بابا ولی وہاں سے لوٹ کر ہمیشہ کے لیے وہاں مقیم ہو گئے۔

۱۷۔ مجمع التواریخ (ص ۱۳)۔ "دوم دروازۂ بابا ولی یعنی بابا حسن ابدال کہ مزار او نیز در آنجاست و در سمت شرقی واقع است"۔

۱۸۔ میر کے قول میں تضاد ہے۔ نزد خال بابا حسن ابدال بہ اشارت ایشان بہ دیار هند بر دند۔ (ص:۱۳۵) اسی عبارت سے دو تین سطور انھوں نے اوپر لکھا ہے کہ بابا موصوف لنگر گاؤں میں رہے۔ اور وہیں وفات پائی۔ تا آخر عمر در ان منزل گذرا نیدہ همانجا آسودہ اند۔ (ص: ۱۳۴)، تحفۃ الکرام میں (۲:۸۹) بابا حسین زنجیرپا کا احوال میر کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔

۱۹۔ تاریخ سندھ، ص ۱۳۷

۲۰۔ ......آن سنگھا را بردر آستان نهاد، واکنون آن سنگھا را خادمان بر مرقد منور ایشان نهادہ اند... (ص ۱۳۷)

۲۱۔ تاریخ سندھ: ص ۱۳۷

۲۲۔ سال ۹۳۳ھ لکھا گیا ہے۔ دوسرے خطی نسخے میں صرف "یوم عاشورہ" درج ہے۔ اس لیے کہا نہیں جاسکتا کہ ۹۳۳ھ صحیح ہے یا نہیں۔

۲۳۔ "قریہ اسکلچہ ضلع سپیروان جنوب غربی قندھار بفاصلہ "۵" میل بر کنار دریای ارغنداب" مقالات الشعراء ص: ۳۶۴

۲۴۔ تاریخ سندھ، ص: ۱۴۰

۲۵۔ یہ کتبہ دوست عزیز جناب عبدالحئی حبیبی قندھاری کے ذریعے حاصل ہوا۔ دیکھیے مضمون "میر معصوم نامی" آریانا ش ۶، س ۴، ص: ۳۸ اور دیکھیے۔ "تاریخ افغانستان در عصر گور گانی ہند" عبدالحئی حبیبی، ص: ۲۰۲

باب ۔ ۲

حسب نسب اور نسب نامہ

مذکورہ تینوں بزرگ میر معصوم کے ددھیال کی کڑیاں کہے جاتے ہیں۔ میر معصوم نے ان کے متعلق ایسی متضاد عبارات لکھی ہیں جس نے اس سلسلۂ نسب کے مسئلے کو الجھا دیا ہے۔ جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے وہ اس طرح ہے:

۱۔ سید شیر قلندر بن بابا حسن ابدال السبزواری مولداً و القندھاری موطناً و مرقداً. (ص:۳)

۲۔ سید شیر قلندر فرزند سید حسین زنجیر پا است. (ص: ۱۳۷)

۳۔ سید شیر قلندر بن سید حسین زنجیر پا بن بابا حسن ابدال السبزواری. (کتبہ چہل زینہ اور قلعہ آسیر) ۱۔

۴۔ سید حسین زنجیر پا خواھرزادہ بابا حسن ابدال و فرزند سید عین الدین. (ص:۱۳۵)

۵۔ سید شیر قلندر سبزواری ولد میر بزرگوار سید میر انصاری ترمذی. (کتبہ مزار شیر قلندر)۲۔

مذکورہ بالا عبارات میں جو اختلاف ہے اس نے تینوں بزرگوں کے باہمی رشتے کو الجھا دیا ہے۔ پتا نہیں چلتا کہ کون کس کا بیٹا ہے ۔ میر معصوم کے اپنے خاندان میں جو نسب نامہ موجود ہے وہ اس طرح ہے۔۳۔

"سید معصوم بن سید صفائی، بن سید شیر مرتضیٰ، بن سید علی، بن سید امام الدین، بن سید محمد بزرگ، بن سید علی، بن سید محمود، بن سید شیر

قلندر، بن سید عین الدین، بن سید شمس الدین، بن سید علاء الدین ، بن سید محمد، بن سید بابا حسن ابدال، بن سید حسین زنجیر پا، بن سید رضا، بن سید محمد، بن سید احمد، بن حضرت ہارون، بن امام موسیٰ کاظم(شہادت:۱۸۳ھ)

اس شجرہ میں سید محمود سے سید رضا تک جو اختلاف ہے اس نے اس مسئلے کو اور بھی مشکوک کردیا ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر داؤدپوتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ اس نسب میں کچھ نام نیچے اوپر ہو گئے ہیں- اس کے لیے میر معصوم خود بھی ذمہ دار ہیں ۴- میر معصوم نے ایک جگہ اپنا نام لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماں کی طرف سے ان کا نسب حسن ابدال سے ملتا ہے -محمد معصوم بکھری بن سید صفائی الترمذی المنتسب اُماً الی سید شیر قلندر، بن سید حسین زنجیرپا، بن با باحسن ابدال السبزواری اصلا و القندھاری مرقداً ۵- ان انساب کے تحت ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ: لھذا این نسبنامہ نا صحیح است.۶-

میر معصوم نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ ان واسطوں (پشتوں) پر امام موسیٰ کاظم سے سید حسین زنجیرپا کا نسب ملتا ہے- ۷- مذکورہ بالا شجرے میں زنجیرپا اور امام موسیٰ کاظم کے درمیان فقط چار پشتیں دکھائی گئی ہیں- سید حسین زنجیر پا، سید رضا، سید محمد، سید احمد، حضرت ہارون، امام موسیٰ کاظم-

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ جو نسب نامے صدیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں ان کی کچھ کڑیوں/سلسلوں کا ٹوٹنا، کچھ ناموں کا بدلنا اور کچھ جگہوں پر اختلاف ہونے کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے-

اس گھرانے کا دوسرا ایک شجرہ سید نور علی شاہ معصومی مرحوم ۸-نے میرے برادر بزرگ پیر علی محمدشاہ راشدی کو (۳۱ دسمبر، ۱۹۳۱ء، جمعرات ۲۱ شعبان ۱۳۵۰ھ) اپنے پاس رکھے ہوئے اصل نسخے سے نقل کرکے دیا تھا- جس کے اوپر بطور تصدیق سکھر کے مشہور

لوگوں کی مہریں ثبت ہیں، مثلاً

۱) الخادم امید علی شاہ جیلانی ابن سید نواز علی شاہ جیلانی

۲) الخادم عبدالغفور ابن مولوی احمد

۳) الخادم عبدالرحمٰن ابن کمال الدین

اس شجرے میں دو ایسے نام ہیں جو مذکورہ بالا خاندانی شجرے میں موجود نہیں ہیں۔ شجرہ اس طرح ہے:

میر معصوم، بن سید صفائی، بن سید شیر مرتضیٰ ، بن سید علی، بن سید امام الدین، بن [سید میر بزرگ] بن [سید میر شاہ] بن سید حسین شیر قلندر، بن سید عین الدین،بن سید شمس الدین، بن سید علاء الدین، بن سید محمد، بن سید بابا حسن ابدال، بن سید حسین زنجیرپا، بن سید رضا، بن سید محمد، بن سید احمد، بن سیدھارون، بن سید امام موسیٰ کاظم۔

در حقیقت بریکیٹ والے دونوں نام ہونے چاہیں۔ سید محمد بزرگ، بن سید شاہ علی شاید لکھنے والے کاتب سے پہلے نام میں (محمد) لکھنا رہ گیا۔ اور دوسرے میں (علی) چھوٹ گیا ۔اسی سبب سے ناموں کی صورت بدل گئی اور شجرے میں نقص پیدا ہو گیا۔

دوسرا ایک شجرہ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے "شجرہ سادات بکر" سے نقل کر کے تحفۃ الکرام میں دیا ہے:

میر معصوم، میر مرتضیٰ، میر تقی، خوارزم شاہ، قلندر شیر، میر علی، میر عماد، میر بزرگ، میر خوارزم شاہ، شیر قلندر حسین، علاء الدین، محمد ، حسن ، علی، جعفر، محمد، ھارون، محمد، جعفر، محمد،احمد ہاشم، امام موسیٰ کاظم۔۹۔

یہ شجرہ ، مذکورہ بالا دونوں شجروں سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ میر معصوم کے والد سید صفائی کا نام بیچ سے غائب ہے۔

اسی طرح ایک شجرہ "تذکرۃ الانساب" [۱۰] نامی ایک خطی کتاب میں درج ہے جو سب سے نرالا ہے۔ مثلاً اس طرح:

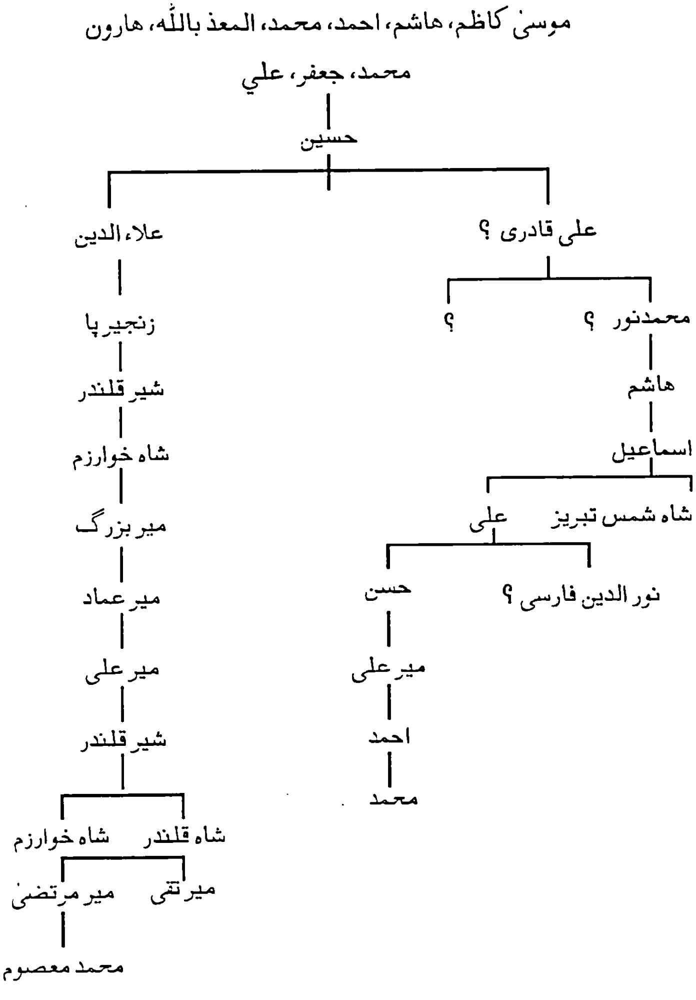

ایک دوسری کتاب "جامع الانساب" [۱۱] کے نام سے ۱۳۷۶ھ میں ایران سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں حضرت ہارون بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر کی اولاد کا ایک ایسا شجرہ دیا گیا جس میں میرمعصوم کا سلسلہ

نسب بھی موجود ہے۔ اس شجرہ کا زیادہ تر دارومدار "سراج الانساب" [۱۲] پر ہے۔

جامع الانساب کے مؤلف نے میر معصوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نسب شریف میر بزرگ از طرف پدر بیش ازین اطلاعی از افراد این رشته نداریم، و در زنجیرۂ نسب سید محمد مشهور به آقای شاه - که به علی، بن محمد، بن احمد، بن هارون می رسد - شخصی به نام سید حسین زنجیر پا ذکر شده و درین رشته هم نامی از حسین زنجیر پادیده می شود.

(عبارت سراج الانساب) پس از آنکه نسب را تا میرعماد می رساند چنین است:

میر عماد، بن میر بزرگ، بن شاه بزرگ، از طرف والده میر سید شیر قلندر بن سید حسین زنجیر پا بن ...... الخ [۱۳]

سید ہارون کے دو فرزند تھے۔ محمد اور احمد، سید محمد کی شاخ میں جس میں میر معصوم آتے ہیں ایک بزرگ میر شیر قلندر بن سیدحسین زنجیر پا موجود ہیں۔ اسی طرح سید احمد کے ایک بیٹے محمد کے فرزند علی کے سلسلۂ نسب میں بھی سید حسین زنجیر پا کا نام موجود ہے۔ جس کی طرف مذکورہ فارسی عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سلسلہ اس طرح ہے:

هارون، احمد ، محمد، علی، صالح، محمد، جعفر، حسین، علاء الدین، قطب الدین، شمس الدین، سید حسین زنجیر پا، عین الدین...... تا سید محمد یعنی آقای شاه.

مذکورہ بالا سید احمد کے فرزند محمد کے صاحبزادے موسیٰ اصغر کے پوتے سید احمد بن حسن جنیدی کی پشت میں ایران کے مشہور صوفی شاعراور بزرگ شاہ قاسم انوار ہیں۔ اسی لحاظ سے ہارون کے ایک صاحبزادے محمد کی پشت میں محمد معصوم ہیں۔ اور دوسرے صاحبزادے سید احمد کی اولاد میں معین الدین علی المعروف سید قاسم انوار ہوئے۔ [۱۴]

میر معصوم کی شاخ کچھ اس طرح ہے:

امام جعفر، امام موسیٰ کاظم، حضرت ہارون، جعفر، محمد، ہارون، محمد، حسین؟، علی، احمد، محمد، رضا، حسن، حسین، حسین، محمد، علاء الدین، شمس الدین، سید حسین زنجیرپا، میر شیر قلندر...... شاہ بزرگ، میر عماد بزرگ، میر سید علی، میرمرتضیٰ ولی، میر سید، میر مرتضیٰ،سید صفائی، میر معصوم، میر بزرگ۔ ۱۵؎

اس شجرے سے دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں:

۱) جیسا کہ میرمعصوم نے لکھا ہے کہ سید حسین زنجیر پا سے امام موسیٰ کاظم تک انیس۱۶؎ پشتیں ہیں۔ اس شجرے میں سید حسین سے موسیٰ کاظم تک اٹھارا پشتیں ہیں اگر امام جعفر کو شامل کیا جائے تو پوری انیس پشتیں ہوتی ہیں۔۱۷؎

۲) میر معصوم نے چھل زینہ یا قلعۂ آسیر والے کتبے میں لکھا ہے کہ:
"محمد معصوم بکری، بن سید صفائی الترمذی، المنتسب اُمّا الیٰ سید شیر قلندر، بن سید حسین زنجیر پا، بن بابا حسن ابدال......الخ۔"

مذکورہ بالا شجرے میں سید حسین زنجیر پا، بابا حسن ابدال کے فرزند نہیں دکھائے گئے بلکہ بابا حسن ابدال کا سرے سے نام ہی نہیں آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن ابدال، حضرت ہارون کے دونوں صاحبزادوں کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ کسی دوسرے خاندان میں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ہمیشیرہ، سید حسین زنجیرپا کے والد سے بیاہ کر، میر معصوم کے خاندان سے مل گئے۔میر معصوم نے غلطی سے مادری سلسلے کے بجائے انہیں پدری خاندان میں شامل کیا ہے۔

اسی شجرے میں ایک دوسری کمی بھی ہے۔ وہ یہ کہ سید حسین زنجیر پا کے والد کا نام سید عین الدین کے بجائے شمس الدین لکھا گیا ہے۔ اور پھر دوسری طرف حضرت ہارون کے صاحبزادے احمد کے فرزند علی کی شاخ، جس کو ہم نے "جامع الانساب" سے نقل کیا ہے۔ اس

میں بھی ایک سید حسین زنجیر پا کا نام موجود ہے۔ اور اس میں عین الدین کو سید حسین زنجیر پا کا بیٹا لکھا گیا ہے۔دونوں بیٹوں کے سلسلے میں نام کا اختلاف اس طرح ہے:

احمد	محمد
علاء الدین	علاء الدین
قطب الدین	؟
شمس الدین	شمس الدین
سید حسین زنجیر پا	سید حسین زنجیر پا
عین الدین	میر شیر قلندر

شبہ میں ڈالنے والے اس اختلاف کے علاوہ بھی کچھ اور غلطیاں و نقائص ہیں مثلاً میر معصوم نے سید محمد شیر قلندر کی وفات کا سال ۹۳۳ھ ۱۸ لکھا ہے جو قطعی غلط ہے کیوں کہ اس دور میں میر معصوم کے والد سید صفائی، ان کے اور شیر قلندر کے درمیان بظاہر چھے پشتیں ہیں وہ سندھ میں اپنی جوانی کے دن بڑی عزت اور احترام سے گزار رہے تھے۔ نہ صرف یہ غلط ہے بلکہ شیرقلندر کی کرامت والے واقعے میں امیر ذو النون ارغون(متوفی ۹۱۳ھ) کو شیر قلندر کا معاصر بیان کرنا بھی صریح سہو ہے۔ چھے درمیانی پشتوں والوں کو ایک ہی دور میں دکھانے پر افسوس ہے کہ میر معصوم نے توجہ نہیں دی۔

اگر کچھ دیر کے لیے باور کر بھی لیا جائے کہ سید شیر قلندر حقیقتاً سید حسین زنجیر پا کے فرزند اور سید حسین زنجیر پا، بابا حسن ابدال کے بھانجے تھے اور اپنے ماموں کے یہاں سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے کمال کو پہنچے۔ ایسی صورت میں سید حسین زنجیر پا اور ان کے فرزند سید شیر قلندر کو شاہ رخ مرزا کے زمانے میں ہونا چاہیے۔ جس کی

پیدائش ۷۷۹ھ میں اور حکومت کا زمانہ ۷۹۹ھ سے ۸۵۰ھ تک ہے۔

اگر بابا حسن ابدال کو شاہ رخ مرزا کی شہزادگی والے زمانے میں پختہ عمر کا فرض کیا جائے اور سید شیر قلندر کی وفات اور سید عین الدین اور ان کے بیٹے سید حسین زنجیر پا اور ان کے بیٹے سید شیر قلندر کی وفات سال ۸۰۰ھ کے لگ بھگ شمار کیا جائے تو بڑی مشکلوں سے "جامع الانساب" والے شجرے کی چھے درمیانی کڑیوں کا نویں اور دسویں صدی ہجری کی پہلی دہائی میں جا کر حساب ٹھہرے گا۔

اس کے بعد میر معصوم کے خاندانی شجرے اور اس کے بعد کے سلسلے میں ننھیال کا جو اختلاف ہے وہ بھی اپنی جگہ پر ایک مغالطے میں ڈالنے والا معاملہ ہے۔

بہر صورت کچھ بھی ہو شجروں میں ناموں کا اختلاف اور عدم مطابقت ایک گھرانے کا کیا، بلکہ کسی کے بھی حسب نسب اور سیادت پر اثرانداز نہیں ہوسکتا۔میر معصوم کے سلسلے میں تو خاص طور پر سوائے چند روایتی اختلافات اور غلطیوں کے کسی بھی شک و شبہے کے لیے کوئی واقع، قطعی اور تاریخی دلیل نہیں ہے۔ باقی رہا ناموں کا اختلاف اور سلسلے کا غیر مرتب ہونا، تو صدیوں کے طویل سفر میں ایسا ہوجانا ایک قدرتی امر ہے۔

ویسے بھی شجروں پر بھروسا یا انحصار کرنا یا انھیں اپنے افتخار کا سبب سمجھنا ضروری اور لازمی نہیں ہے۔ بلکہ ایک حد تک فضول بھی ہے۔ نسب نامے سے ہزار درجہ افضل فرد یا خاندان کا اپنا کردار اور عمل ہے، یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ شجرہ کیسا ہے؟ کڑیاں ملتی ہیں یا نہیں؟ کونسا امام ددھیال میں ہے؟ سیادت کی سعادت حاصل ہے یا سرے سے بات ہی مشکوک ہے؟ اصل میں دیکھنا یہ چاہیے کہ ایک انسان یا ایک گھرانے نے اپنے کردار اور عمل سے دنیا کو یا بنی نوع انسان کو کیا دیا؟ خدا کی اس وسیع و عریض کائنات میں اس کا کیا حصہ رہا؟ خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچا یا نقصان۔ اسی معیار پر اگلے صفحات میں میر معصوم کے خاندان کو پرکھنا جانچنا اور دیکھنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اپی گرافیا سال ۱۹۲۵ء، ص ۳۹

۲۔ اس کتبے کی عبارت میں شک پڑتا ہے۔ شاید پڑھنے والوں نے غلط پڑھا ہو۔

۳۔ کتاب تحفۂ مدد پناہ لزائرین الحج از سید پناہ علی شاہ معصومی مرحوم مطبوعہ پوکرداس حمیدیہ پریس، لاہور، ۱۴ اگست ۱۹۱۱ء۔ میرے بھائی پیر علی محمد شاہ راشدی نے اسی کتاب سے نقل کرکے اپنی کتاب "حیات معصوم" میں دیا اور وہی شجرہ ڈاکٹر داؤدپوتہ مرحوم نے اپنے مقدمے کے حاشیے میں لکھا ہے۔

۴۔ ظاہراً درین نسب نامہ بعضی اسماء غلط شدہ است و خود میرمعصوم بر ای این اختلاف مسئول است. (مقدمہ ط)

۵۔ مقدمہ ط

۶۔ مقدمہ ط

۷۔ تاریخ سندھ، ص : ۱۳۵

۸۔ سید نور علی شاہ بن سید میر علی شاہ ڈویژنل فار یسٹ آفس شکار پور میں ہیڈ کلرک تھا، قابل دید بزرگ تھے۔ ۱۸ شوال ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۰ جون ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

۹۔ تحفۃ الکرام، خطی نسخہ، کتابت ۱۲۶۷ھ (۳ اپریل ۱۸۵۱ء) سندھی ترجمے میں ہے کہ سید صفائی بن سید مرتضیٰ الترمذی ماں کی طرف سے سید شیر قلندر بن بابا حسن ابدال سے نسبت رکھتا ہے۔(ص:۳۱۸) فارسی نسخے کی عبارت ہے: الترمذی المنتسب الی سید شیر قلندر ابن بابا حسن ابدال(ص:۱۰۳)۔ خطی اور سندھی ترجمے میں میرمعصوم ولد میر مرتضیٰ لکھا ہوا ہے، سید صفائی کا نام نہیں ہے۔

۱۰۔ یہ کتاب عبدالرحمن نامی کاتب نے ۶ محرم ۱۲۶۴ھ میں نقل

کی- جس سے میرے بھائی میر علی محمد راشدی نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو نقل کیا۔

۱۱۔ مؤلف سید محمد علی روضاتی

۱۲۔ مؤلف احمد بن محمد بن عبدالرحمان النجفی مولف نے یہ کتاب اپنے شاگرد سید سراج الدین کے کہنے پر شاہ طہماسپ صفوی کے زمانے (۹۱۹ھ - ۹۸۴ھ) میں لکھی- جس کا نسخہ کتابخانہ ملی تہران میں ہے- جامع الانساب میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

(۱) صحاح الاخبار فی نسب السادات الفاطمیة الاخیار از محمد سراج الدین رفاعی مخزومی (۷۹۳ - ۸۸۵ھ) طبع مصر ۱۳۰۶ھ (۲) المسجدی فی انساب الطالبین از سید ابو الحسن نجم الدین علی عمری معروف بہ ابی الصوفی (۴۲۳ھ) یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے -(۳) عمدة الطالب فی النساب آل ابی طالب از سید جمال الدین احمد (۸۲۸ھ) مطبوعہ (۴) المشجر الکشاف التحقیق اصول السادة الاشراف یعنی بحر الانساب از شمس الدین ابو علی نجفی (۹۰۰ھ) مطبوعہ (۵) الاسدیة، انساب سادات علویہ از سراج الدین محمد قاسم مختاری (۶) مجموعۂ ملتان از جلال ملتانی کی غیر مطبوعہ بیاض ہے، جس میں شجرہ بھی درج ہے- (۷) لباب الالباب والقاب الاعقاب مؤلفہ ابو الحسن بیہقی مصنف تاریخ بیہقی-

۱۳۔ جامع الانساب، ص ۶۴-

۱۴۔ ولادت ۷۵۷ھ اور وفات ۸۳۷ھ (عین بہشت، دل خراب) راقم نے ان کے مزار کی زیارت، تربت احمد جام سے مشہد لوٹتے ہوئے، تربت جام ۲۰ میل ادھر خرگرد جام کے گاؤں لنگر میں کی- (۱۳ ستمبر ۱۹۶۶ع) مقبرہ میر علی شیر نوائی نے بنوایا ہے- گاؤں چھوٹا ہے اور مقبرے میں صفائی نہیں ہے- مقبرے کی دیواروں پر اندر اور باہر چند کتبے ہیں جو امیروں اور صفوی بادشاہوں کے ہیں- دیوان قاسم انوری آقای سعید نفیسی مرحوم ۱۳۳۷ ش میں چھپی ہے-

۱۵ـ جامع الانساب، ص ۱۶ ا۔ ۵۶۔ ۶۳۔ ۶۴

۱۶ـ تاریخ سند، ص ۱۳۵

۱۷ـ تقی کاشی اس کے ملاقاتی اور دوست تھے۔ اپنے تذکرے میں میر کے نسبی سلسلے کے متعلق لکھا ہے کہ باپ کی طرف سے حسینی نسب کے تھے۔ اور دوسری طرف یعنی ننھیال سے موسوی نسب کے تھے۔

از جانب پدر بزرگوار به سادات حسینی، ترمذی
می رسد، واز جانب دیگربه سادات کبار موسوی
حسب بلدۂ طیبه سبزوار راجع میگردد.

تقی نے ان کے نسب کے متعلق یہ شعر لکھا ہے:

هم نبوت در نسب، هم پاد شاهی در حسب
کو سلیمان، تا در انگشتش کند انگشتری

(...... ۱۔۱ ص ۲) موسوی حسب کو طبقات اکبری میں غلطی سے (۳- ۵۰۰) صفوی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح منتخب التواریخ (۴-۳۶۳) اسی طرح صفوی لایا گیا ہے۔ مطربی بخاری نے "تذکرہ جہانگیری" میں طبقات اکبری کی پیروی کی ہے۔ یعنی: از سادات صفوی است۔ (ص ۱۵)

۱۸ـ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے تاریخ سندھ کے ایک خطی نسخے (مکتوبہ ۱۱۳۸ھ) کا فقرہ دیا ہے جس میں سال نہیں دیا ہے۔ صرف - در روز عاشورہ بر حمت ایزدی پیوست۔ (ص: ۱۴۰) لکھا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ دوسرے نسخے میں سال کا اندراج کا تبوں کی کرامت دکھائی دیتا ہے۔ راقم کے یہاں ایک نسخہ ۱۲۴۳ھ کا اور دوسرا نسخہ ۱۳۲۳ھ کا ہے۔ ان دونوں میں بھی سن نہیں دیا گیا ہے۔

باب ۔۳

سید میر صفائی

میر صفائی کے نام کا علم نہیں۔ صفائی آپ کا تخلص [۱]۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ شاعر کی حیثیت سے اگرچہ مشہور نہیں ہوئے، لیکن شعر کہتے تھے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

آپ کے بزرگ اصل میں ترمذ [۲]۔ کے تھے جہاں سے ہجرت کر کے قندھار کے قریب "اشکلچہ" نامی گاؤں میں مقیم ہوئے۔ جہاں انھیں سید محمد شیر قلندر بن سید حسین زنجیر پا کی درگاہ کی مجاوری ملی۔ [۳]۔ سید شیر قلندر والدہ کی طرف سے میر صفائی کے خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ یعنی ننھیال کی طرف سے کسی پشت میں سید صفائی کے نانا ہوتے تھے۔ یہی سبب اور یہی نسبت تھی جس نے اس گھرانے کو اپنے اصل وطن (ترمذ) سے ہجرت کروا کر یہاں مقیم کیا۔ میر معصوم نے اس مسئلے پر روشنی نہیں ڈالی۔ لیکن صاحب "مآثر الامراء" نے لکھا ہے کہ اسی گاؤں میں ان کی دو تین پشتیں گزریں [۴]۔ گویا اشکلچہ میں میر صفائی کے پردادا آ کر ٹھہرے۔

ولادت:

ظاہر ہے کہ میر صفائی اسی گاؤں میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی وہیں یا اسی علاقے کے آس پاس حاصل کی۔ اگرچہ اشکلچہ میں ان کے قیام کے بارے میں کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔ لیکن بظاہر یہی قیاس ہو سکتا ہے۔

سندھ کی طرف ہجرت کے اسباب:

میر صفائی نے اپنے آبائی گاؤں میں بسے بسائے گھر کو کیوں چھوڑا ؟ اس کا کوئی خاص شخصی سبب نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ دسویں صدی ہجری کی پہلی ربع میں خراسان میں جو سیاسی انتشار اور طوائف الملو کی پھیلی۔ اس نے عام لوگوں کے ایک خاص طبقے کو مجبور کیا کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر امن و آشتی والے ملک کو ہجرت کر کے پناہ گزیں ہوں۔

خراسان کے ملکی حالات غیر یقینی اور سیاسی طور سے بے حد خطر ناک اور مخدوش تھے۔ سلطان حسین مرزا با یقرا کی وفات (۹۱۱ھ) کے بعد مختلف شہزادیوں کے بطن سے پیدا ہونے والے اور متضاد فطرت کے حامل شہزادوں ۵۔ نے آپس میں لڑنا شروع کردیا۔ حسد، ایک دوسرے کے خلاف سازشیں، دل میں دغا اور کانوں کا کچاپن، چغل خوروں کے کہنے پر اعتبار کرنا، ایک دوسرے کی پگڑی اتارنے کے لیے گڑھے کھودنا۔ مختصراً بغض اور عناد، شقاوت اور فساد کی اس فضا نے چند مہینوں کے اندر ہرات کی تیموری سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا، اور اس حد تک ان کی ساکھ ختم کردی کہ چاروں طرف ہرات پر حملے شروع ہو گئے۔ بالآ خر اس نامور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

طوائف الموکی شروع ہونے سے ایک طرف ایران کے صفوی حکومت کے بانی شاہ اسماعیل (۹۲۰ھ) نے حملے شروع کردیے۔ دوسری طرف سے ماورالنہر سے اوزبک بادشاہ، محمد خان شیبانی (۹۰۵ھ) مقابلے کے لیے نکل آیا۔ یہ دونوں قوتیں ملک گیری اور حکومت کی توسیع کی لالچ میں بر سر پیکار تھیں۔ اسی زمانے میں ہندوستان کی مغل سلطنت کا بانی بابر بادشاہ بھی فرغانہ سے اپنی آبائی حکومت، اسی شیبانی کے ہاتھوں گنوا کر (۹۱۰ھ) خراسان کے قندھار، کابل، بست اور زمین داور والے علاقے میں قسمت آزمانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے کے لیے آپہنچا۔ اسی حصے پر شاہ

حسین بایقرا کی طرف سے کافی عرصے سے ارغون گھرانہ (امیر ذوالنون- شاہ بیگ) نیابت کی صورت میں حکومت کررہا تھا- جو شاہ حسین بایقرا کی وفات کے بعد شہزادوں کی باہمی جنگ و جدل میں مشغول ہو جانے کے سبب سے اپنے آپ کو اس حصے کا تقریباً آزاد حکمران سمجھ رہا تھا- اور بہت ہشیاری اور چالاکی سے شیبانی اور صفوی اور بابر کے درمیان خود کو بچانے اور سلامت رکھنے کے لیے ہاتھ پیر ماررہا تھا- اسی سیاسی افراتفری اور طوائف الملوکی نے ملک کی قسمت کو چند سالوں کے اندر جس طرح زیر و زبر کردیا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء: بابر فرغانہ کی حکومت کھو بیٹھا ۶ (۹۰۷ھ)، کابل پہنچا اور امیر ذو النون کے بیٹے محمد مقیم کو پہلی بار شکست دی-

۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء: شاہ حسین میرزا بایقرا انتقال کر گئے- جس کے بعد شہزادوں نے آپس میں لڑنا شروع کردیا- اور اس طرح خانہ جنگی کا آغاز ہوا-

۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء: محمد خان شیبانی نے ہراتی شہزادوں کو شکست دے کر خراسان پر قبضہ کیا- امیر ذو النون ارغون اسی جنگ میں مارے گئے- اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون قندھار والے علاقے پر جانشین ہوا- لیکن اسی سال بابر نے قندھار پر قبضہ کر کے شاہ بیگ کو شال (کوئٹہ) اور سیوی (سبی) کی طرف دھکیل دیا-

۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء: شاہ اسماعیل صفوی نے شیبانی کو جنگ میں شکست دی اور اسے قتل کر کے خراسان پر اس کے تسلط کا خاتمہ کردیا- شاہ بیگ ارغون ان سے سلام (ملاقات) کے لیے ہرات گئے- جس کو انھوں نے قلعہ اختیار الدین میں قید کردیا- جہاں سے وہ سنبل نامی اپنے ایک ملازم کے ذریعے بھاگ نکلے-

۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء: بابر اور شاہ بیگ کے درمیان چپقلشیں بڑھتی رہیں۔ قندھار کا علاقہ اپنے لیے غیر محفوظ سمجھ کر مستقل طور پر شال (کوئٹہ) اور سیوی (سبی) کی طرف نئی حکومت کی داغ بیل ڈالنا شروع کی۔ سندھ ان کے سامنے تھا۔
جس پر ۱۷ ذیقعد ۷ کو آزمائشی حملہ کر کے ضلع دادو میں باغبان اور گاہا تک پہنچ کر لوٹ مار کر کے فی الحال واپس لوٹ گیا۔

۹۲۳ھ/۱۱۷ء: شاہ بیگ، بابر کے مسلسل حملوں سے بے بس ہو کر آخر قندھار سے دست بردار ہوئے اور قلعے کی چابیاں، بابر کو روانہ کر کے خود اپنے کنبے کے ساتھ آکر سیوی (سبی) اور شال (کوئٹہ) والے علاقے پر اکتفا کر کے آئندہ کے حالات کا انتظار کرنے لگے۔

جس وقت خراسان میں طوائف الملوکی کی صورتحال تھی، عین اسی زمانے میں سندھ کی بد بختی کا آغاز ہوا۔ ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں سندھ کے نامور اور خوش بخت بادشاہ جام نظام الدین ۴۸ برس حکومت کرنے کے بعد فوت ہو گئے۔ سندھ کے شہزادوں میں بھی تیموری شہزادوں کی طرح جنگ شروع ہو گئی اور دشمنوں کے لیے سندھ کے دروازے کھل گئے۔ ۸ نتیجتاً شاہ بیگ جیسے موقع پرست (Interloper) اور ٹھگ نے سندھیوں کو دھوکے میں رکھ کر ملک پر (۹۲۷ھ/۱۵۲۰ء) قبضہ کر لیا۔ اس طرح خراسان کا انقلاب سندھ کی قسمت کے لیے بھی بد بختی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ نہ صرف ملکی آزادی اور اپنوں کا تسلط جاتا رہا بلکہ اغیار کے لیے سندھ کے راستے کھل گئے۔ خراسان کا یہ مخصوص طبقہ جس کے مفادات اور مقاصد وہاں ختم ہو چکے تھے کسی نئی مملکت کی تاک میں راستے اور موقعے کی تلاش میں تھا۔ ان کا رخ سندھ کی طرف ہوا۔ اس وقت سندھ پر خراسان کے ایک مفرور خاندان کا قبضہ تھا۔ خراسان کی سرحد سے یہ نیا ملک مقابلتاً زیادہ خوشحال، سر سبز اور

امن و امان کا گہوارہ تھا۔ اسی لیے جو بھگوڑے وہاں سے ہجرت کر کے یہاں پناہ گزیں ہوئے وہ اپنے گھر کے آنگن میں آ گئے اسی طرح اپنے وطن کو چھوڑ کر سندھ میں آنے والوں میں ایک میر سید صفائی کا گھرانہ بھی تھا۔ جس نے بکھر کو اپنے مستقل قیام کے لیے منتخب کیا۔

بکھر کا انتخاب اور جائے وقوع:

بکھر سیاسی اور سماجی لحاظ سے سندھ کا ایک اہم شہر تھا۔ جائے وقوع کے لحاظ سے بھی ایسی جگہ پر تھا جہاں ساری آسائشیں مہیا تھیں۔ مثلاً کابل، قندھار ایک طرف واقع تھا، دوسری طرف سے سندھ کا دارالخلافہ ٹھٹھہ نزدیک، اور تیسری طرف سے ہندوستان جیسا وسیع و عریض ملک اپنی پوری سر حد کا دامن بچھائے ہوئے تھا ۔بکھر سے سارے راستے اسی طرف جاتے تھے۔ غیر یقینی حالات میں پناہ گیروں کے لیے ایسا شہر نہایت موزوں اور مناسب تھا۔ جہاں ہر قسم کی سہولتیں اور آسانیاں موجود تھیں اور بہ وقت ضرورت دوبارہ فرار کے لیے چاروں طرف سے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ آبائی ملک سے آتے جاتے قافلوں کا راستہ بھی وہیں سے تھا۔ گویا بکھر میں عارضی یا مستقل قیام کا سبب یہ سہولتیں اور آسانیاں تھیں۔

سلطان محمود بکھری:

شاہ بیگ ارغون جن کو بابر بادشاہ نے شجاع بیگ کہا ہے۔۹ء سندھ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے بعد جلد ہی فوت ہوا(۲۲ شعبان ۹۲۸ھ) جس وقت سید میر صفائی بکھر پہنچے اس وقت ان کے بیٹے شاہ حسن ارغون سندھ کے حکمران تھے اور بکھر کے علاقے پر ان کے بیٹے کے دودھ شریک (کوکلتاش) بھائی میر فاضل کے بیٹے سلطان محمود بکھری اس کی نیابت میں حکومت کررہے تھے۔ جس کا میر صفائی کے گھرانے سے پرانا تعلق تھا۔ میر فاضل سادات

کے جد اعلیٰ سید حسن ابدال (بابا ولی قندھاری) کی درگاہ کے معتقد تھے۔ اس کا اظہار ان کے کتبے سے ہوتا ہے جو انھوں نے مرمت کراتے وقت اس بزرگ کے مزار پر لگایا ہے۔ ۱۰

میر سید صفائی جب بکھر پہنچے تو اسی خاندانی تعلق اور راہ و رسم کے سبب سلطان محمود نے ان کا شایان شان استقبال کیا اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ انھیں بکھر میں قیام پذیر کیا۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف نے لکھا ہے

> "سلطان محمود حاکم بکھرنے میر کی آمد کو غنیمت سمجھ کر انھیں بڑی عزت و احترام سے وہیں قیام پذیر کیا۔ ۱۱

محمود بکھری نے صرف پرانے تعلق کے سبب سید صفائی کی پزیرائی نہیں کی تھی بلکہ سید خود بھی اپنے اوصاف میں لاکھوں میں ایک تھے۔ وہ ہر لحاظ سے اس عزت و احترام کے لائق تھے۔ خاندانی پس منظر کے علاوہ ان کی اپنی طبیعت اور مزاج میں لطافت، علم و فضل، زہد و تقویٰ جود و سخا اور مہمان نوازی وغیرہ ایسے اوصاف تھے کہ خراسانی تو خیر ان کے اپنے ہی تھے لیکن نئے وطن کے باشندے جو اجنبی قابضین کے تشدد سے بیزار اور ان کے طور طریقے سے مایوس اور مشکوک تھے، وہ بھی سید صفائی کے گرویدہ ہوگئے اور انھیں ان سے محبت اور اپنائیت کی خوشبو آنے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اوطاق (مہمان خانے) پر سندھیوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔دور اور نزدیک اور آس پاس کے لوگوں کا اژدھام آنے جانے لگا۔ میر معصوم نے اپنے والد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> "نقابت (رہبری) اور کثرتِ ذوق کی صفت سے معمور تھے۔ اور سخاوت و احسان میں مشہور۔ علماء اور فضلا سے ہمیشہ محبت رکھتے تھے۔ مسافر اور پڑوسی آپ کے احسان کے دسترخوان سے فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ اور ہمیشہ۔ التعظیم الامر اللہ و الشفقۃ علیٰ خلق اللہ۔ ضرورت کے مطابق عمل

کر کے محتاجوں اور زیر دستوں کی خدا کی رضا کے لیے امداد اور مدد میں کوشاں رہتے تھے"۔ ۱۲

جس جگہ محمود بکھری جیسے ظالم اور شقی القلب حاکم کے ظلم سے پناہ ملے دسترخوان کشادہ ہو۔ سلام، کلام اور میل جول میں بھی محبت اور شفقت ہو۔ تقویٰ اور پرہیز گاری اور دین و دنیا کا مجسم اور مظہر آنکھوں کے سامنے ہو، اس جگہ مظلوموں کا مجمع اور خلق خدا کا انبوہ کیوں کر جمع نہ ہو۔

سید صاحب خالی ہاتھ، چادر کاندھے پر رکھ کر اللہ کا نام لے کر سندھ میں نہیں آئے تھے۔ جب وطن سے ان کا دل اٹھ گیا تو اپنے کنبے، غلاموں، ملازموں اور خدمت گاروں کے ساتھ بکھر پہنچے تھے اس لیے سندھ پر بوجھ نہیں بنے، بلکہ سندھ اور اہلِ سندھ کے لیے ان کا وجود بڑا سہارا ثابت ہوا۔ اور وہ ان کے لیے بڑے معاون اور مدد گار ثابت ہوئے۔

ذخیرۃ الخوانین کے مصنف جو خود بکھر کے باشندے تھے وہ سید مرحوم کے رہن سہن اور امارت و ثروت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں متعدد کنیزیں اور غلام موجود تھے۔ ۱۳

شیخ اسلامی:

شاہ بیگ کا بیٹا حسن ارغون (۹۶۲ء) میں لاولد فوت ہوا۔ اس کے بعد سندھ کو اس کے دو امیروں نے آپس میں تقسیم کرلیا زیریں سندھ ٹھٹھہ سمیت عیسیٰ ترخان کے حصے میں آیا اور سیہون سے بالائی سندھ سلطان محمود بکھری کے حصے میں آیا جس کا مرکز حسب دستور بکھر رہا۔

ارغونوں نے بکھر کا شیخ اسلام شاہ قطب الدین بن شاہ محمود بن شاہ طیب ہروی کو مقرر کیا تھا۔ جو ان کے ساتھ مل کر کابل اور قندھار سے یہاں پہنچا تھا۔ ان کے علم و فضل کی تعریف کرتے ہوئے میر معصوم رقمطراز ہیں:

"خراسان کے اکابرین بلند پایہ سادات میں سے تھے۔

ترکوں (ازبکوں) کی جنگوں کے سبب ملک چھوڑ
کر سندھ میں تشریف فرما ہوئے اور بکھر میں قیام
پذیر ہوئے۔ جمعے کے دن وعظ کے ذریعے لوگوں
کو سیدھے راستے پر چلنے کے لیے ہدایت کرتے
تھے۔ نہایت متقی، پرہیز گار اور شریعت کے پابند
تھے، سال (۹۷۷ھ) (اوائل ۱۵۷۰ء) کے آخر میں
عالم جاودانی کی طرف سدھارے۔ "وعظ ۹۷۷ھ"
سے ان کی وفات کا سن نکلتا ہے" ۱۴۔

اسی بزرگ کی وفات کے بعد سلطان محمود بکھری نے یہ عہدہ سید صفائی کے سپرد کیا۔ جس کو ان بزرگ نے برسہا برس تک نہایت دیانت داری اور نیک نامی سے انجام دیا۔ ۱۵۔

وفات:

تاریخ معصومی کے مطبوعہ نسخے کے مطابق ذیعقد ۹۹۱ھ۱۶۔ (نومبر ۱۵۷۱ء) میں سید صاحب اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے۔ میر معصوم نے خاندان کے اس حادثے پر جو تاریخ کہی ہے وہ میر صفائی کے مزار پر اس طرح کندہ ہے:

ماہ قرشی سید صفائی
کافراشت فلک لوای نورش
ناگاہ، از ین جہانگہ سیر
افتاد، بآن جہان عبورش
نامی زبرای سال تاریخ
گفتا: پر نور باد گورش
۹۹۱ھ۱۷۔

سلطان محمود تو سخت گیر، تند مزاج اور سخت طبیعت تھے ہی لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ٹھٹھہ میں مرزا عیسیٰ ترخان کا بیٹا باقی ترخان ظلم اور تشدد کی انتہا کیے ہوئے تھا۔ اس پر کشت و

خون کا جنون سوار تھا۔

اس قطعے کے چاروں طرف پتھر کے چاروں کناروں پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں۔

ای آمدہا بر سرِ مزارم
از آمد نت، امید وارم
یک فاتحہ بخوان با خلاص
تاحق کندت بمغفرت خاص
حسرت زدہ ام بخاک ماندہ
افتادہ دریں مغاک ماندہ

سکھر میں میر معصوم کے قبرستان میں چھتری کے نیچے پہلی قبر میں سید میر صفائی ابدی محو آرام ہیں۔

اخلاق اور فضائل:

سید مرحوم کے ذاتی اخلاق، علم و فضل اور جودو سخا کے متعلق ان کے بیٹے میر معصوم کی زبانی اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ دیگر مصنفین نے بھی تھوڑے ردّو بدل سے وہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جنھوں نے بھی ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر میر معصوم کی ہی تحریر رہی ہے۔ بدایونی جو میر معصوم کا معاصر ہے اس نے ان کے گھرانے کی عظمت کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"سندھ کے اکابر اور عظیم الشان سادات میں سے تھے۔ ۱۸"

مآثر رحیمی "کے مصنف نے تقریباً میر معصوم کے الفاظ نقل کیے ہیں ۱۹۔ مقالات الشعراء کا مصنف جو بارہویں صدی کا مورخ ہے انھوں نے اپنے تذکرے (۱۱۷۴ھ) میں وہی باتیں اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں بیان کی ہیں:

"موصوف علم و فضل کے حامل، اپنے عہد کے فضلاء میں مشہور اور علمائے وقت میں یگانہ تھے بہترین کرامات اور اعلیٰ عادتوں کو یاد گار چھوڑا ہے۔ان کی بزرگی اور شرافت تعریف اور تشریح

کی محتاج نہیں ہے۔" [۲۰]

اسی مصنف نے تحفة الکرام (۱۱۸۱ھ) میں بھی یہی بات دہرائی ہے۔ [۲۱]

شاعری:

سید صاحب کے لیے شاعری اگرچہ ان کی فضیلت اور علمی مرتبے کے مطابق نہ تھی۔ لیکن اس دور کے اہل علم و فضل کے طریقے اور رواج کے مطابق، وہ اس ہنر اور ذوق سے بے گانہ نہیں تھے۔ چنانچہ درج ذیل شعر ان کی طرف منسوب ہے۔

شجر عشق، بہ ھر جاکہ دو اند ریشہ
مژۂ مور، کند کار هزار ان تیشہ

میر معصوم نے باپ کے شاعر ہونے کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ معلوم نہیں میر علی شیر 'قانع' نے مذکورہ بالا شعر کہاں سے لاکر ان سے منسوب کردیا ہے۔ [۲۲]

عیال و اولاد:

خیال یہ ہے کہ سید صفائی نے اصلی وطن میں غالباً شادی نہیں کی تھی۔ وہ جب یہاں آئے، اس وقت تنہا تھے۔ یہاں آتے ہی سیوھن کے کھابڑوٹی [۲۳] سادات میں شادی کی۔ یہ رشتہ داری سلطان محمود بکھری کے ذریعے ہوئی جیسا کہ "ذخیرة الخوانین" کے مصنف نے لکھا ہے:

"سلطان محمود......سیوھن کے کھا بڑوٹی سادات سے ان کی نسبت طے کروائی، جس سے صاحب اولاد ہوئے"۔ [۲۴]

سید میر کلان، کھا بڑوٹی سادات کے جداعلیٰ تھے وہ اسی دور اور ان ہی حالات کے سبب خراسان سے ہجرت کر کے سیوھن میں مقیم ہوئے تھے۔ میر معصوم نے انہیں اپنا جد (مادری) لکھا ہے: [۲۵]

سیادت پناہ سید میر کلان......ان اوراق کے لکھنے والے
کا دادا ہے۔۲۶ صاحب تحفۃ الکرام نے بھی میر
معصوم کو سیدوں کے نواسوں میں شمار کیا ہے۔ ۲۷
مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ تاریخ معصومی کے مقدمے میں لکھا
ہے کہ:

"سید موصوف نے ان ہی میر کلاں کی بیٹی سے
شادی کی ہوگی"۔ ۲۸

قرین قیاس یہی ہے کہ ان دونوں گھرانوں کی آپس میں واقفیت اس وقت ہوئی جب میر کلاں کربلا سے لوٹتے ہوئے اشکلچہ کے گاؤں میں شیر قلندر کی درگاہ پر پہنچے۔ ۲۹

سید میر کلان سندھ کی تاریخ میں اہم حیثیت کی حامل شخصیت ہیں۔ ان کا ذکر اس کے بعد علیحدہ باب میں آئے گا۔یہاں میر صفائی کی اولاد نرینہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے خیال ہے کہ وہ اسی ایک بیگم کے بطن سے ہوئی۔

ا۔ میر ابو القاسم:

میر معصوم نے اپنے والد کے مختصر ذکر کے علاوہ اپنے خاندان، بھائیوں اور عزیزوں کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی تاریخ خالصتاً سیاسی واقعات سے متعلق ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے گھرانے کا ذکر موضوع سے خارج سمجھا ہے البتہ مختلف اشارات جو موضوع کے لحاظ سے ضروری تھے وہ انھوں نے بیان کیے ہیں اوز اسی پر اس سوانح کا دارومدار ہے۔

میر ابو القاسم کا نام سب سے پہلے تاریخ بدایونی میں ملتا ہے جس میں انھیں "اعاظم اکابر بکر" ۳۰ لکھا گیاہے اور بیان کیا گیا ہے کہ: وہ میر سید محمد (میر عدل) کے بیٹوں سے مل کر سیوی(سبی) کے قلعے کو فتح کرنے کے لیے گئے جس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد میر ابو الفضل (میر عدل کے فرزند) سے مل کر اکبر بادشاہ کے دربار میں پہنچے۔ جہاں انھیں "منصب

احدیہ" عطا ہوا۔ میر ابو القاسم نے اسی فتح کی تاریخ یوں نکالی ہے:

"فتح سیوی شد بہ اولاد نبی" ۹۸۴ھ[31]

ذخیرۃ الخوانین کے مصنف شیخ فرید جو خود بکھر کے باشندے تھے اور اس خاندان کے متعلق معلومات رکھتے تھے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صفائی کے تین بیٹے تھے[32] جن میں بڑا بیٹا میر ابوالقاسم، دوسرے میر محمد فاضل اور سب سے چھوٹے میر معصوم تھے۔

میرا ابو القاسم کا انتقال (۹۹۱ھ) میں غالباً عین جوانی میں ہوا۔ جس بد قسمت سال میں ان کے والد کا انتقال ہوا اور میر معصوم اس زمانے میں خواجہ نظام الدین بخشی کی ملازمت میں گجرات گئے ہوئے تھے۔

میر صفائی کے اس فرزند کی تربت خاندانی قبرستان کے اندر مرکزی چھتری کے نیچے، میر معصوم کے برابر میں مشرق کی طرف ہے۔ دونوں قبروں کے درمیان ایک بچے کی قبر ہے۔ بھائی کے انتقال پر میر معصوم نے مندرجہ ذیل قطعہ کہا جو قبر کی پائنتی کی طرف کندہ ہے:

چوشد میر ابو القاسم نیک رای
سوی دار عقبا زدار فنا
چو ناسی طلب کرد، تاریخ او
خرد گفت: رفتا بہ دار بقا
۹۹۱ھ

"ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف کے قول کے مطابق اسی بزرگ کا ایک بیٹا محمد شجاع نامی تھا جو اس کے دوسرے بھائی محمد فاضل کا داماد بنا۔

۲۔ سید محمد فاضل:

یہ میر صفائی کا دوسرا بیٹا تھا۔ عالم فاضل اور ہندی

(سندھی؟) زبان کا جاننے والا اور شاعر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے شعر میں کمال کی فصاحت تھی اور ان کی کافیاں لوگوں میں بہت مقبول تھیں ۳۳۔ ہندی (اردو) زبان میں کافی نہیں ہوتی یہ سندھی اور سرائیکی (اور پنجابی) زبان میں بھی ہے یقین ہے کہ سید محمد فاضل سندھی کافی کے ... شاعر تھے۔ کتابت نے سندھی کو ہندی بنادیا۔ سندھی کلام اس دور میں بہت مشہور اور عوام میں مقبول تھا۔ ہندی کا سندھ میں رواج نہیں تھا۔ اور اس دور میں سندھ میں ان کے مقابلے میں سندھی کے کئی کلاسیکی شعراء موجود تھے۔ مثلاً مخدوم نوح، شاہ کریم، سید علی شیرازی وغیرہ، اور ان سے پہلے قاضی قادن اور ان کے معاصر کافی گو شاعر جن کی کافیاں حضرت شیخ سندھی جنداللہ سیوستانی والے برہانپور میں اپنے ساتھیوں سے سنتے رہتے تھے۔ کافی کی صنف مقبول ترین صنف تھی جس کو میر فاضل نے اختیار کیا۔ اور خود بھی قبول عام حاصل کیا۔ ۳۴۔

محمد فاضل کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ایک بیٹی تھی جو ان کے بھتیجے سید محمد شجاع کے گھر میں تھی۔

ان کی قبر پر کتبہ نہیں ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ مرکزی چبوترے پر کون سی قبر میں محو آرام ہیں۔

میر سید صفائی کے چھوٹے مگر عالمی شہرت یافتہ فرزند میر محمد معصوم کا ذکر اس کتاب کا عنوان اور مقصود ہے اس لیے آئندہ کے صفحات ان کے لیے مختص کیے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صفائی تخلص کے متعدد شاعر گزرے ہیں مثلاً صفائی استرآبادی، صفائی اصفہانی،صفائی اند جانی، صفائی برو جردی، صفائی تبریزی، صفائی خراسانی، صفائی سندی، صفائی قزوینی، صفائی قمی، صفائی کرمانی، صفائی ملاسیری، صفائی فراقی، صفائی نصرپوری، صفائی یزدی (فرہنگِ سخنوران، ص ۳۳۸-۳۳۹)۔ مذکورہ بالا فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تخلص سے سندھ میں بھی دو شاعر گذرے ہیں۔

۲۔ ترمذ: آمودریا کے شمال کنارے پر سُرخان دریا کے کنارے پر شہر ہے وہاں کے سادات مشہور تھے، انھوں نے حکومت بھی کی (ملاحظہ کیجیے: اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۲، ص ۳۷۴ تا ۳۷۸)۔

۳۔ ذخیرۃ الخوانین (۱:۲۰۰) اصل ترمذی سید تھے۔ انکا وطن قندھار سے دو تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ انھیں بابا شیر قلندر کے مرقد منور اور معطر کی تولیت کا منصب حاصل ہوا۔ اس کی خدمت میں ان کے ساتھ دوسرے سادات بھی شریک تھے۔ وہاں سے میر صفائی ہجرت کر کے بکھر میں قیام پذیر ہوئے۔(......اصل وطن ایشان ازدوسہ کروھی قندھار است و منصب تولیت مرقد منور و معطر بابا شیر قلندر- کہ در قندھار آسودہ اند–با بعض سادات دیگر شرکت دارند. میرصفائی از آنجابہ بکر تشریف ارزانی فرمودند......)

۴۔ مآثر الامراء (۳:۳۲۶) کے مؤلف لکھا ہے کہ دو تین پشتوں سے ان کی سکونت قندھار میں تھی (مزید احوال ذخیرۃ الخوانین کا ہی درج ہے)۔

۵۔ دیکھیے ترخان نامہ شجرہ (۷)

۶۔ ۹۰۷ سے ۹۱۰ تک ماوراء النہر کی طرف قسمت آزمائی کرتے رہے۔

۷۔ ارسکن نے اس حملے کی تاریخ ۱۸، ذیقعد ۹۲۴ھ (۲۱ نومبر ۱۵۱۸ء) لکھی ہے۔ ۱: ۳۵۳

۸۔ ملاحظہ کیجیے، مکلی نامہ سما خاندان کا حصہ از راقم الحروف۔

۹۔ دیکھیے بابر نامہ، اسکا اصل نام شجاع بیگ معلوم ہوتا ہے۔ شاہی بیگ بھی پکارا جاتا ہے۔ سندھ کی تاریخ میں شاہ بیگ کے نام سے لکھا گیا ہے۔

۱۰۔ یہ کتبہ گذشتہ باب میں نقل کیا جاچکا ہے۔

۱۱۔ سلطان محمود حاکم بکر، مقدمہ میررا گرامی داشتہ به اعزاز و احترام مقیم آنجا ساختند. (۱: ۳۰۰) سلطان محمود کا شجرہ یہاں شامل کیاجاتا ہے۔

۱۲۔ سندھی ترجمہ ۲۸۰۔"به صفت نقابت و وفور حالت موصوف بود و به کثرت جود و سخا مشهور . پیوسته با علما و فضلا صحبت می دا شته، و مسافر و مجاور از موائد ایشان بهره مند می بودند، وهمواره به مقتضای - التعظیم لا مرالله و الشفقة علیٰ خلق الله- عمل نموده، لله فی الله در امداد محتاجان و زیردستان سعی موفور می فر مودند.،، (ص ۲۳۷)

۱۳۔ داه و غلام بسیا ر جمع آورده. (۱: ۲۰۱)

۱۴۔ معصومی فارسی، ص ۱۹۷۔ سندھی ص ۲۳۹۔

۱۵۔ چند سال به استقلال گذرانید. (۲۳۷)

۱۶۔ معصومی، ص: ۱۳۷

۱۷۔ معصومی میں لفظی فرق سے آیا ہے، ص ۲۳۷ مثلا: شاہ قریشی ...... کا فراخت ...... جهان فانی - تاریخ چو جستمش زنامی – بلا خمن (آئین اکبری میں) میر صفائی کی وفات کا سال نہیں دیا ہے – (۵۷۸) صاحب سیلٹ نے اپنے ترجمے میں

سرے سے میر صفائی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۱۸۔ بدایونی ۳: ۳۶۴۔ "از اعیان سادات و اکابر بلده بکربود۔"

۱۹۔ مـاثر رحیمی ۲: ۳۳۶۔ "به صفت نقابت و بکثرت جود و سخا معروف و مشهور بود۔"

۲۰۔ مقالات الشعراء علی شیر قانع ص ۳۶۴۔ "موسی علیه صاحب علم و فضل، سر آمد فضلای عصرو یگانهٔ علمای عهد بود . خوارق حمیده و عادات گزیده به یادگار دارند۔ نقابت و نجابت وی محتاج توضیح و تشریح نیست"۔

۲۱۔ تحفة الکرام، ص ۳: ۱۲۶ فارسی چاپ قدیم " صاحب علم و عمل و سر آمد فضلای عصر بود۔"

۲۲۔ پیر علی محمد راشدی نے ایك رباعی ان سے منسوب کی ہے۔ جس کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے که کہاں سے نقل کی ہے۔مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے که میر معصوم کی کہی ہوئی ہے:

سر منزل ما، نیز هوایی دارد
ویرانهٔ غم، نیز صفایی دارد
دیوانهٔ دل مرا ملامت مکنید
این وادی (ما) نیز صفایی دارد

(حیات معصوم ۱۴)

صفائی کے لفظ نے یه اشتباہ پیدا کیا ہے۔ جو تخلص کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔

۲۳۔ جیسے لکیاری اور مٹیاری سادات شہروں کی نسبت سے مشہور ہیں۔ اسی طرح یه سادات جو اصل میں ترمذی ہیں کھا بڑوٹ یا کھابڑوٹھی (ضلع دادو) کے گاؤں سے منسوب ہوئے۔

۲۴۔ ذخیرة الخوانین (۱: ۲۰۰)۔ "سلطان محمود ...... به سادات کبروت ساکنان سیوستان نسبت ایشان نمودند . تولد و تناسل بهم رسانیده۔" ماثر الامراء (۳:۳۲۶) نے یہی روایت

ذخیرہ سے لی ہے۔

۲۵۔ معصومی، ص ۱۹۴ "سیادت پناہ سیدمیر کلان کہ جد مسود اوراق است"۔

۲۶۔ معصومی، ص ۲۲۲ "سیادت پناہ سید میر کلان کہ جد مسود اوراق است......"

۲۷۔ تحفۃ الکرام خطی ۱۱۰ ب "......میر معصوم بکری از احفادش است......"

۲۸۔ مقدمہ "...... جد (مادری؟)میر معصوم، می توان نتیجہ گرفت کہ سید صفائی دختر این بزرگوار را در حلقۂ ازدواج کشید......"

۲۹۔ معصومی، ص ۱۹۸

۳۰۔ منتخب التواریخ ۲:۲۴۵

۳۱۔ بدایونی، ۲:۲۴۵

۳۲۔ ذخیرہ، ۱: ۲۰۱ "... سہ پسر بہ اوحق تعالیٰ کرامت کرد..."۔

۳۳۔ "از قسم کافی بہ کمال فصاحت می گفت و قبولیت داشتہ..." ذخیرہ، ص : ۱: ۲۰۱۔

۳۴۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے بعد یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ اردو کی ابتداء سندھ میں دکھلائی جائے۔ تاکہ اس بنیاد پر سندھ میں اردو کا جواز پیدا کیا جائے اس کے سب سے پہلے دعویدار سید سلیمان ندوی تھے۔ جنھوں نے سندھ کو اردو کا مولدبتلایا ہے۔ اس کے بعد میرا ایک مضمون چھپا جس میں، میں نے اس مفروضے کی تائید کی۔ سید صاحب مرحوم نے کچھ سندھی اور سرائیکی کے اقتباس دلیل کے طور پر دیے تھے۔ جو سندھ، اور گجرات کی تاریخ میں آئے تھے (فیروز شاہی - مراۃ سکندری - تاریخ احمدی) لیکن میں نے آگے چل کر زیادہ تحقیق اور غور کیا تو معلوم ہوا کہ گجرات والے اقتباس، سرائیکی زبان کے تھے۔ اور

ٹھٹھہ کا فقرہ سندھی کا تھا جو تاریخ فیروز شاہی میں کتابت کی خرابی کے سبب اپنی ہیئت بدل چکا ہے۔ شاہ عالم گجراتی اُچ کا باشندہ تھا اس کی زبان سرائیکی تھی اس کے علاوہ سندھ کے سما حکمرانوں میں سے بی بی مغلی اور بی بی رانی سے ان کا نکاح ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر میں سرائیکی اور سندھی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ گجرات کی فارسی تاریخ میں بھی زبان کی اصل صورت کو ادا نہ کرنے کے سبب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ اس جدید تحقیقی دور میں اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے چند مفروضوں کو بنیاد بنانا، مضحکہ خیز ہے۔ (دیکھیے نقوش سلیمانی ۱۹۶۷، سندھ میں اردو از: حسام الدین، وغیرہ وغیرہ۔)

باب - ۴

میر سید کلاں کھا بڑوٹی سیوہانی

میر معصوم کے نانا میر سید کلاں کا نام گذشتہ صفات میں آچکا ہے۔ اس دور میں سید مذکور کی شخصیت سندھ میں سماجی اور سیاسی لحاظ سے بہت ہی اہم تھی۔ ان کے متعلق جو منتشر معلومات میسر ہیں ان کو یہاں یکجا کیا جاتا ہے۔ تاکہ قارئین کے سامنے کم از کم ان کی زندگی کا خاکہ آجائے۔

میر معصوم کی تحریر کے مطابق سید میر کلاں نے سندھ کی فتح (۹۲۷ھ) کے بعد قندھار سے ہجرت کر کے سیوہن کے آس پاس سکونت اختیار کی۔ آپ کا زیادہ وقت "قدوۃ الواصلین، حضرت لال شہباز قلندر کے مزارفائض الانوار" میں بسر ہوتا رہا۔

ان کے بزرگ کربلا معلیٰ کے عظیم القدر سادات میں سے تھے۔ جہاں سے کسی زمانے میں ہجرت کرکے خراسان آگئے۔ میر کلاں خود اپنے اہل و عیال کے ساتھ قندھار آگئے جہاں میر شیر قلندر کے مزار سے ان کا قلبی تعلق ہوا۔ سید صاحب دیندار اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ بزرگوں کے مزارات سے ان کے انس کا یہی سبب تھا۔ سندھ پہنچنے کے بعد آپ کے دل کی وہی کیفیت برقرار رہی اور یہاں حضرت قلندر شہباز کی درگاہ سے عقیدت و محبت کا رشتہ جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ میر صفائی اور میر کلاں کی پہلی واقفیت حضرت شیر قلندر کی خانقاہ میں ہوئی۔ وہاں کی واقفیت آگے چل کر سندھ میں پہنچنے کے بعد باہمی رشتے داری کی صورت اختیار کر گئی۔

میر معصوم نے لکھا ہے کہ میر کلاں فضیلت اور زہد و تقویٰ

میں بے نظیر تھے، مساکین، فقراء اور اہل دل کے لیے ان کے دل میں بے حد محبت تھی۔ ا۔ پرہیز گاری، فقرا پروری اور مسکین نوازی نے اس نئے ملک میں انھیں جلد ہی ایسا مقبول اور مشہور کردیا کہ ان کی اوطاق آس پاس کے دکھی اور مصیبت زدہ لوگوں کے لیے مرکز اور مرجع بن گئی۔ کیوں کہ ملکی سیاست پر بھی ان نو واردان کا غلبہ تھا۔ جو سید میر کلاں کے ہم وطن تھے اسی لیے سیاسی مسائل اور معاملات کے فیصلوں میں بھی ان کی مرضی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آل رسول ہونے کی حیثیت، ہر حال اور صورت میں اہم اور نمایاں رہی اور کسی بھی مسئلے میں ان کی شخصیت اور وجود کو نظر انداز کرنا سب کے لیے آسان نہیں تھا۔

میر معصوم نے ملکی معاملات میں سید میر کلاں کے ادا کردہ کردار کی ایک مثال پیش کی ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سید موصوف کا وجود کتنا اہم تھا؟

مرزا شاہ حسن ارغون نے ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) میں وفات پائی آخری وقت ان کے دو امراء: مرزا عیسیٰ ترخان اور سلطان محمود بکھری کے درمیان سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے سخت اختلافات پیدا ہوئے اور کافی کشمکش کے بعد آخر دونوں فریقین کے درمیان ایک خانگی معاہدہ ہوا جس کے مطابق بالائی سندھ سلطان محمود کے قبضے میں آیا اور زیریں سندھ مرزاعیسیٰ ترخان کی حکومت میں ہوا۔ معاہدے کے مطابق پہلے کا دارالخلافہ بکھر میں اور دوسرے کا دارالخلافہ ٹھٹھہ رکھا گیا۔ ۲۔

معاہدہ لکھے جانے اور اس پر مہر لگنے کے بعد بھی انھیں ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار نہیں تھا۔ دونوں کے دل میں چور تھا اس لیے دونوں ایک دوسرے کو شک و شبہے کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ مرزا شاہ حسن نے ۱۲ ربیع الاوّل ۹۶۲ھ ۳۔ پیر کے دن بہ وقت عصر علی پوتہ میں انتقال کیا۔ آخری دنوں میں شاہ حسن نے

اپنوں کا یہ حال دیکھ کر مجبوری کے سبب دارالخلافہ ٹھٹھہ کی نگہداشت چند سندھیوں کے حوالے کی تھی۔ مرزا عیسیٰ بطور احتیاط اس خیال سے کہ مرزا کی وفات کے بعد سندھیو ں کا قبضہ نہ ہوجائے ٹھٹھہ میں مقیم رہے جس وقت مرزا فوت ہوئے اس وقت محمود بھکری ان کے یہاں موجود تھے وہ میت ٹھٹھہ روانہ کر کے خود فوراً اپنے مرکز کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے بکھر روانہ ہوئے۔

سندھ بڑے بحران میں آگیا تھا، غیروں کی مدد نہ صرف ایک دوسرے نے کی بلکہ وہ پورے سندھ کو پامال کرنا چاہتے تھے، سیہون کے قلعہ داروں مرزا شاہ مسعود، شاہ حسین نکودری، میر ابو الخیر، میر حمید ساربان اور خواجہ باقی نے قلعہ بند سیہون والے علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، ۴۔ دوسری طرف میرزا عیسیٰ اپنی مدد کے لیے گوا کے پرتگیز (پرتگالی) بیڑے لے کر ٹھٹھہ پہنچے۔ مرزا عیسیٰ کو موجود نہ دیکھ کر ٹھٹھہ کو اتنا لُوٹا، جلایا اور اہلِ سندھ کا اتنا قتلِ عام کیا کہ شاہ بیگ ارغون والاقتل عام اور لوٹ مار اس کے مقابلے میں ہیچ تھا ۵۔ سلطان محمود نے اپنا رُخ سیہون کی طرف رکھا اور وہیں پہنچ کر انھوں نے خون خرابہ اور لوٹ مار کی۔ دوسری طرف بکھر کے علاقے میں عیسیٰ خون بہارہا تھا۔ تیسری طرف پرتگیز نے ٹھٹھہ پہنچ کر اسے آگ لگادی اس طرح سندھ چاروں طرف سے آگ و خون میں ڈوبا ہوا تھا۔

اسی خوفناک صورتحال میں میر کلاں آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے نئے وطن کو ان خونخوار وحشیوں، خود غرض اور توسیع پسند جانوروں کے شر اور فتنہ و فساد سے بچانے کے لیے صلح و صفائی کی کوشش کا آغاز کیا، بڑی کوشش اور کشمکش کے بعد میر کلاں نے دونوں فریق کو سابقہ معاہدے پر نئے سرے سے صلح کروا کر فوجوں کو پیچھے ہٹایا اسی طرح میر کلاں نے ایک بزر گ انسان، دوست، خیر خواہ اور وطن پرست کی حیثیت سے دونوں درندوں

کی ہولناک خونریزی سے وقتی طور پر سندھ کو، سندھ کے بے گناہ باشندوں اور سرزمین کو بچالیا۔٦؎

میر کلاں جب تک زندہ رہے سندھ کے لیے عموماً اور سیہون کے علاقے کے لیے خصوصاً رحمت کا فرشتہ بنے رہے، ہر مشکل وقت اور موقع پر انفرادی اور اجتماعی صورت میں شفیق بزرگ کا کردار ادا کرتے رہے۔ معاملات کو رفع دفع کرنا، مختلف فریقین کے درمیان صلح صفائی کروانا، مصیبت زدہ لوگوں کا سہارا اور دکھی انسانوں کو دلاسہ دینا ان کا رات دن کا مشغلہ رہا۔ خلقِ خدا کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے مولا سے محبت کرتے رہے اور قلندر شہباز کے قرب میں دن رات عبادت اور ریاضت میں مصروف نظر آتے تھے۔

وفات اور مزار:

معلوم نہیں کہ میر کلاں کب فوت ہوئے، میر معصوم نے اپنی تاریخ ۱۰۰۹ھ کے لگ بھگ مکمل کی، میر کلاں کے سلسلے میں ان کی لکھی ہوئی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر موصوف کا انتقال، عیسیٰ ترخان کے آخری سالوں(۹۶۲۔۹۷۳ھ) میں ہوا ہوگا۔ کیوں کہ مرزا عیسیٰ کی اولاد میں جو جنگ و جدل ہوا یا مرزا باقی نے اپنوں اور غیروں پر جو مصیبت ڈھائی اور خون خرابے کیے اس سلسلے میں میر کلاں کا کہیں نام نہیں آیا۔

آپ کا مزار سیہون میں سبزواری سادات والے قبرستان میں مٹی کے ایک ٹیلے پر بے حد زبوں حالت میں موجود ہے۔ موجودہ صورتحال سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبر کے چاروں طرف مٹی کی دیوار تھی۔زمین سے اونچائی پر ہے اور قبر نہایت قابل احترام سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت اس مزار سے متعلق کئی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً راقم الحروف نے جب میر کلاں، کے لواحقین سے قبر کی زبوں حالی کی شکایت کی تو کہا گیا کہ مرمت کے لیے بزرگ نے منع کیا ہے۔ جس نے بھی مرمت او رنئے سرے سے تعمیر کی کوشش

کی وہ خود اپنے خاندان کے ساتھ تباہ ہو گیا۔ اسی لیے کسی کی بھی ہمت نہیں کہ حکم عدولی کر کے مزار کو نئے سرے سے تعمیر کروائے۔

یہ قبرستان سیہون کے کھابڑوٹی(سبزواری) سادات کا ہے جو ان کی اولاد میں سے ہیں۔ قبرستان شہر سے لگا ہوا مغرب کی طرف ہے اسے شہر کا ہی ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔

اولاد:

میر معصوم لکھتے ہیں کہ ان کی کافی اولادیں ہوئیں اور پھلی پھولیں "......اولاد کثیر از ایشان ماند......"

آج بھی ان کی اولاد موجود ہے اور سیہون کی قابل احترام سادات میں شمار ہوتی ہے۔ آخری گدی نشین سید وریل شاہ (B.A) مرحوم تھے جن سے راقم الحروف کی آشنائی تھی۔ وہ قلندر شہباز کی خانقاہ کی آمدنی کے حصے دار تھے۔ اور انھوں نے بڑے آرام و آسائش سے زندگی گزاری۔ اس وقت سید ثابت علی شاہ آپ کے فرزند، شہر کے معزز زمیندار ہیں۔میری درخواست پر صادق علی شاہ صاحب نے مجھے اپنے خاندان کا شجرہ دکھایا اور خاندان کے متعلق کچھ اسناد بھی دکھائیں۔ شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید میر کلاں کے چار فرزند تھے:

۱۔ سید برکو

۲۔ سید محمد

۳۔ سید محمود

۴۔ سید طالب

سید طالب کے بیٹے میر خسرو ہوئے۔ ان کے بیٹے میر مظفر ہوئے اور ان کے فرزند میر خسرو، ان کے بیٹے میر مظفر اور ان کے بیٹے میر فتح ہوئے۔ ان ہی میر فتحی کی اولاد آگے چل کر پھلی پھولی۔ سید وریل شاہ مرحوم اور آپ کا خاندان ان ہی سید کی اولاد ہے۔[۷] میر کلان کے باقی فرزندوں کی اولاد نہیں دکھائی گئی۔ اس کے

علاوہ بیٹیوں کی اولاد شجرے میں حجاب کے سبب نہیں دکھائی جاتی اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ بیٹیاں کتنی ہیں اور ان کی اولاد کون سی اور کہاں ہے؟بہر حال سبزواری سادات کے مقبرے کی تعمیر اوران پر کاشی کے کام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان سادات میں کتنے لوگ صاحب طریقت ہوئے ان پر خوبصورت مقبرے تعمیر ہوئے اور تشخیص کے لیے ان پر الگ الگ مقبرے تعمیر کئے گئے۔سیدمیر کلان کے نسب کا سلسلہ شجرے میں اس طرح دکھایا گیا ہے:

> سید میر کلان، بن علی، بن سید ولی، بن سید محمود، بن سید جعفر، بن سید مغفور، بن سید محمد، بن علی، بن ابی طالب محمد، بن علی، بن ہیبت اللہ، بن ثعلب، بن محمد، بن علی، بن احمد، بن حسن محمد، بن ابراہیم، بن محمد، بن موسیٰ کاظم، بن جعفر صادق، بن محمد باقر، بن امام زین العابدین، بن حضرت سید نا حسین ، بن علیؓ بن ابی طالب۔ ۸۔

میر کلان کو حکومت وقت نے وظیفے اور زمین دی تھی، جو مغلوں کے دور تک ان کی اولاد کے زیر تصرف رہی۔ ۹۔ اس وقت بھی ان کی اولاد زمیندار ہے۔اس کے علاوہ قلندر لال شہباز کی نگہداشت بھی ان کا حصہ ہے اور غالباً یہ اس سبب سے ہوا کہ سید میر کلان نے اپنی زندگی اسی درگاہ سے متعلق رہ کر گذاری۔

حواله جات

۱۔ ”در زهد و عبادت نظیر خود ندا شتند و رعایت جانب فقرا و مساکین می نمود ند ....“ (معصومی، ص ۱۹۸)

۲۔ ...از لکی بالا تر تعلق به سلطان محمود خان دارد، واز کوه لکی این جانب به میرزا عیسیٰ ترخان دارد، برین جمله مقر ومعترف گردیده، وثیقه به جهت تاکید به قید کتابت در آورد. به مهرهای خود و مهرهای اکابر مزین گردانیدند....... (معصومی، ص ۱۹۱)

۳۔ معصومی ...دوشنبه دو از دهم (ربیع الاول ۹۶۲ھ/ ۲ فیبروری ۱۵۵۵ء) ... نزدیك نوبت عصر مرغ روح میرزا شاه حسن ندای ارجعی... شنید و به مرغزار جنانِ طیران نمود. (معصومی، ۱۹۲)

ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی کے خیال کے مطابق وفات کی تاریخ پیر، ۹ جمادی الاول ۹۶۲ھ/ یکم اپریل ۱۵۵۵ء ہونی چاہیے۔ (ترجمہ، معصومی ۱۲۳ اور ضمیمہ ۲۴۷۔ اور سیدی علی رئیس کے سفر نامے کا سندھی ترجمہ از راقم الحروف مطبوعہ مجلہ مہران، سال ۱۹۷۱)

۴۔ معصومی، ص: ۱۹۴

۵۔ پرتگیز ۱۵۵۶ء میں Pedro Barreto Rolin کی سرکردگی میں بیڑے لے کر آئے (مخزن سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی ۱۹۳۸ء ۳:۴ ص ۴۷) انھوں نے تقریباً سب جامع مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھنے والے جماعتیوں کو تہ تیغ کردیا۔ اور شہر میں کئی گنج شہیداں بن گئے گویا سارا ٹھٹھہ نگر گنج شہیدان بن گیا تھا۔

۶۔ معصومی، ۲۰۸-۲۲۲

۷۔ میر فتحی کے بیٹے سید میر صادق علی ہوئے، ان کے بیٹے میر فتحی ہوئے، ان کے بیٹے سید میر انور ہوئے، ان کے بیٹے سید میر جعفر علی ہوئے۔ اسی شجرے کے آخر میں سید علی ابن الحسین بن العقیل حسینی اور عبدالرزاق بن حسین بن تاج الدین محمد بن علی الحسینی مشہور بہ گل سرخ اور محمد بن علی بن حسین الحسینی المعروف مکہ کے دستخط ہیں۔

۸۔ اس شجرے کے قدیم نسخے پر سال ۶۹۳ھ لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد کے شجرے پر ۹۹۴ھ لکھا ہے۔

۹۔ تین پروانوں کے فوٹو دیئے جاتے ہیں، جن کے سال اس طرح ہیں: ۱۰۱۶ھ، ۱۰۵۰، ۱۳۱۹ھ

باب ۔ ۵

سید صفائی کے دور میں سندھ کی سیاسی اور ملکی حالت

دسویں صدی ہجری سندھ کے لیے غیروں کے تسلط، ظلم و ستم اور بڑی مصیبت کی صدی تھی۔ جس کے بعد ڈھائی سو برس تک سندھ غلامی کی زنجیروں کو توڑ نہ سکا۔ اس ڈھائی صدیوں کی مایوسی اور غیروں کے غیر شریفانہ روئیے نے سندھی عوام کے ذہن، فکر، حوصلے اور ہمت کو اتنا نقصان پہنچایا کہ آج بھی اس کے اثرات ان کے مزاج اور طبیعت پر اثر انداز ہورہے ہیں۔

ارغونوں کی استبدادی حکومت، ترخانوں کی زور زبردستی، مرزا باقی ترخان اور محمود بکھری کی ظالمانہ گرفت نیز خراسان سے لا تعداد مغرور امیروں، صاحب اختیار و اقتدار پناہ گزینوں کی آمد، سندھ جیسے امن پسند اور خاموش مزاج ملک کے لیے، در حقیقت ایک عذاب اور قہر خداوندی تھا۔ جو یہاں کی مقامی خانہ جنگی کے نتیجے میں قدرت کی طرف سے بطورسزا نازل ہوا۔ جس کا نتیجہ اجتماعی اور انفرادی طور پر پورے سندھ کو بھگتنا پڑا۔ ملک کے سب قلعے، شہر اور بستیاں، ملکیت یعنی کہ سارا مال و اسباب غیروں کے قبضے میں آگیا۔ جن کی نہ تو زبان سمجھ میں آرہی تھی اور نہ یہ ان کے چال چلن، رہن سہن اور نشست و برخاست سے یہاں کے لوگ آشنا تھے۔ ہند مغلوں کے قبضے کے حالات کو دیکھ کر ہمارے قومی شاعر شاہ لطیف نے ایک صدی بعد مندرجہ ذیل ابیات میں جو کچھ فرمایا اسے حقیقت میں

اس ساری صورتحال کی مجمل تفصیل کہہ سکتے ہیں، جو ارغونوں سے لے کر ان کے جانشین ہند مغلوں کے تسلط سے بیت چکا تھا۔

خلاصہ:

(شاہ لطیف نے اپنے ان اشعار میں سسّی پنوں کی داستان کی روشنی میں یہ بات بتائی ہے کہ میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جن کی زبان میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں سندھی میں بات کرتی ہوں اور وہ فارسی بولتے ہیں۔ میں نے ان سے دکھ حاصل کیے وہ میرے لیے مصیبت کا سبب بنے)۔

ان "بروبگیردوالوں" نے گاؤں کی زمینیں جن پر سندھ کے غریب عوام کے گزر بسر کا دارومدار تھا، ساز باز کر کے آپس میں بانٹ لیں۔ اور مختلف ناموں سے جاگیریں اپنے لوگوں میں تقسیم کردیں۔ کچھ لوگوں کو وظیفے اور کچھ کو آبادی یا کسی دوسرے بہانے سے دے دیں۔ ملک کے اصل مالکوں کو نظر انداز کر کے سب اعلیٰ عہدے آپس میں تقسیم کرلیے۔ اسی طرح سندھ کی قسمت اور ثروت کی باگ ڈور مکمل طور سے ان باہر کے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی اور سندھ کے لوگ قدرت کا یہ تماشا دیکھتے رہے اور اپنی بد بختی پر روتے رہے۔

اس ساز باز کرنے والے لوگوں کی تعداد خدا جانے کتنی ہوگی لیکن کچھ واقعات کے سلسلے میں کچھ خاص صاحب اختیار لوگوں، افسران اور امیروں کے نام تاریخ میں آگئے ہیں۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اقبال کا سورج کس طرح نصف النہار تک پہنچا۔

۱۔ امیر فاضل کوکلتاش
۲۔ سلطان محمود بکھری
۳۔ سلطان علی ارغون

۴۔ علی حسن ارغون
۵۔ میر علیگ ارغون (محمود بیگلار کے عزیز)
۶۔ میر کیبک ارغون
۷۔ میر فرخ ارغون
۸۔ میر جملہ ارغون
۹۔ میر شاہ محمود ارغون
۱۰۔ میر سفر ارغون
۱۱۔ میر قاسم کیبک پوش
۱۲۔ میرزا بیگ علی
۱۳۔ شاہ حسن نکودری
۱۴۔ میر محمد قلی
۱۵۔ میر دوست میر آخور
۱۶۔ میر سید قاسم
۱۷۔ ملک محمد کوکہ
۱۸۔ میر ابو مسلم
۱۹۔ میر محمود ساربان
۲۰۔ سلطان محمد سہردار
۲۱۔ میر عبدالرزاق
۲۲۔ میر ابوالفتح
۲۳۔ مرزا قاسم ایلچی
۲۴۔ حمزہ بیگ
۲۵۔ دولت خان
۲۶۔ پایندہ محمد قریشی
۲۷۔ میر سلطان قلی بیگ
۲۸۔ علی محمد کوکلتاش
۲۹۔ دولت محمد
۳۰۔ ھندو علی کایوبی

۳۱۔ میزرا شادمان
۳۲۔ جوہر خان
۳۳۔ امیر قلی سہردار
۳۴۔ خواجہ شمس الدین ماخولی
۳۵۔ میر حمیدبن محمود ساربان
۳۶۔ درویش محمد
۳۷۔ حمزہ بیگ
۳۸۔ مشیر محمد
۳۹۔ میرزا قاسم
۴۰۔ میر کوچك
۴۱۔ یادگار محمد کوتوال
۴۲۔ خواجہ باقی
۴۳۔ میرزاقاسم
۴۴۔ خواجہ محمد حسین
۴۵۔ فقیر محمد ترخان (داماد عیسیٰ خان)
۴۶۔ احمد تر خان
۴۷۔ یاد محمد تر خان(خواھر یازدہ عیسیٰ ترخان)
۴۸۔ کوکو ترخان
۴۹۔ زینك ترخان
۵۰۔ محب تر خان
۵۱۔ پایندہ محمد تر خان
۵۲۔ میر محمد مسکین ترخان
۵۳۔ جانی ترخان
۵۴۔ بابا احمد (برادر محمود بکھری)
۵۵۔ بابا چوچك (معتمد سلطان محمود)
۵۶۔ مراد بیگلار
۵۷۔ سلطان مقیم بیگلار

۵۸۔ سلطان قلی بیگلار

۵۹۔ میرابو القاسم وغیرہ

ان کے علاوہ سینکڑوں دوسرے امیر تھے جن کی منقش قیمتی قبریں، سندھ کے عام قبرستانوں خاص طور پر مکلی کے قبرستان میں اب تک دیکھنے میں آتی ہیں جن میں "یوم الحساب" تک کئی معلوم اور نا معلوم اشخاص زیر زمین ہیں ان میں ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا قبیلہ بھی تھا۔

یہ لوگ جب اس نئی دنیا میں پہنچے تو وہاں ان کے اصل نسل سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ ان میں سے ہر ایک میر، امیر، مرزا، خان، بیگ، سلطان ، ملک اور خواجہ سے کم رتبے کا نہیں تھا۔ تاریخ میں ان اضافی القاب سے ان کا نام لکھا گیا ہے۔ حالانکہ سوائے چند کے دوسرے کسی کا نام و نشان ان کے اپنے وطن یعنی خراسان کی معتبر تاریخوں میں نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ وہاں کیا تھے؟ کون تھے؟ ان کی کیا حیثیت تھی؟ ثروت کیا تھی؟ اس کا علم خدا کو ہے۔ بہر حال یہاں پہنچتے ہی ہر چیز ان کی ہو گئی ملک ان کا، ملکیت ان کی، کاروبار ان کا، غرض یہ کہ سفید و سیاہ کے مالک بن گئے۔ جہاں سے آئے وہاں ایک دوسرے کے شریک کار تھے۔ جب یہاں پہنچے تو ایک دوسرے کے مدد گار، ہمدرد اور معاون رہے۔ مقصد ایک، مطلب ایک، زبان اور تہذیب بھی ایک تھی۔ فکری اور ذہنی رجحان بھی یہی ایک تھا جو فاتح کا مفتوح کے لیے ، اور غالب کا مغلوب کے لیے یا مال غنیمت کے سلسلے میں تقسیم کنند گان کا ہوتا ہے۔ شاہ بیگ ارغون پہلا حاکم اور دوسرا حاکم انکا بیٹا شاہ حسن ارغون بنا۔ دونوں کی حکومتوں کا دور ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۲ء سے ۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء تک یعنی چونتیس برس رہا۔ اس مختصر عرصے میں ٹھٹہ سے ملتان تک مفتوحین کا جو حال رہا، خلق خدا کے مال و اسباب ، آبرو عزت سے جو سلوک روا رکھا گیا اس کی چند مثالیں نادانستگی میں اتفاقیہ طور پر تاریخ میں محفوظ ہو گئی ہیں اس سے

ان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً

۱- (شاہ بیگ کے لشکر) نے ٹھٹہ شہر کو تاراج اور تباہ کر کے، وہاں کے باشدوں کے منہ میں ذلت کی دھول ڈال دی [۱]۔

۲- ٹلٹی میں رہ کر وہاں کے باشندوں کی زندگی کو فنا کی ہوا اڑا دیا [۲]۔

۳- ماچھی قبیلے کے لوگ اطاعت سے انکار کررہے تھے اس لیے ان سب کا قتل عام کیا گیا اور ان کے مال و اسباب کو غارت کر کے ان کے گھر بار، آبرو اور عزت تباہ کر کے ان کے قلعہ جات مسمار کردئے [۳]۔

۴- فیصلہ کیا گیا کہ اس قوم (جتوئی بلوچ) کی آگ کو تلوار کے پانی سے بجھا دیا جائے......جب مقررہ وقت آپہنچا تو اس وقت سب تلواریں بیك وقت نیام سے نکلیں اور ان پر حملہ کر کے ان کا خاتمہ کردیا چنان چہ آن واحد میں بلوچوں کے بیالیس گاؤں کا صفایا ہو گیا [۴]۔

۵- تیزی سے حملہ کر کے اس گروہ کو تہ و بالا کر دیا یعنی کہ صبح سے لیکر شام تك قتل عام کا بازار آراستہ رہا اور تقریباً بیس ہزار افراد کا صفایا ہو گیا [۵]۔

۶- اور الور (اروڑ) جو پہلے سندھ کا پایۂ تخت تھا، اس کو ویران کر کے وہاں کی پختہ اینٹیں اٹھا کر بکھر لائی گئیں...... تُرك اور سما کی عمارات کو جو پہلے سندھ کا پایۂ تخت تھا، اس کو ویران کر کے وہاں کی پختہ اینٹیں اٹھا کر بکھر لائی گئیں.......... ترك اور سما قبیلے کی عمارات کو جو بکھر کے آس پاس تھیں۔ ان کو ڈھا کر پکی اینٹیں قعلۂ بکھر میں استعمال کی گئیں [۶]۔

۷- اور جب سیوراء کے قلعے کے نزدیك پہنچے تو تباہی اور بربادی کی انتہا ہو گئی مخالفوں کا جو آدمی نظر آیا اسکو تہ تیغ کر دیا [۷]۔

۸- سیوراء قلع کے پاس قیام کر کے حکم دیا کہ قلعے کو ویران کیا جائے۔ ایسے (مضبوط) قلعے کو ایک ہفتے کے اندر برباد کر کے سطح زمین سے ملا دیا۔ ۸۔

۹- رائے زادہ بہلول اور دوسرے کئی لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ میرزا (شاہ حسن) کے قتل کا اشارہ کر کے خود شہر کا رخ کیا۔ اچانک قلعے کے دروازے کو توڑ کر مار دھاڑ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سرداروں کے سر نیزے کی نوک پر رکھ کر لانگاہوں (ایک قوم) کو دکھائے گئے۔ انھوں نے مجبور ہو کر شکست کھا کر برجوں اور قلعے کی دیواروں سے چھلانگیں لگا کر اس کو راہ نجات سمجھا اور کچھ لوگوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کیا۔ حکم کے مطابق اوچ کے لوگوں میں سے جو ان کے ہاتھ آیا اس کو قتل کیا گیا اور شہر کو (دل کھول کر) غارت کیا گیا۔ ۹۔

۱۰- (دلاوار کے قلعے میں)... گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی... قلعے کے لوگ بے شمار قتل کیے گئے، باقی زخمی ہو گئے اور جو بچ گئے ان کو قید کیا گیا۔ ۱۰۔

۱۱- ... میرزا (شاہ حسن) لشکر ساتھ لے کر لنگر خان، بٹھی کھلوان (بٹی کلھوڑاں) پر حملہ کیا۔ جہاں سے اناج، مویشی اور دوسرا سامان لوٹ کر واپس لشکر گاہ کی طرف لوٹ آیا۔ فاتح لشکر نے محاصرہ اور محاربہ شروع کر دیا۔ ۱۱۔

۱۲- دھاریجہ (قبیلہ) کے سرداروں کو اپنے ساتھ لے آئے جن میں سے سلطان محمود خان نے ستائیس افراد کو مروا دیا۔ ۱۲۔

۱۳- دھاریجہ کا مسئلہ شاہ بیگ کی خدمت میں سلطان محمود خان نے ارسال کیا... سلطان محمود خان فوراً شہر پہنچے اور راتوں رات سب لوگوں کی گردنیں کٹوا کر لاشوں کو اسی برج سے نیچے دریا میں پھنکوا دیا جو خونی برج کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۳۔

۱۴- مرزا (شاہ حسن) نے حکم دیا کہ جو کوئی حکم سے انحراف کرے اس کا سر نیزے کی نوک پر رکھا جائے اور اُچ کے قلعے اور وہاں کی عمارات کی لکڑیاں کشتیوں میں لاد کر بکھر لایا گیا۔۱۴

۱۵- میر عبدالفتح (سلطان محمود) کے بھائی نے کئی بلوچوں اور دوسرے لوگوں (سندھیوں) کو قتل کر دیا۔۱۵

۱۶- تیس آدمی اس کی (سلطان محمود کی) شمشیر کی ضرب سے شہید ہوئے۔بے کسوں کے کشت و خون کے ایسی شاہانہ شغل میں، لشکر نے .... جس کے لیے میر معصوم نے "بہادر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دوسو سندھی مظلوموں کو شہید کر دیا۔ عبارت کا انداز کچھ اس طرح ہے "دویست کس از اعدا ر ابخاك هلاکت اند اختند و سایر بلوچان حال بدین منوال دیده بدر رفتند۔" ۱۶

۱۷- انھوں نے .... کاہان اور باغبان کے گاؤں کو آکر لوٹا...... اسی لوٹ مار میں رھٹوں میں چلنے والے ایک ہزار اونٹ لے گئے۔۱۷

۱۸- ملتان میں قحط اور اناج کی قلت کے سبب بیل کی سری دس ٹنکوں میں، اناج کا من ملتانی حساب سے ایک سو ٹنکوں تک پہنچا۔ بہت سے لوگ تو بیلوں کی کھالیں اور چمڑے جو کھانے کے لیے نہیں ہیں (بحالت مجبوری) کھا رہے تھے۔ حالت یہ تھی کہ کتے بلیاں چھوٹے بکروں کی طرح کھائی جارہی تھیں۔ آخر کار (محصور) لوگوں نے کوئی اور راستہ نہ پا کر ذبح ہونا اور مرنا قبول کرلیا اور قلعے سے چھلانگ لگانا شروع کردی۔ ۱۸

۱۹- محاصرہ کی مدت جب ایک سال تک بدستور قائم رہی اور قلعے کے لوگوں کی جان پر بنی اور چھرا اپنی گردن پر دیکھا (یعنی معذور، مجبور اور لاچار ہوگئے) اس وقت ۱۱ ربیع

الثانی ۹۳۳ھ بہادر ارغونوں نے جان لیوا نیزوں کی بوچھاڑوں سے جسموں کو روحوں سے آزاد کر دیا۔ صبح کو ایک ٹولہ بھالوں اور گرزوں سے (قلعے کا) "لاہوری دروازہ" توڑ کر اندر داخل ہو گیا، پھر تو انتہا ہو گئی، نہایت بے دردی اور بے رحمی سے قتل و غارت، لوٹ مار اور مار دھاڑ کا آغاز ہوا۔ سات سال سے لے کر ستر سال کی عمر تک جو بھی ہاتھ آیا اس کو قیدی بنالیا۔ اہل ملتان پر قیامت ٹوٹ پڑی، جو بھاگ سکے انھوں نے خانقاہ بہاء الدین زکریا و رکن عالم میں پناہ لی۔ دس بارہ دن تک شہر میں یہ حالت رہی۔ اس کے بعد محب علی ترخان نے خانقاہ کا رخ کیا وہاں جس کو دیکھا مار دیا اور خانقاہوں کو آگ لگا دی۔ بزرگوں کے مزارات کو خون سے لال کر دیا۔

لانگاہ (قبیلہ) اور ملتانی زیادہ تر اس غارت گری میں قتل ہوئے اور قیمتی ہیرے جواہرات اور دوسرا مال خزانہ جب مغلوں کے ہاتھ آگیا اور پوری طرح لوٹ لیا گیا تب کہیں جا کر میرزا شاہ حسن کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور لشکر نے اپنی تلواریں نیام میں ڈال دیں۔۱۹؎

۲۰- ۹۴۵ھ کے اوائل (شاہ حسن) رادھن پور سے ٹھٹہ روانہ ہوئے، راستے میں جاڑیجہ اور سوڈھا (قبائل) کو لوٹتا اور قتل کرتا گیا۔۲۰؎

۲۱- ملا درویش محمد انبار دار کو سلطان محمود کے گھر کے سامنے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ مقادم میں سے ہر ایک ھالہ اور عمر شاہ کی کھال اتروائی گئی اور لاشوں کو بکھر کے دروازے پر لٹکایا گیا۔۲۱؎

۲۲- مجاہد خان کی والدہ صالحہ بیگم نے ظلم کی انتہا کر دی تھی۔ بیمار لوگ جب (علاج کے لیے) قلعے سے باہر نکلتے تھے تو ان کے پیٹ چیر کر دیکھتی تھیں کہ کہیں پیسے تو

نہیں لے جا رہے۔ قلعے والوں نے جب یہ حال دیکھا تب انھوں نے قلعے میں رہ کر مرنا بہتر سمجھا اور صبر کے ساتھ بیٹھے رہے۔۲۲؎

یہ خلاصہ ہے ان غیر ملکی قابضین کے دور اور طرز حکومت کا جس میں سندھ کے لوگ اپنے دن رات گزار رہے تھے۔ اس ظلم، تکلیف اور وحشت کی حالت میں کسی کو یقین نہ تھا کہ آنے والی گھڑی میں کون زندہ رہے گا اور کون مر جائے گا۔

میر سید صفائی، خدا ان پر رحمت کرے، اسی دور میں یہاں وارد ہوئے۔ وہ اگرچہ اسی قسمت آزمانے والے آوارہ ٹولے کے ہی ساتھ آئے تھے لیکن آدمی آدمی میں فرق ہے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں، خراساں میں پیدا شدہ بدامنی کے سبب ان کے لیے اور کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ان بھگوڑوں کے ساتھ یا ان کے پیچھے آئیں۔ ترک وطن کے بعد یہی ملک قریب تھا۔ واقف کار اور ہم زبان بھی یہیں آئے تھے۔ اس لیے سندھ میں ان کی سکونت ایک قدرتی امر تھی۔

اسی قسم کے شرفاء کے اور بھی کئی قافلے یہاں پہنچے تھے مثلاً ٹھٹھہ کے شکر الٰہی، شیرازی، مازند رانی، عرب شاہی، سبزواری، پورانی، بیگلار اور اسی طرح بکھر کے سید، رضوی، عریضی، میر کی، قطب شاہی وغیرہ جن میں اکثریت علماء، بزرگوں، زاہدوں اور اہل علم اور اصحاب قلم کی تھی جنھوں نے سندھ کو وطن سمجھ کر اس سرزمین سے محبت کر کے بہت کچھ دیا۔ ظاہر ہے کہ جب سب ہم وطن اور ہم جنس آپس میں ملے اور اتفاق کے سبب ملک اور ملکی حکومت پر وہاں کے لوگوں کا قبضہ تھا جن میں سے کئی سید میر صفائی کے ذاتی واقف کار، معتقد یا شناسا تھے۔ اسی لیے انھیں اپنے وطن جیسی بلکہ اکثر حالات میں تو وطن سے بھی زیادہ سہولتیں اور آسائشیں میسر ہو گئیں۔

میر سید صفائی نہ صرف اپنی ذاتی خوبیوں اور شخصی صلاحیتوں یعنی زہد، تقویٰ، دینداری اور پرہیز گاری کے سبب ممتاز

تھے بلکہ اپنی ثروت مندی اور ظاہری شان و شوکت کے سبب بھی اپنے حلقے میں انھیں کو مرتبہ اور برتری حاصل تھی۔ مال اسباب کی فراوانی اور غلاموں اور کنیزوں کی کثرت سخاوت اور دستر خوان کی کشادگی، ہر ایک کے ساتھ انکساری اور محبت سے پیش آنا یہ سب ایسے اوصاف تھے جنھوں نے ان کے دنیوی جاہ و جلال کو آسمان پر پہنچا دیا۔ جب انھوں نے سکھر میں قدم رکھا اس وقت وہاں کے حاکم سلطان محمود بکھری کا انھیں تقرب حاصل ہو گیا جو اپنی بدفطرتی اور سخت مزاجی کے سبب آئے ہوئے غیر ملکی قابضین میں ظالم ترین انسان اور بدترین حکمراں تھا اور سندھ میں سب سے زیادہ بدنام تھا۔ میر معصوم نے اپنی تاریخ میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں وہ اس بات کو ٹال نہیں سکے اور انھیں لکھنا پڑا کہ:

> "ان کے مزاج میں سختی اور بہت تیزی تھی، اسے غضب آتا تو ضبط نہ کرسکتا تھا۔ خونریزی کرنے میں اسے ترس نہ آتا تھا، معمولی سے شك و شبہے پر آدمی کا گھربار برباد اور اجاڑ کر رکھ دیتا تھا"۔[۲۳]

میر معصوم نے اپنے والد کے اس مربی اور اپنے پہلے ولی نعمت کی تعریف بھی کی ہے لیکن وہ اپنی بد اعمالیوں کے سبب اس حد تك رسوا اور بدنام تھا کہ مذکورہ بالا مختصر عبارت لکھنے کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اس قسم کے حاکم کی سرپرستی حاصل ہونے کے بعد بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سید صفائی کا دنیوی اثر، شخصیت اور شان و شوکت کس حد تك پہنچی ہو گی۔ خاص طور پر ان حالات میں جب مذہبی ادارے کا اعلیٰ ترین عہدہ بھی ان کے سپرد کیا جائے یعنی ولایت بکھر کی کل حدود کے "شیخ الاسلام" مقرر ہوئے۔

سید صاحب خواہ تخت گاہ ٹھٹہ کے شیخ الاسلام سید شکر

الہی شیرازی کا زہد، پرہیز گاری، خدا پرستی اور خدا شناسی بے شبہ ایک طرف، لیکن یہ معلوم نہیں کہ دینی علوم میں دونوں کا درجہ کس قدر تھا اور شیخ الاسلام ہونے کے لیے جو علمی لوازمات تھے ان میں ان کا مرتبہ کون سا تھا۔ دونوں بزرگوں کے ظاہری شان و شوکت، جود وسخا، زہد و تقویٰ کی تعریف تو دل کھول کر کی گئی ہے لیکن ان کی مذہبی تعلیم اور ان کے رتبے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا۔ جس سے معلوم ہوسکے کہ آیا وہ اسی مذہبی رتبے اور عہدے کے کس قدر اہل اور لائق تھے۔ ٹھٹہ کی شیخ الاسلامی پر سید شکر اللہ شیرازی کا فائز ہونا اور ان کی وفات کے بعد شیخ محمد ہروی کو اوچ سے بلوا کر مقرر کرنا، اسی طرح بکھر میں شاہ قطب الدین ۲۴؎ جو شیخ الاسلام ہونے اور اس کے بعد میر صفائی کے تقرر کا مذہبی اور دنیوی نقطۂ نگاہ سے جواز معلوم کرنے میں، اگر اس وقت کے محکوم لوگوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی سندھ کی آنے والی آزاد نسلوں یا کم سے کم تاریخ کی عدالت کے لیے آسان ہوتا اور قائل ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ تاکہ سندھ میں اس وقت جو عظیم ترین عالم دین موجود تھے ان کے مقابلے میں مذکورہ بزرگوں کا تقرر، ہر صورت اور ہر لحاظ سے ضروری اور جائز تھا، مثلاً مندرجہ ذیل سندھی علماء پر انھیں کیا واقعی فوقیت اور برتری حاصل تھی؟

مخدوم بلال: زہد و تقوی میں بے نظیر تھے۔ تفسیر اور حدیث میں ان کے مقابلے کا اس دور میں کوئی عالم نہیں تھا۔ خود میر معصوم لکھتے ہیں کہ:

قلم کو طاقت نہیں ہے کہ جو ان کے سب فضائل بیان کرسکے۔ دینی علوم اور طریقت و تصوف میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

قاضی دتہ:

دینی علوم میں بڑے مرتبے کے مالک تھے، مذہب اور حوالہ جات کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے انھیں یاد تھے۔ علم اور فضل میں امام جار اللہ ۲۵؎ کے برابر تھے، خود شاہ حسن ارغون

اور میر معصوم ان سے فیض یاب ہوئے اور علم حاصل کیا۔

مخدوم رکن الدین:

متعدد کتابوں کے مصنف اور میر معصوم کے قول کے مطابق "یگانہ عصر" تھے۔

مخدوم میراں:

معقول اور منقول میں جامع الحیثیت اور شاہ حسن ارغون کے استاد تھے "وارث الانبیاء" ان کی وفات کی تاریخ ہے۔

مولانا ضیاء الدین:

دینی علوم میں جامع اور کامل تھے، سندھ میں ان کی شخصیت بڑے ادب اور احترام سے دیکھی جاتی تھی۔

مخدوم فضل اللہ:

عالم، فاضل اور علم کے کئی شعبوں میں اکمل تھے۔

مولانا یوسف:

دیندار اور پرہیز گار تھے اور شرعی علوم میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مولانا عبداللہ مفتی ملتانی:

ان کے لیے میر معصوم کا قول ہے کہ سچ مچ وہ علوم عقلیہ کے معتبر عالم تھے۔ حدتِ طبع اور دقت ذہن میں انھیں بلند ترین رتبہ حاصل تھا۔

مخدوم قاضی عثمان دربیلائی:

معقول اور منقول تمام اصناف کے لاجواب بزرگ گذرے ہیں۔

یہ بزرگ اور ان کے علاوہ دوسرے کئی عالم فاضل سندھ میں موجود تھے جو دینی عہدوں پر فائز ہونے کے ہر طرح لائق اور مستحق تھے۔ لیکن ملک کی باگ ڈور پر قابض ہونے کے بعد انھوں نے مذہبی مناصب اپنے ہی ہم وطنوں کی تحویل میں دینا مناسب سمجھا، تاکہ ان کے شاہی فیصلوں اور منصوبوں کو آسانی سے مذہبی تائید میسر آسکے۔ قابضوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں جو عالم پر آشکار ہیں یزید سے لے کر، چنگیز اور ہلاکو سے تیمور تک سب کی یہی پالیسی رہی ہے۔

سندھ کے مذہبی پیشواؤں اور علمائے دین نے بہرحال اس پالیسی کو شدت سے محسوس کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی سبب تھا کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے قطعی گوشہ نشینی اختیار کی اور جو زیادہ حساس تھے انھوں نے روز روز کی زیادتیوں، غلط کاریوں اور بے انصافیوں کو دیکھنے کے بجائے یہاں سے ہجرت کرنے کو ترجیح دی تھی تاکہ ذہنی اذیت اور فکری عذاب سے نجات حاصل کرسکیں۔ قاضی عبداللّٰہ اور شیخ عبداللّٰہ پہلے گجرات پھر وہاں سے مدینہ منورہ چلے گئے۔ شیخ عیسیٰ سندھی اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب اور اہل و عیال کے ساتھ ایسے برہان پور گئے کہ پھر وطن کی طرف دوبارہ رخ نہ کیا۔ پردیس میں صرف سندھی کافیاں سن کر کڑھتے رہتے تھے۔ اسی طرح یہاں کے اصحاب علم اور اصحاب فکر و نظر اپنے مہاجر بھائیوں کی بے ڈھنگی روش کے سبب اپنے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئے۔

اگر سید صفائی کے دور کے مکمل سیاسی اور ملکی حالات کو ذہن میں رکھا جائے تو ان کے مقام اور حیثیت متعین کرنے میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ سید صفائی نے جس وقت "شیخ الاسلامی" کا منصب سنبھالا (۹۷۷ھ) اس وقت سندھ کے زیرین حصے پر عیسیٰ ترخان کے بیٹے مرزا باقی (۹۷۳-۹۹۳ھ) جیسے ظالم اور جنونی کی حکومت تھی، جن کے مظالم کے عذاب میں زیرین

سندھ کے مجبور لوگ اپنے شب و روز گزار رہے تھے، کیوں کہ سندھ کے دونوں حصوں پر ایسے ظالم حکومت کر رہے تھے جو جبر، تشدد، غضب اور قہر میں اپنی مثال آپ تھے۔ گویا کہ دونوں حاکم شاہ بیگ اور شاہ حسن ارغون کے مظالم کے تتمہ اور تکملہ تھے۔

سلطان محمود بکھری، سید صفائی کی زندگی میں (۹۸۲ھ) میں فوت ہوئے۔ اور جب سید صفائی نے انتقال کیا (۹۹۱ھ) اس وقت ہندوستانی مغل بادشاہ اکبر کے صوبیداروں کو بکھر کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے نو سال گزر چکے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ شهر تته را تاراج نموده، خاک مذلت بر فرق ساکنانش افشاندند.

۲۔ در تلتی مقام نموده خرمن حیات ساکنان آن موضع را به باد فنا برداد.

۳۔ مردم ماچیان که طغیان ورزیده، سر اطاعت و انقیاد کشیده بودند، همه را به قتل رسانیدند، و اموالش آنهارا غارت نموده، خان و مان و قلعهٔ آنهارا به خاک برابر ساختند.

۴۔ ظالم کی تلوار کسی بھی قوم یا قبیلے کی کتنی ہی نسل کشی کرے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس کی بیخ کنی کردے۔ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جہاں ۴۲ گاؤں کے چھوٹے بڑے لوگوں کو مارا گیا۔ وہاں صدیاں گذرنے کے بعد آج بھی جتوئی قبیلہ کی اکثریت موجود ہے اور ان کی سرداری کا مرکز بھی آج تک وہاں (شکارپور میں) قائم ہے۔

۵۔ قرار دادند که آتش این قوم (جتوئی بلوچ) را به آب شمشیر فرو باید نشانید... چون وقت موعود رسید، همه به یکبار دست به شمشیر کرده، کار آن گروه بی انجام را به انجام رسانیدند. چنانچه در آن واحد، چهل ودو موضع بلوچان مقموع و مقتول گردید.(۱)

۶۔ به سرعت تاخته زلزله دران گروه انداختند. القصه از صباح تا آخر پیشین، معرکه قتال آراسته بود و قریب بیست هزار آدمی در میدان افتادند. (۲)

۷۔ و قلعه الور را که سابقاً پایتخت بوده، ویران ساخته خشت پخته آن را به بکر آوردند... عمارات مردم ترک و

سمه - که در حوالی بکر بودند - اکثری را ویران ساخته به عمارت قلعه بکار بردند.(۱)

۸ـ وچون به قلعهٔ سیورای رسید به لوازم نهیب و تاراج اقدام نمودند، دستبرد نموده از مخالفان هر کسی را که می دیدند، به قتل میر سانیدند.(۲)

۹ـ متصل قلعه سیورائی نزول فرمود و حکم کرد که: قلعه را ویران سازند، آنچنان قلعه را در عرض یك هفته به خاك یکسان ساختند.(۳)

(۱) معصومی ص ۱۴۴ (۲) معصومی ص ۱۵۰
(۳) معصومی ص ۱۵۱.

۱۰ـ بهلول رای زاده و جمعي کثیر دستگیر شدند، میرزا (شاه حسن) اشارت به قتل آن جماعت کرد و همچنان از میدان قتال روی به ظاهر شهر آورده، دروازه قلعه را شکسته دست به استعمال ضرب و پیکار بردند ... ناگاه سرهاي سرداران برنیزه ها کرده به آن مردم (لنگاه) نمودند، به یك مرتبه منهزم شده خود را از برج و باره انداخته راه نجات جستند، اما حسب الحکم هر کس از مردم آچه بدست این جماعت می افتاد به قتل می رسانیدند، و مردم شهر را غارت می کردند.(۱)

۱۱ـ (قلعه دلاور)... چون محاربه به اشتداد...بسیاری از اهل قلعه مقتول و مجروح گشتند و معدودی که مانده بودند، همه را دستگیر کردند...(۲)

۱۲ـ لنگر خان باعساکر میرزا (شاه حسن) بتی کلوان (بهٹی کلهوڑا) را تاخته غل و مواشی وسایر اشیا را به اردوی میرزا آورد عساکر نصرت معاصر، محاصره و محاربه کردند.(۳)

(۱) معصومی ص ۱۵۳ (۲) معصومی ص ۱۵۶
(۳) معصومی ص ۱۵۷

۱۳ــ از سرداران داریجه باخود آورد، سلطان محمودخان ... بیست و هفت کس را ازمردم داریجه به سیاست رسانیدند.(۱)

۱۴ــ سلطان محمود خان معاملۂ داریجه به عرض شاه بیگ رسانید... سلطان محمود خان در ساعت به شهر رسید و شباشب آن مردم را گردن زده، از برجی که مشهور به "خونی برج" (۲) است، به زیر انداخت.(۲)

۱۵ــ میرزا (شاه حسن) ...فرمود...هر کس که خلاف حکم نماید، سر اورا بر نیزه کنند و به تخریب و انهدام و قلعه و عمارات اوچه حکم فرمود. چنانکه چوب عمارات به کشتی انداخته به بکر آوردند.(۴)

(۱) معصومی ص ۱۲۳ (۲) بکھر کے قلعے کے ایك برج کو "خونی برج" کہا جاتا تھا، کیوں کہ وہاں لوگوں کو دریا میں پھینك کر مارا جاتا تھا۔ (۳) معصومی ص ۱۲۳ (۴) ص ۲۵۳

۱۶ــ میر عبدالفتاح برادر سلطان محمود...جمعی کثیر از بلوچ و مردم دیگر را به قتل رسانیدند...(۱)

۱۷ــ سی کس بضرب شمشیر او (سلطان محمود) مقتول گشتند.(۲)

(۱) آن جماعه ...قریه کاهان و باغبان را آمده تاختند ... درین تاخت هزار شتر از چرخهای باغات، که شب کار میکردند، بردند (۳) (۳) معصومی ص ۱۱۰.

۱۸ــ در شهر ملتان قحط و غلا عظیم روی نمود، چنانچه کله گاؤ به ده تنکه و قیمت یك من غله به سنگ ملتان، به صد تنکه رسید. و اکثر مردم به پوست و چرم گاوی که شایسته خوردن نبودی، می گذرانیدند. و اگر احیاناً سگ و گر به دست می افتاد، گوشت آن را در رنگ حلوا و بره

مـی خوردند......آخر الامر مردم کشته شدن بخود قرار داده
از با روی قلعه، خود را به خندق می انداختند.(۱)
(۱) معصومی ۱۰۸

۱۹۔ چون ایام محاصره به یك سال طول کشید، واهل حصار را کـار بـه جـان، و کـارد بـه استـخـوان رسـیـد، دریازدهم شهر ربیع الثانی ۹۳۳ھ بهـادران ارغـون بـه زخم تیر جانگداز، قالب اکثری را تهـی سـاختـنـد، عاقبت جمعی به زور تیر و گرز وقـت سـحـر دروازهٔ لوهاری (لاهوری) را شکسته به شهر آمدند، و دست از آستین بیدادی بر آورده شروع به قتل و نهیب و تـاراج کـردنـد و سـکـنـهٔ شهر از هشـت، هفت سالـه تا هفتـاد بـه بـنـد رفتند، و آن چنـان حـادثه بـه ملتـان روی داد کـه یـاد از قیامت می داد... بعد از ده دوازده روز که شهر را غارت کردند. محب علی ترخان باجمعی به خانقاه رفته، مردمی را غـارت کرده و آتش دران بعقه انداخت و خون بسیاری دران مـزار ریـخـت و مـردمـی لنگاه سپاه ملتان اکثری در قتـل عـام کشتـه شـدند، و دران تاراج جواهر نفیس و نقود نامحدود بدست مغول و سپاه افتاد، بعد ازان نایرهٔ غضب میرزا شاه حسن تسکین گرفت.(۱)

۲۰۔ در اوایـل سـنـه خـمـس و اربعین و تسع مایة (۹۴۵ھ) از راه رادن پـور، عـازم تتـه شـد، و (شاه حسن) در حین مراجعت مردم جاریجه و سوده را قتل و نهب عجیب نمود.(۲)
(۱) معصومی ص ۱۵۹ (۲) معصومی ص ۱۶۴

۲۱۔ مـلا درویش محمد انبار دار را در برابر خانه سلطان محمود (بـکـری) بدار کشیدند و مقدمان هر یك هاله و عمر شاه را درمیان دروازه بکر، پوست کندند.(۳)

۲۲۔ مـادر مـجـاهـد خان صالحه بیگم دست تعدی دراز نموده، بیـمـاران را کـه، از قـلـعه بیرون می رفتند، شکم آنهارا پاره

کرده تجسس زرمی کرد، چون اهل قلعه مشاهده آن حال نمودند . مردن خود را درون قلعه بهتر می دانسته .(۲)
(۱) معصومی ص ۱۷۸ (۲) معصومی ص ۲۳۵

۲۳۔ حدت مزاج او، در نهایت استعلا بود، چون در غضب آمدی، ضبط خود به هیچ وجه نتوانستی. و درخون ریزی ملاحظه نداشت، و به اندك توهم و بد گمانی خان ومان مرد می برمی انداخت. (ص ۲۳٦)

۲۴۔ معصومی میں ہے: بعد فترت ترکمانید به بلاد سند تشریف آورده، در بلدۂ سکر سکونت نمود ند......
مشارالیه متقی و متشرع بوده. (ص ۱۴۴-۱۹۷)

۲۵۔ امام اعظم علامه ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد بن احمد عالمِ دین، ادیب، مفسر زنخش (خوارزم) کے رہنے والے تھے۔ (۴٦۷-۵۳۸) مدتوں خانۂ کعبه کے مجاور رہے اس لئے ''جاراللہ'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (دھخدا، ص ۳)

باب ۔٦

سید صفائی کے آثار

سید صفائی، سکھر (بکھر) میں وارد ہونے کے بعد ظاہر ہے عارضی طور پر کسی سندھی کے مکان میں مقیم ہوئے ہوں گے جو انھیں حکومت کی طرف سے ملا ہوگا۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اطمینان سے اپنی حویلی، اطاق اور دوسری ضرورت کی جگہیں تعمیر کرائی ہوں گی۔ حویلی اور اطاق کی اراضی بہت کشادہ اور آبرو مندانہ ہوگی۔ نوکر، غلام، خاتون خدمتگار اور کنیزیں اور دوسرے متعلقین سب کے سب، ان ہی مکانوں یا اراضی کے اندر رہتے ہوں گے۔ یا پھر حویلی کے آس پاس ان کے لیے علحدہ مکانات تعمیر ہوئے ہوں گے۔ باہر والی اطاق یا مردانہ حصہ وسیع اور کشادہ ہوگا جس میں جانے والے ٹھہرتے تھے۔ وہاں مجلسیں اور محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور وہ مردانہ حصہ اتنا کشادہ تھا کہ اس کے ایک حصے میں مدرسہ تھا جس میں کسی وقت مولانا عبدالخالق گیلانی نے کافی عرصہ درس و تدریس کا شغل جاری رکھا [۱]۔

تاریخ میں ان کی ایک حویلی اور ایک جامع مسجد کا ذکر ملتا ہے باوجود یہ کہ میر معصوم ذاتی طور پر یادگار عمارتیں تعمیر کروانے کے شوقین تھے لیکن انھوں نے اپنے والد کے آثار کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

> "خیر کے آثار میں سے ایک جامع مسجد اُن منبع احسان ہے جو انھوں نے حویلی کے پاس تعمیر کروائی"۔[۲]

اس عبارت سے ظاہر ہے جامع مسجد کے علاوہ انھوں نے اور کوئی یادگار تعمیر نہیں کروایا۔ مسجد کے تذکروں میں بھی ان کی

حویلی اور اسی جامع مسجد کا ذکر آیا ہے۔ جس کا ماخذ تاریخ معصومی ہے مثلاً "مآثر رحیمی" کے مصنف نے وہی عبارت لکھی ہے:

"مسجد جامع بکھر از بناهای خیر ایشا نست" [۳]

اگرچہ "از بنا ھائی خیر"، کے فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ اور خیر کی جگہیں بطور یاد گار چھوڑیں لیکن یہ فقرہ میر معصوم کے "از آثار خیر آن..." کی دوسری صورت ہے۔

"ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف نے البتہ مسجد کے گنبد کا عبارت میں اضافہ کیا ہے۔ مصنف خود بکھر کے تھے، کتاب اگرچہ تقریباً ایک صدی (۱۰۶۰ھ) بعد لکھی گئی ہے لیکن بعید نہیں کہ جوانی میں انھوں نے خود وہ مسجد دیکھی ہو۔ عبارت کچھ اس طرح ہے:

"دروازہ حویلی خود در قصبۂ سکر، مسجد ی جامع با گنبد عالی بنا نمود"۔ [۴]

اس عبارت سے نہ صرف گنبد عالی کا پتا چلتا ہے بلکہ جائے وقوع کا بھی علم ہوتا ہے گویا مسجد حویلی کے دروازے کے پاس تھی جیسا کہ قدیم دستور تھا۔ مسجد ہمیشہ حویلی کے پاس اکثر دروازے کے آگے ہوتی تھی۔ مسجد نہ صرف عبادت گاہ تھی بلکہ آپس میں میل جول کا مرکز بھی ہوتی تھی۔ دن میں اولیاء اور بزرگوں کی نشست و برخاست اور مجلس بالعموم اللہ کے گھر ہی میں ہوتی تھی۔

اس مسجد کے لیے کہا جاتا ہے کہ سید صفائی نے (۹۶۰ھ) میں تعمیر کروائی اس وقت شاہ حسن ارغون بقید حیات تھے اور محمود بھکری ان کی طرف سے سکھر میں نائب تھے۔ مسجد کو کئی صدیاں گزر گئیں۔ خاندان بڑھ گئے۔ پرانے سکھر میں علیحدہ علیحدہ جگہیں قائم ہو گئیں۔ حویلی بیٹھ گئی نقش و نگار بھی مٹ گئے جغرافیہ بھی بدل گیا اور بالآخر مسجد بھی ویران ہو کر بیٹھ گئی۔

انگریزوں کے دور میں تین سال تک تو یہ بالکل مٹی کا ڈھیر تھی جس کے بعد خاندان کے ایک فرد سید سکندر علی شاہ معصومی نے ۳۰ سال کی ویرانی کے بعد پرانی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کر کے ۱۴ شعبان ۱۳۰۹ھ کے دن مسجد کو مکمل کیا اور شاید اسی دن نمازیوں کو مدعو کیا۔ خاندان کے ایک دوسرے فرد سید صابر علی شاہ نے مسجد پر مندرجہ ذیل تاریخی کتبہ نصب کیا، جس سے تاریخ اور دوسرے احوال معلوم ہوتے ہیں:

صدرِ دین، سید صفائی الحسینی ترمذی
رہنما دینِ محمد، ہادی لات و عزیٰ
بلبلِ باغ کرامت بود، آن صاحب سخا
برسرِ غربا کشادہ کودو دستش از عطا
تاجِ سرِ معصوم شاہ تاج سرش بد مرتضیٰ
بر شریعت بود قائم، واصل در گہِ خدا
در خجستہ سال نۂ صد شصت، با امرِ خدا
کرد این مسجد بناء با چار گنبذ عرش سا[5]
آنچہ دادہ بود صانع، نقش را صنعت دران
روضۂ رضوان گویم یا سمای زر فشان
در حکومت قوم عیسیٰ، این چنین مسجد قدیم
منہدم کردند، او را ناظمان، اہل جحیم
بعد ازان، این مسجدی، سہ سال ویران بد تباہ
بعد سہ سال این بنا شد، مسجدِ رضوان گاہ
در بنایش زیب دادش سید سکندر علی
با رضای ذوالمنین، بن سید عباس علي
آن خجستہ یک ہزار وسہ صد و نہ سال بود
چار دہ شعبان زمہ، تاریخ فرخ فال بود[6]
گفت تاریخ بناء، اینِ مسجد صابر علی
ہست از اولاد سید میر معصومِ علی

مسجد غالباً پرانی ہوچکی تھی، لیکن انگریزوں کے ناظم نے معلوم نہیں کس وجہ سے منہدم کرائی اور تین سال تک باکل ویران رہی۔

مسجد سید قوت علی شاہ معصومی کے بنگلے کے مشرق میں آج بھی موجود ہے نہایت سادہ اور بغیر گنبذوں کے بالکل معمولی بنی ہوئی ہے۔ راقم الحروف نے ۱۰ جنوری ۱۹۶۲ء میں اسے باہر سے دیکھا۔ کیوں کہ دروازہ بند تھا اس لیے اندر سے نہیں دیکھ سکا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عمارت وہ نہیں جو سید سکندر علی شاہ نے تعمیر کروائی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ بنیاد وہی قدیمی ہو لیکن عمارت سید سکندر علی شاہ والی نہیں ہے کیوں کہ شعروں میں جو تعریف کی گئی ہے اس کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔

گمان غالب ہے کہ سید صفائی کی خاص حویلی سید قوت علی شاہ صاحب کے مکان والی جگہ پر تھی بہر حال یہ قدیمی آثار مٹ گئے ہیں۔ نہ اب وہ مکان رہے اور نہ وہ مکین ہی رہے۔

﴿حواشی﴾

۱۔ معصومی: ص ۲۱۷

۲۔ معصومی: ۲۳۸۔ از آثار خیر آن منبع احسان است مسجد جامع که درجوار منزل ایشان است۔

۳۔ مآثر رحیمی: ۲: ۳۳۶

۴۔ ذخیرہ: ۱: ۱۲۰-۱۲۱

۵۔ بیت ۴-۸-۹ "حیات معصوم" میں آئے ہیں۔ ص: ۱۳، ۱۴

۶۔ ۱۴ مارچ ۱۸۹۲ء

باب ۔۷

میر معصوم کی ولادت

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ میر معصوم اپنے والد کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ایک قطعے کی روایت کے مطابق ان کی ولادت ۷ رمضان المبارک، پیر کے دن ۹۴۴ھ (۷ فروری ۱۵۲۸ء) کو ہوئی۔

درمہ رمضان بہ شب، دیدیم در هفت آسمان
جمع هایی از ملایك، هم صفِ کرو بیان
بود در صفهای آن، این غلغله، ای دوستان!
البشر! سید صفائی را، ز درگاہِ منان
میشود پیدا بہ خانہ ات ولد صاحبِ ذوالکرام
نام او "نامی" بود، چون شمس روشن درجهان
دایمًا باشد ثنا خوانِ خدا و الرسول
دایمًا باشد خدا راضی، برو صاحب قران
شد طلوع آن شمس، درخانه صفائی از خدا
از بروج نیك، درساعت سعید، آن شد عیان
بود آن تاریخ هفتم لیل دو شنبه از صیام
سال نه صد چهل بود، از وی زوائد چار دان

اسی قطعے کے آخری دو شعر خاندانی شجروں کے حوالے سے سب سے پہلے پیر علی محمد شاہ راشدی کی کتاب "حیات معصومی" میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ نے (وہ اشعار) اپنے مقدمہ (تاریخ معصومی) میں درج کیے۔[۱]

یہ قطعہ ظاہر ہے کہ میر معصوم کی زندگی کے کافی عرصے

بعد کہا گیا ہے ایك تو اس میں نامی تخلص، دو معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور دوسرا شعر اتنا ضعیف اور فنی لحاظ سے ناقص ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں صدی کی ابتداء میں خاندان کے کسی فرد نے طبع آزمائی کی ہے۔

میر معصوم رجب ۱۰۱۲ھ (دسمبر ۱۶۰۳ء) میں ایران پہنچے، کاشان ۲؎ میں ان کی ملاقات وہاں کے مشہور شاعر اور تذکرہ نویس تقی الدین کاشی سے ہوئی۔ جنھوں نے اپنے تذکرے "خلاصة الاشعار" میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اس وقت میر صاحب کی عمر ساٹھ سال تھی"۔۳؎ اس حساب سے میر معصوم کی ولادت کا سال ۹۵۲ھ نکلتا ہے۔

ہمارے یہاں میر معصوم کی ولادت کے متعلق یه دو روایات موجود ہیں۔ جن دونوں کے درمیان ۸ سال کا فرق بنتا ہے۔ بہر حال میر دسویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے۔ جب سندھ یا ہند، دونوں ممالك اپنی اپنی جگه پر سخت تکلیف اور مصیبت میں تھے۔ سندھ پر شاہ حسن ارغون،۴؎ کے استبداد کا شباب اور اس کی اقبال مندی کا عروج تھا اور پورا ملك بڑی مصیبت اور عذاب میں مبتلا تھا ہندوستان میں بابر بادشاہ کی قائم کی ہوئی مغل سلطنت پر ان کا بیٹا ہمایوں متمکن تو تھا لیکن چہار جانب سے جنگیں، شورشیں اور بغاوتیں تھیں، جس کی وجه سے باہر کی حکومت متزلزل تھی۔ شیر شاہ سوری مغلوں کی اس نو آبادی پر جو آگے چل کر مغل شہنشائیت میں تبدیل ہونے والی تھی، پر اپنا حق سمجھ رہے تھے، اور اس پر قبضه کرنے کے لیے سر گرم عمل تھے۔

شاہ حسن ہندوستان میں پیدا شدہ اس صورتحال کا بڑی گہرائی سے مطالعه کررہا تھا۔ ۵؎ کیوں که پڑوسی ملك کے سیاسی نشیب و فراز کا اثر سندھ پر پڑنا لازمی امر تھا۔ جس کا سامنا کرنے کے لیے وہ کسی قیمت پر تیار نه تھے۔

میر معصوم کی ولادت (۹۴۴ھ) سے دو ڈھائی سال بعد بالآخر

۱۰ محرم ۹۸۷ء (۱۷ مئی ۱۵۴۰ء) کو شیر شاہ سوری نے قنوج کے میدان جنگ میں ہمایوں کو ایسی شکست دی کہ اسے دوسرے مقابلے کی تاب نہ رہی۔ بچے ہوئے سپاہیوں کے ساتھ متعلقین کو لے کر سیدھا لاہور، ملتان اور اوچ کو روند تا ہوا سندھ کے پہلے بڑے شہر روہڑی اور ببرلو کے چار باغ (۲۸ رمضان ۹۴۷ھ) پہنچا۔

شاہ حسن نے اپنے والد کے زمانے میں باپ سے ناراض ہو کر بابر بادشاہ کے یہاں کچھ دن گزارے تھے۔ شاہ بیگ بابر کے ارادے دیکھ کر اپنی بنی بنائی حکومت سے دستبردار ہو کر سندھ پہنچے۔ مغلوں کے ارادے اور مزاج سے ارغون واقف تھے۔ یہاں سندھ میں ابھی اس کے قدم نہ جمے تھے۔ آزادی کی تحریک اور ملک کو غیروں کے چنگل، تسلط اور قبضے سے آزاد کرانے والی جستجو ملک کے کونے کونے میں موجود تھی۔ مقامی لوگوں کا عدم تعاون اپنی جگہ پر خوفناک صورت اختیار کرچکا تھا۔ شاہ حسن ان نازک اور تشویشناک حالات کے سبب پہلے ہی غیر مطمٔن تھے اور اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے خون خرابہ، ڈرانے ، دھمکانے ، خوف و ہراس پھیلا کر زبردستی اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اندرون خانہ صورت حال کی موجود گی میں ہمایو ں کا سندھ میں وارد ہونا ، در حقیقت ان کے لیے بڑے خطرے اور تشویش کا باعث تھا۔ لیکن قسمت اور قدرت شاہ حسن کے ساتھ تھی۔ اسی لیے خود ہمایوں، اندرونی اختلافات کا شکار ہو گئے یہی وجہ ہے کہ سندھ میں ان کے پاؤں نہ جم سکے۔ اور خوش قسمتی سے شاہ حسن کی حکومت کے دن بڑھ گئے۔

ہمایوں در حقیقت اس لیے سندھ آیا تھا کہ یہاں رہ کر اپنے حالات سدھارے اور شاہ حسن جیسے حاکم کے یہاں سے جو ان کے والد کا نمک خوا رہ چکا تھا، اخلاقی اور فوجی امداد لے کر خوب تیاری کر کے نئے سرے سے شیر شاہ پر حملہ کرتے لیکن بد قسمتی سے حالات سنبھلنے، بہتر ہونے کی بجائے ان کے لیے مزید تکلیف کا

باعث بنے۔ ان پر ناگفتہ بہ مصیبتیں نازل ہوئیں، لشکر تباہ حال اور دل برداشتہ تھا، امیر اور خاص سپاہی انھیں چھوڑ چکے تھے۔ خزانہ جس پر لشکر کا دارو مدار ہوتا ہے وہ ختم ہوچکا تھا۔ تنگدستی اور افلاس کی یہ حالت تھی کہ تردی بیگ جیسے خسیس طبیعت اور معمولی ملازم کے یہاں سے انھیں قدم قدم پر ادھار لے کر روز کے اخراجات پورے کرنے پڑے۔

سندھ میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی جنگی قانون کے مطابق شاہ حسن نے کھڑی فصلیں تباہ کروادی تھیں تاکہ ان کے گھوڑوں کے لیے چارہ اور لشکر کے لیے اناج مہیا نہ ہوسکے۔ مقامی طاقتیں اگرچہ ارغون کو ختم کرنے کے لیے ہمایوں کی اناج اور چارے سے مدد کررہیں تھیں۔ جن میں راقم الحروف کے بزرگ یعنی سیوہن کے لکیاری سادات[۶]۔ بھی پیش پیش تھے۔ لیکن خانگی امداد ایک تباہ حال لشکر اور شکستہ خاطر، بے ترتیب انبوہ کے لیے کس قدر سہارا بن سکتی تھی۔اور شاہ حسن اور اس کے پیرو کاروں نے سندھ کے لوگوں میں کون سی قوت باقی چھوڑی تھی کہ وہ زیادہ وقت تک اور حسب ضرورت بوجھ اٹھا سکتے۔

لکیاری سادات اور سیوہن کے حریت پسند اور سندھ کے دوسرے قبائل کی تمنا تھی کہ ہمایوں کو مضبوط کرکے ارغونوں کے تسلط کو ختم کیا جائے۔ ہمایوں، جس کی کامیابی کی صورت میں مرکز آگرہ تھا بہر حال سندھ کے لیے اس غیر اور دشمن کے مقابلے میں مقابلتاً کم نقصان دہ تھا۔ جس کا مرکز سندھ میں تھا اور جس کے سارے لواحقین رات، دن سندھ اور اہل سندھ کے سینے پر سوار تھے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ دشمن جو ہزاروں میل دور رہ کر حکومت کرے اس کے مقابلے میں وہ دشمن زیادہ خطرناک ہے جس سے ہمہ وقت واسطہ رہے اور ان کے مظالم کے سبب ان سے دلی نفرت ہو اور ہر تنفس ان کے ہاتھوں نفسا نفسی کے عالم میں ہو۔[۷]

میر معصوم نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ حکمتوں

اور مصلحتوں کی خواہش کے مطابق ہر نامرادی کے پیچھے کتنی ہی مرادیں پوشیدہ ہیں۔ جب (بادشاہ کے) ارادے کے مطابق سندھ میں اس کی مراد پوری نہ ہوسکی، تجربے کی کسوٹی پر (اپنے) لوگوں کی نالائقی ظاہر ہو گئی اور لشکر کی بے وفائی، بھائیوں کی بزدلی اور منافقت، دوغلاپن سامنے آیا اور بادشاہ کو زمانے کی ناموافقت کا تلخ مشاہدہ ہوا تو دل برداشتہ ہو کر اس دنیا داری سے قطع تعلق کرلیا۔ اور حجاز مقدس جا کر گوشہ نشین ہونے کا ارادہ کیا۔ ۸

اسی صورتحال نے شاہ حسن کی قسمت کو چمکادیا اور وہ خود بھی مختلف ذرائع سے بادشاہ کو اس ارادے پر جلد سے جلد عمل کرانے کی کوششیں کرنے لگا۔ چنان چہ ۷ ربیع الاول ۹۵۰ھ کو جون (ایک شہر) کی منزل پر دریا پار کرکے، بادشاہ قندھار کی طرف روانہ ہوا۔ ۹

الغرض میر معصوم کی ولادت کے وقت یہ حالات اور واقعات سندھ میں رونما ہوئے۔ اگر خاندانی روایت والی تاریخ (۹۴۴ھ) مد نظر رکھی جائے تو میر معصوم تین سال کے تھے جب ہمایوں ۹۴۷ھ میں سندھ میں داخل ہوئے۔ جس وقت ہمایوں نے سندھ کے شہر پاٹ میں حمیدہ بیگم سے شادی (جمادی الاول ۹۴۸ھ) کی اور اس وقت ان کی عمر چار سال تھی اور جب ایک سال بعد عمر کوٹ کے قلعے میں بادشاہ کے اہل و عیال راجپوت رانی کی پناہ میں تھے اکبر اعظم پیدا ہوئے ۱۰۔ جنھوں نے مغلوں کی معمولی حکومت کو اپنے دور میں "مغل ایمپائر" (سلطنتِ مغلیہ) کے درجے تک پہنچایا اور تاریخ میں اپنے لیے اکبر اعظم کا سکہ ثبت کروادیا۔

حوالہ جات

۱۔ حیات، ص ۱۵، مقدمہ ط، باقی اشعار پیر علی محمد راشدی کی نوٹ بک سے لیے گئے۔

۲۔ راقم الحروف دو مرتبہ میر معصوم کے کتبے ڈھونڈنے کے لیے کاشان گیا لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

۳۔ ......این ھنگام...... سن شریفش بعقد ستین رسید......" نسخہ مانچسٹر ورق ۴۸۲ الف مجلہ پارس، ص ۳۔

۴۔ تاریخوں میں شاہ حسین ارغون لکھا گیا ہے۔ لیکن ان کا نام شاہ حسن تھا۔ جیسا کہ میر علی رضا آگاہ کے شعر (مقالات، ص: ۱۵)، جامع فرخ کے کتبے، مثنوی مظہر الآثار، روضۃ السلاطین کے قصیدے اور صنایع الحسن کے دیباچے اور قصیدوں سے معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ انھوں نے اپنے ایک امیر، میر علیک کو (۹۴۶ھ) صحیح حالت دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ہندوستان بھیجا جو بظاہر گجرات اور بنگال کی فتح کی تہنیت کا پیغام لے گیا اور واپسی پر انھوں نے حالت کی جو رپورٹ پیش کی وہ میر معصوم کی تحریر کے مطابق اس طرح ہے:

"چون میر علیک بہ سلا زمان بندگان درگاہ پادشاہ عالی مکان مشرف شد، از بی پروایی وعظم شان پادشاہ چنان تفرس نمود کہ عنقریب بعضی از سپاہ بیگانہ نقش تمرد برلوح خواھند نگاشت . میر علیک بی رخصت پادشاہ از اردوئی اعلی بر آمدہ، بہ سرعت خود را بہ میرزا شاہ حسن رسانید، او گفت: من پادشاہ را در نہایت استعلا دیدم و ارکان دولت و

اعیان مملکت را در نهایت غفلت. از حساب
ترکانه خود یافتم که عنقریب باغی بر ایشان استیلا
یافته خلل در قواعد سلطنت ایشان، راه خواهد
یافت. ومن آمدم که شمارا خبردار گرد انم۔"
(ص ۶۵-۱۶۶)

میر علیگ نے جب بادشاہ عالی جاہ کا شرف حاصل کیا تب ان کی لاپروائی اور غرور سے اندازہ لگایا کہ جلد ہی کوئی بیرونی لشکر لے آئے گا اور بغاوت کا ارادہ کرے گا۔ اس لیے میر علیگ بادشاہ کی اجازت کے بغیر کیمپ سے نکل کر تیزی سے شاہ حسن کے ہاں پہنچے...... میر علیگ نے کہا کہ میں نے بادشاہ کو نہایت غرور میں اور وزیروں کو غافل دیکھا ہے اس لیے میرا اندازہ ہے کہ ان پر فوراً کوئی باغی غلبہ پا کر ان کی بادشاہت کی بنیاد ہلا دے گا۔ اس لیے میں آپ کو خبر دار کرنے آیا ہوں...... الخ
(کچھ ردّ و بدل کے ساتھ سندھی ترجمہ سے لیا گیا ہے، ص: ۲۰۶-۲۰۷)

۶۔ مظہر شاہ جہانی۔

۷۔ ظفر الوالہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ارغونوں نے دھوکہ دے کر سندھ پر قبضہ کیا...... دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ سندھی جب کسی بیرونی دشمن کو اپنے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں تو دوسری کسی قوت کو سامنے لا کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔

۸۔ ترجمہ، ص ۲۱۶-۲۱۷ " چون بہ مقتضای غوامض حکمت الاهی ودقائق مصلحت ازلی - کہ در ضمن ہر نامرادی چندین اسباب مراد سر انجام می یابد- حسب الا رادۂ پادشاہ، در دیار سند نقش مراد نشست و عیار جوہر نامردسي مردم ظاہر شد، و بی اخلاصي لشکر و بر مرامي براد ران ، وبی

خـردی و نـا مسـاعـدیِ روزگـار در مشـاهدهٔ پادشـاه افتـاد. خـواسـت که در لباس تجرید قدم شوق در بادیهٔ راهروان طریق حـق زنـد و حـلقهٔ کعبهٔ مراد گرفته در ارض مقدس حجاز ساکن گردد.'' (ص : ۷۵)

۹۔ بـادشـاه کے روانه ہونے اور شاه حسن کے دیے ہوئے اونٹوں کا دلـچسپ احـوال گـل بـدن بیـگـم کے ہمایوںنامے سے پڑھنا چاہیے۔ نـہایـت دلچسپ مزیدار اور مضحکه خیز ہے جس سے شـاه حسـن کی ذہانت، فطانت ، عیاری اور چالاکی کا پورا پورا اندازه ہوسکے گا۔ شاه حسن کے لیے یه زمانه واقعی مشکل اور تکلیف ده تھا جس کا انھوں نے پوری چالاکی اور عـقـلـمـنـدی سے مقابله کیا۔ اگر ہمایوں کامیاب ہورہے تھے تـب بھـی سـنـده اس کـے ہـاتھـوں سے نکل رہا تھا۔ اور اگر مقابلے میں شیر شاه جیت جاتے اس حالت میں بھی، شیر شاه اس کی بیخ کنی کردیتے۔ شیر شاه، ہمایوں کے پیچھے لاہور تك پہنـچ چکـے تھـے، سـنـده تك پہـنـچـنـا اس کے لیے کیا مشـکـل تھـا۔ شـاه حسـن نے نہایت شاطرانه چالیں چل کر ہمایوں کو ناکام کرکے سنده سے چلتا کردیا۔

۱۰۔ پیدائـش کـی تـاریـخ میں اختلاف ہے۔ اکبر نامه(ص ۱:۴۷) میں شـب یـکشـنبه ۵رجـب ۹۴۹ھ (۱۱اکتوبر ۱۵۴۲ء)۔ ہـمـایـوںنامه میں ۴رجب ۹۴۹ھ روز یکشنبه وقت سحر(ص ۵۹) اسـمـتـھ میں ۱۴ شـعبـان ۹۴۹ھ (جـمـعـرات، ۲۳ نومبر ۱۵۴۲)۔ بـرگـس میں ۵ رجب ۹۴۹ھ (۱۵ اکتوبر ۱۵۴۳ء) ہے۔

باب ۔۸

میر معصوم: نام، لقب، تعلیم اور تربیت

میر مرحوم کا نام محمد رکھا گیا، سیادت کے سبب شاید ہندوستانی دستور کے مطابق ان کے نام کے ساتھ، میر کے لفظ کا الحاق ہوا۔ لیکن پیر علی محمد شاہ نے جو عبارت دی ہے وہ حسب معمول ناقص ہے۔ جیسا کہ لکھا ہے: "نظام الدین نواب امیر محمد معصوم [۱]" حال آں کہ نواب امیر دونوں سرکاری خطاب ہیں۔ اگر وہ خطاب انھیں ملتے تو کہیں نہ کہیں ان کا ذکر ضرور ہوتا۔ اس کے علاوہ عبارت کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے ھی: "نواب امیر نظام الدین محمد معصوم"، نواب امیر نظام الدین کسی بھی تاریخ میں مرقوم نہیں۔ تذکرہ نویسوں نے انھیں میر محمد معصوم لکھا ہے [۲]۔ تقی الدین کاشی نے میر کو امین الملک، امیر محمد معصوم، نواب وغیرہ لکھا ہے۔ لیکن سفیر کی حیثیت سے ایران آنے پر ایک تذکرہ نویس نے ذاتی اخلاق اور تعلق کے سبب یہ عبارت استعمال کی ہے۔ "امین الملک" [۳] کا خطاب یا عہدہ غالباً انھیں اکبری دور میں ملا، کیوں کہ سفارت کے وقت اکبر کی طرف سے جو شاہی رقیمہ میر صاحب، شاہ عباس کی طرف لے گئے، اس میں یہ لقب استعمال کیا گیاہے یہ عبارت کچھ اس طرح ہے:

"امین الملک میر محمد معصوم بکری کہ از اجلۂ سادات این بلا د است۔"

گویا نہ امیر، نہ نواب، نہ نظام الدین کے القاب یا خطاب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ "امین الملک" غالباً ان کا عہدہ تھا جو

شاید انھیں ۱۰۱۲-۱۰۱۳ھ میں ملا اور عبارت میں شامل کیا گیا ہے۔ میر معصوم نے خود بھی اپنے اتنے سارے کتبوں میں یہ الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ اگریہ شاہی خطابات انھیں ملے ہوتے تو لازماً وہ اپنے نام کے ساتھ لکھتے۔ شاہ عباس نے جو جوابی خط بھیجا ہے اس میں انھیں "معتمد الخاقانی میر محمد معصوم خان" [۴] لکھا گیا ہے۔ آپ کے فرزند میر بزرگ نے سب سے پہلے اپنے کتبوں میں باپ کے لیے [۵] نواب اور امیر کا لقب استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد بطور عقیدت ان کی اولاد انھیں اس طریقے سے لکھتی اور پکارتی آئی ہے۔

نظام الدین کا لقب سرا سر اشتباہ ہے۔ "طبقات اکبری" کے مصنف کا نام خواجہ نظام الدین احمد تھا۔ جو گجرات میں میر معصوم کے ولی نعمت تھے اور مرتے دم تک (۱۰۰۲ھ) میر صاحب کا ان سے تعلق خاطر رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے لوگوں نے ایسی کوئی عبارت پڑھی ہے جس میں "نظام الدین" بھی آیا ہے۔ فارسی پر عبور نہ ہونے کے سبب دو علیحدہ شخصیتوں کو ایک سمجھ کر ان کا لقب نظام الدین سمجھا گیا ہے؟ اگر کوئی حقیقت ہوتی تو میر بزرگ اس خطاب کو اپنی عبارت میں کیسے چھوڑتے؟میر معصوم ایک پُر گو اور صاحب دیوان شاعر تھے، "نامی" آپ کا تخلص تھا۔

تعلیم و تربیت:

آپ کی تعلیم و تربیت کیسے اور کس طرح ہوئی اور کس نے کی، اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں، اور واقعی تعجب ہوتا ہے کہ میر صاحب جیسے تاریخی ذہن اور ذوق رکھنے والے بزرگ، جنھوں نے سفر کے دوران بھی اپنے نقش قدم کے لیے کتبے لگانا ضروری سمجھا انھوں نے اپنے خاندان اور اپنے متعلق احوال لکھنے میں کیوں غفلت برتی؟ خاندانی وجاہت اور ذاتی اہمیت سے وہ غافل نہیں تھے۔ ان کو اپنے گھرانے کی عظمت اور عزت اور اپنی شخصی اہمیت اور اقتدار کا پورا پورا احساس تھا۔

ایسی صورت میں تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر کیوں نہیں لکھا، ہوسکتا ہے کہ ان کا ارادہ علیحدہ کتاب لکھنے کا ہو، لیکن زمانے کی مصروفیات نے انھیں وفات تک اس آرزو کی تکمیل کا موقع نہ دیا ہو۔ یا کوئی تحریر انھوں نے چھوڑی ہو اور وہ ضائع ہو گئی ہو۔ بہر صورت اسی قسم کی کتاب یا رسالے کا کہیں بھی کوئی اشارہ ہمیں نہیں مل سکا۔

میر صاحب مرحوم کی سوانح لکھنے والے کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے سینکڑوں صفحات کی ورق گردانی کرنے ، ٹکڑے ٹکڑے تلاش کرنے اور انھیں یکجا کرنے کے بعد کہیں جا کر بمشکل ایک خاکہ تیار ہوپاتا ہے۔ اس دماغ سوزی کے بعد بھی لکھنے والوں کی تسکین نہیں ہوتی اور موضوع نامکمل محسوس ہوتا ہے۔ تعلیم کے متعلق بھی یکجا اور واضح معلومات نہیں ہے صرف بدایونی سے معلوم ہوتا ہے کہ میر معصوم نے تعلیم حاصل کرنے میں بے انتہا تگ و دو کی ہے۔ [۶] اتفاقی حوالوں سے ان کے چند اساتذہ کے نام ملتے ہیں: مثلاً

ملّا محمد ساکن کنگری

"ذخیرہ الخوانین" کے مصنف نے لکھا ہے کہ اپنے والد کی وفات (۹۹۱ھ) کے بعد صرف و نحو، نظم اور نثر کی تعلیم ملا محمد کنگری والے سے حاصل کی۔ [۷] مآثرالامراء کا ماخذ ذخیرۃ الخوانین ہے۔ انھوں نے بھی وہی عبارت لفظوں کے ردو بدل کے ساتھ لکھی ہے۔ مثلاً : تحصیل علوم، اشتغال بہ کمالات حسیہ آشنا گشت. صاحب مآثر الامراء کا یہ اپنا اضافہ اور عبارت آرائی ہے۔ [۸]

کنگری راقم الحروف کا آبائی گاؤں ہے۔ یہ پیر گوٹھ کا قدیم نام ہے۔ در اصل شہر کے دو حصے ہیں۔ پرانے حصے کو کنگری کہا جاتا ہے۔ جب حضرت روضہ دھنی ؒ کی نعش مبارک دریا کے کٹاؤ کے سبب "پرانے گاؤں" سے نکال کر وہاں دفن کی گئی تب سے اس نئے

حصے کا نام "پیر گوٹھ" ہوا۔ اور کنگری رفتہ رفتہ ذہن سے محو ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بڑی درسگاہ تھی جہاں ملا محمد صدر مدرس تھے اور متعدد قابل ذکر بزرگوں سے تحصیل علم کرنے کے بعد عملی زندگی میں داخل ہوئے۔مثلاً: آخوند محمد اسحاق بکھری، آپ میر محمد معصوم کے ہم درس تھے۔ ۹۔ جنھوں نے بعد میں گجرات میں جا کر بڑی شہرت حاصل کی اور ایک غلط روایت کے مطابق میر معصوم اسی دوست کے سہارے گجرات پہنچ کر بخشی نظام الدین سے منسلک ہوئے۔ آخوند صاحب اپنے دور کے عظیم استاد تھے۔ ظاہر ہے کہ جس بزرگ کے درس سے اس قسم کے تاریخی لوگ پیدا ہوئے، اس کا اپنا وجود تو بہر صورت عظیم الشان ہو گا۔

قاضی دتہ سیوہانی

میر معصوم نے ضمناً اپنے دو استادوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ایک سندھ کے مشہور استاد قاضی دتہ سیوہانی تھے۔وہ رقم طراز ہیں: "ان اوراق کے راقم نے بھی ان کے حلقۂ درس سے علوم کا اقتباس کیا ہے۔ ۱۰۔ ممکن ہے میر معصوم نے اپنے ننھیال میں رہ کر سیوہن کے اس بزرگ سے علم حاصل کیا ہو۔ قاضی دتہ خود بڑے پائے کے عالم مدرس اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ قاضی صدر الدین پانچ واسطوں سے آپ کے دادا تھے۔ اپنے والد قاضی شرف الدین عرف مخدوم راہو کے یہاں "مطول" تک درس حاصل کیا۔ تفسیر، حدیث مخدوم بلال کے حضور میں اور دوسرے علوم مخدوم عبدالعزیز ابہری اور مخدوم فخر پوتہ کے درس سے حاصل کیے۔مخدوم نے اٹھارہ تفسیریں پڑھی تھیں۔ کچھ ناظرہ اور کچھ قرأت کے ذریعے اور وہ سب انھیں از بر تھیں۔ ترکی خط پڑھنا جانتے تھے۔ گویا اس زبان سے واقف تھے۔ ارغون ترخان اور سلطان محمود بکھری کا گھرانہ ترکی گو ۱۱۔ تھا۔ باہر فارسی اور گھر میں ترکی زبان بولی جاتی تھی۔ مخدوم غالباً اسی لیے ترکی زبان سے واقف تھے۔ علم جفر اور اس قسم کے دوسرے طلسماتی علوم پر انھیں خاصی دسترس

حاصل تھی۔ حافظہ اس قدر قوی تھا کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا وہ سب انھیں از بر تھا۔ اور صاحب کشف و کرامات بھی تھے۔

آپ کے والد قاضی شرف الدین صاحب حال تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وفات کے بعد مخدوم دتہ آپ ہی کے اشارے پر حضرت مخدوم بلال کے درس میں شامل ہوئے میر معصوم کا کہنا ہے کہ شاہ حسن ارغون نے بھی قاضی دتہ سے تعلیم حاصل کی انھوں نے خود کئی اسباق ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے (انھوں نے خود) قاضی صاحب کے کتب خانے میں دیکھے ۔ شاہ حسن ان کے یہاں حاضر ہوتے تھے۔ اور ان سے درس حاصل کرتے رہے۔ شاہ حسن انھیں امام جار اللہ ۱۲۔ کے مد مقابل سمجھتے تھے۔

شیخ حمید در بیلائی

در بیلا ، اس دور میں سندھ کا عظیم تعلیمی اور روحانی مرکز تھا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ متعدد عالم، مدرس اور اہل دل بزرگ وہیں رہتے تھے۔ سندھ میں قومی لحاظ سے در بیلا کو خاص شرف اس لیے بھی ملا کہ جب غیر لوگ سندھ میں داخل ہوئے اور انھوں نے ظلم کرنا اور خلق خدا کو تنگ کرنا شروع کیا تو وہاں کے علماء ترک وطن کر کے ، پہلے گجرات اور پھر مکّہ اور مدینہ چلے گئے۔ ۱۳۔ جس طرح اس زمانے میں پاٹ اور سیوہن کے کئی روحانی اور علمی خاندان بطور احتجاج ہجرت کر گئے۔

شیخ حمید در بیلائی بھی ان علماء میں سے ایک تھے، جنھوں نے در بیلا سے ترک وطن کیا۔ گجرات کو ترجیح دینے کا سبب یہ تھا کہ سندھ کے سمّا حکرانوں کی گجرات کے سلاطین سے رشتہ داری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ اور گجرات کے گہرے تعلقات تھے اور انفرادی طور پر بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ اہلِ سندھ کو گجرات جانا آسان لگتا تھا۔ جہاں سے حجاز مقدس کی طرف جانا آسان تھا۔

میر معصوم نے اپنے اسی استاد کے لیے لکھا ہے کہ اسی علاقے (گجرات) کی فتح (۹۹۱ھ) کے بعد ان کی خدمت کا شرف حاصل

کر کے "مشکواۃ" از اول تاآخر پڑھی اور حدیث کی دوسری کتابوں کا درس حاصل کر کے سند حاصل کی۔[۱۴] حضرت شیخ حمید کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جملہ فضائل سے بھر پور اور کمال سے مزین ہیں۔ عقلی اور نقلی علوم میں بڑی مہارت حاصل ہے، تفسیر اور حدیث میں خاص طور پر حدیث میں تو انھیں قدرت کاملہ حاصل ہے۔[۱۵]

شیخ حمید ۱۰۰۲ھ میں خانِ اعظم، عزیز کوکہ[۱۶] کے ساتھ گجرات چھوڑ کر اپنے بزرگوں کی طرح حج پر روانہ ہوئے۔ جہاں سے پھر کبھی نہ گجرات آئے اور نہ سندھ لوٹے۔ جب تک زندہ رہے۔ کعبۃ اللہ کے سائے میں حدیث شریف کا درس دیتے رہے۔ میر معصوم نے لکھا ہے: حدیث میں[۱۷] مکّہ کے موجودہ علماء کے مخدوم صاحب ہی پیشوا اور سر براہ ہیں۔[۱۸]

ملا محمد کنگری کے سلسلے کی روایت "ذخیرۃ الخوانین" میں ہے اور اس کی پیروی مآثر الامراء نے کی ہے۔ "صرف اور نحو" کے الفاظ نے اس روایت کو اس لیے کمزور اور مشکوک بنا دیا ہے کہ والد کی وفات (۹۹۱ھ) تک میر "صرف و نحو" تک بھی نہ پہنچے تھے جب کہ ان کی عمر ۴۷ برس تھی اس کے علاوہ جب ان کے والد نے وفات پائی تو اس وقت میر (۹۹۱ھ) گجرات میں تھے۔ اس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے مزید تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔ ذخیرۃ الخوانین، میر کی وفات کے ۴۷ برس بعد لکھی گئی۔ مصنف خود بکھر کے باشندے تھے اور میر کے ہم درس آخوند اسحاق جو ان کے قریبی عزیز تھے۔ اس وقت بکھر میں ایسے لوگ موجود رہے ہوں گے جنھوں نے میر معصوم کو آخری عمر میں دیکھا ہوگا اور ان کی اولاد سے تو ان کا خاص واسطہ پڑا ہوگا۔ شیخ فرید کی روایات سراسر غلط نہیں ہوسکتیں لیکن عبارت میں تصرف نظر آتا ہے۔ یہ جانا جاسکتا ہے کہ میر نے صرف اور نحو یعنی ابتدائی تعلیم ملا محمد کنگری والے کے یہاں سے حاصل کی ہو گی۔

سلطان محمود بکھری نے ۹۸۲ھ میں وفات پائی۔ اس سے کئی سال پہلے وہ تعلیم ختم کر کے سلطان کی ملازمت میں آئے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت ضرور بیس بائیس برس کے ہوں گے اس لحاظ سے انھوں نے ۹۶۵ھ میں ملازمت اختیار کی۔ [۱۹] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملا محمد کنگری کو ان کا پہلا استاد سمجھا جائے۔

مخدوم عثمان در بیلائی

برادر بزرگوارم پیر علی محمد شاہ راشدی نے معصومی کی خاندانی روایت کی بنیاد پر مخدوم عثمان در بیلائی کو بھی میر معصوم کے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ [۲۰] لیکن میر کی اپنی عبارت میں اس طرف اشارہ نہیں ملتا۔ مخدوم صاحب کے متعلق لکھتے ہیں: جملہ قسم کے منقول معقول اور متداول علوم میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ متبحر عالم تھے۔ ہمیشہ درس میں وقت گزارتے تھے۔ اور یہی ان کا شغف تھا۔ اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کے حامل تھے۔ انتہائی تقویٰ، پرہیز گاری اور شریعت پر کار بند رہے ایسے صاحب کمال ہونے اور باوجود پیری کے وہ تواضع اور کسرِ نفسی میں مثل، عالی مقام اور صاحب ظاہری کرامات تھے۔

دنیا سے بے نیازی کی جو خصوصیت اللّٰہ تعالیٰ نے آپ کو دی تھی وہ کسی اور بزرگ کو حاصل نہ تھی۔ سچ مچ وہ "ترک مافی ایدی الناس" کی عملی تفسیر تھے۔ کسی سے بھی تھوڑا یا زیادہ عطیہ یا نذرانہ کبھی قبول نہیں کیا ان کے ہاں ہمیشہ طلباء اور علماء کا آنا جانا رہتا تھا۔ ان کو کھلانے پلانے میں کبھی کوئی کوتاہی یا کمی دیکھنے میں نہ آئی۔ [۲۱]

مخدوم مرحوم نے ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی۔ جس وقت ارغونوں کے وارث ترخان کی حکومت ختم ہوئی اس سال میر معصوم بکھر میں مقیم تھے۔ مذکورہ بالا عبارت اور تعریفی جملوں میں کہیں بھی اپنی شاگردی کا اشارہ نہیں کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی شہر میں رہنے کے سبب مخدوم حمید دربیلائی اور قاضی عثمان کے درمیان نام کا اشتباہ ہو گیا ہے۔ مخدوم حمید کے بجائے خاندان میں قاضی عثمان، میر معصوم کے استاد مشہور ہو گئے۔

اس میں شک نہیں کہ میر معصوم کے مخدوم عثمان سے ذاتی تعلقات ضرور تھے اور ان کی بزرگی اور ولایت کے میر صاحب قائل اور معتقد تھے۔ صاحبِ ذخیرہ کی روایت کے مطابق خان خاناں مرزا عبدالرحیم خان اور جانی بیگ ترخان کے درمیان لڑائی کے سلسلے میں جس میں میر خود خان خاناں کے ساتھ شامل تھے، جب در بیلا پہنچے، اس موقع پر میر معصوم خان خاناں کو اپنے ساتھ لے کر مخدوم عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور خان خاناں حضرت مخدوم کی خدمت میں سر تسلیم خم کر کے عقیدت سے کچھ دیر بیٹھے رہے اور کامیابی کے لیے دعا مانگی۔ ۲۲ اسی روایت کو صاحبِ ذخیرۃ الخوانین نے "آوردہ اند" سے ابتداء کی ہے یہ روایت کہاں سے آئی؟ کون لایا؟ اصل منبع معلوم نہیں ہوسکا۔ بہر حال اس سے اتنا ظاہر ہے کہ مخدوم صاحب کی بزرگی مسلم تھی اور میر معصوم آپ کے اس رتبے اور درجے سے آگاہ تھے۔ یہ واقعہ ۹۹۹ھ کا ہے۔ مخدوم صاحب چند سال بعد وفات پا گئے۔

میر معصوم کی ابتدائی یا انتہائی تعلیم کے متعلق ہمیں صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ مولانا عبدالخالق گیلانی (شاگرد مولانا عبداللہ یزدی) ۹۷۲ھ میں قندھار سے بکھر کے قلعے میں آئے اور ایک مدت تک میر معصوم کے اوطاق ۲۳ میں رہ کر درس دیتے رہے۔ میر معصوم نے ان کا ذکر کیا ہے لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے معلوم ہو کہ انھوں نے ان کے یہاں کچھ تعلیم حاصل کی ہے۔ در اصل میر کئی سال پہلے تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ باقی زندگی میں موقع ملنے پر حدیث کا درس اور اسناد اس دور کے مختلف اور جیّد محدثین سے لیتے رہے۔

حوالہ جات

۱۔ یہ لقب خاندانی شجرے میں مرقوم ہے اور سید منور علی شاہ معصومی مرحوم کے ہاں اکبری عہد کے دو فرمان موجود تھے۔ جن میں بھی یہ لقب لکھا ہوا تھا۔ (۱) فرمان ۴۶ جلوس (۲۲ جمادی الثانی ۱۰۰۱ھ) کا اور (۲) ۴۹ جلوس اکبری کا، آخری فرمان پر علی محمد شاہ نے بذات خود دیکھا تھا۔جس پر بقول ان کے "نظام الدین نواب امیر محمد معصوم" مرقوم تھا۔(حیات معصوم ص : ۱۵)

۲۔ ذخیرہ، ص ۲۰۰ - مآثر الامراء ۳: ۳۲۵- اکبر نامہ ۲ _۳: ۸۳۶ وغیرہ

۳۔ امین عہدہ ہے امین الملک خطاب ہے۔

۴۔ آگے چل کر یہ خطوط اور کتبے آئیں گے۔

۵۔ ایضاً

۶۔ بدایونی- در طالب العلمی خیلی کو شیدہ۔ (۳: ۳۶۶)

۷۔ بعد از فوتِ پدر بہ تحصیل علم نحو و صرف و نظم در خدمت ملا محمد ساکن کنگری- از توابع بکر - مشغول بود ... (ا: ۲۰۱)

۸۔ پس از فوتِ پدر در خدمت ملا محمد ساکن کنگری بہ تحصیل علم اشتغال نمود بہ کمالات حسّیہ آشنا گشت۔ (۳: ۳۲۶)

۹۔ یکجا بہ کسب علوم مشغولی داشتند۔ (ذخیرہ ۱: ۲۰۱)
مقالات میں ملا محمداسحاق کا شعر لکھا ہے:

می تپد دل در برم، در شوق تو
می گزارد خانہ را، از ذوق تو

میر قانع نے لکھا ہے کہ : سلطان محمود کے ہاں ملازم تھے، انھیں علم میں بڑی فضیلت حاصل تھی، آخر میں میرزا غازی تر خان کے استاد ہوئے (مقالات، ص : ۴۲) تاریخ طاہری کے مصنف محمد طاہر نسیانی ، مرزا غازی کے ساتھ آخوند صاحب کے ہاں پڑھتے تھے۔ اپنے استاد کے لیے لکھتے ہیں: آخوند ،صاحب دل، صوفی المذہب اور خضر طبیعت تھے، شیخ سعدی اور مولانا روم کے شعر کے لیے سند تھے۔ ''چون آخوند، صاحب دل صوفی المذهب را در کلام عندلیب بوستان بی خار شیراز حضرت شیخ المشائخ سعدی شیرازی و مولانای متبحر مولوی معنوی قدس سره وقوف تمام بوده وبنابران ارث کلام شریف ایشان می خواندند. به اندك عبور شعر از حضور آن منبع فضائل و مصدر نوادرتوجه موجه معلم معروف به هرصفت که در تحریر و تقریر گنجایش ندارد. (طاہری ۱۳ -۱۴ میرزا غازی تر خان اور اس کا بزم ادب۔ حسام الدین ،ص ۱۲۹)

۱۰۔ معصومی، ص : ۲۰۰

۱۱۔ ملاحظہ سید علی رئیس کے سفر نامے پر میرا مضمون سہ ماہی مہران، سندھی ادبی بورڈ۔

۱۲۔ دیکھیے۔ صفحہ ۸۰ حاشیہ

۱۳۔ معصومی، ص : ۲۰۲

۱۴۔ معصومی، ص ۲۰۳ - بعد از فتح آن نواحی ملازمت ایشان مشرف شده مشکواة رامن اولیٰ الی آخره مع کتاب دیگر حدیث پیش ایشان گزرانیده و اجازه حاصل نمود.

۱۵۔ معصومی، ص: ۲۰۳ - به حلیۂ فضائل و کمال آراسته و پیراسته است و در علوم عقلی و نقلی مهارتی تمام دارد و در تفسیر و حدیث، خصوصاً در حدیث ید طولیٰ دارد.

۱۶۔ خان اعظم میرزا عزیز کو کہ، اکبر کے رضاعی بھائی تھے۔

۱۰۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ بادشاہ کے غصے کے سبب ۱۰۰۲ھ میں حج پر روانہ ہوئے۔ ملا بدایونی نے تاریخ کہی۔

بجای داستان، شد خان اعظم
ولی در زعم شاهنشاه کج رفت
چو پر سیدم بدل، تاریخ این سال
بگفتا: میرزا کوکه به حج رفت

۱۷۔ میر نے تاریخ ۱۰۰۹ھ میں مکمل کی۔ اسی لیے "امروز" کے لفظ کا ۱۰۰۲ھ سے ۱۰۰۹ھ تک کسی بھی ایک سال پر اطلاق ہو سکتا ہے۔

۱۸۔ "امروز مقتدای اهل حدیث در علمای مکه ایشانند." معصومی، ص: ۲۰۳

۱۹۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ ناممکن ہے میر اس عمر تک جاہل رہے ہوں اور ۹۶۲ھ کے بعد انھوں نے قاضی دتہ کے ہاں تعلیم حاصل کی۔

۲۰۔ حیات معصومی: ۱۵

۲۱۔ در جمیع اقسام علوم منقول و معقول و متداول تبحر تمام داشته و همواره به تدریس علوم و افادۂ آن اشتغال می نموده و به اخلاق حمیده و صفات پسندیده متصف بود، ونهایت ورع و تقویٰ و پرهیز گاری داشته و باوجود کمال دانشمندی و کبرسن به صفت تواضع و کسر نفسی اتصاف داشته و صاحب مقامات علیه و کرامات جلیه بوده و آن چنان قطع تعلقات امور دنیوی که ایشان را دست داده بود، در ابناء زمانه معاینه نمی شد. وفی الواقع، ترک مافی ایدی الناس، گرفته مطلقاً کلی و جزوی به رسم نذر و عطا از کس قبول نمی کردند. وهمیشه جماع از طلبه و فضلا سر وقت ایشان می رسیده اند وبه ضیافت آن مردم کما ینبغی می پر داخته اند." (معصومی، ص: ۲۴۰)

۲۲ـ معصومی، ص: ۱۱۷

۲۳ـ آورده اند در وقتی خان خانان به تسخیر تته مامور گردید ودر قصبهٔ در بیله (از توابع بکر)رسیده، میر محمد معصوم بکری نامی ایشان را در خدمت مخدوم قاضی عثمان رحمة اللّٰه علیه - که مجتهد وقت و اعلم العلماء واکمل الاولیاء بود- برد. خان خانان سر خود را بر پای مخدوم نهاده ساعتی چند از روی خضوع و خشوع افتاده بود. مخدوم بر عجز و ضعف از و راضی شدند، همان شب خان خانان را در واقع نمودند که: حضرت سرور عالم صلی اللّٰه علیه وآله وسلم بر مسند تکیه کرده نشسته اند و هزار آدمی گرد بگر دا یشان حلقه زده استاده . بزرگان سند تا در آن وقت حیات بودند وا ز عرش تا فرش نظر داشتند، مثل میان نوح و میان وهیه (وشیخ بر کیه) میرزا جانی بیگ را گرفته در خدمت حضرت سرور عالم صلی اللّٰه علیه وآله وسلم آوردند، که: یا رسول اللّٰه ! از وجود باجود میرزا جانی بیگ اهل سند قائم اند، خان خانان بر سر او آمده است، حمایت و رعایت این فرد فرما یند که خان خانان مغلوب شده بر گردد! و مخدوم عثمان دست خان خانان را گرفته در خدمت سرور عالم صلی اللّٰه علیه وآله وسلم آورده عرضی می کنند که : یا رسول اللّٰه! این مرد به اعتقاد صادق در مسجد بنده آمده التجا آورده، شرم ریش سفید بنده را نگاه داشته، توجه فرمایند که، خان خانان غالب آید! آن سرور زمانه ممتد نگاه به هر دو جانب کرده فرمودند که: ملك تته به مرزا جانی بیگ بحال خود مقرر باشد، اما به خان خانان جنگ نکند، مغلوب خواهد شد . به وسیله خان خانان به ملازمت اکبر بادشاه برود! چنانچه مقالید شهر را به دست خان خانان دادند.

مخدوم نوح و میان وهیه و شیخ بر که (کاتیار) همان نصف شب فریاد کرده مرزا جانی بیگ را طلب فرمودند، و

مذکور این واقع درمیان آور دند که: حالا از دست مایان هیچ کاری بر نمی آید که حکم سرور عالم چنین شد. مرزا جانی بیگ ازین درویشان رنجیده گفت که! از لشکر شبینه رویشان کار نساخته شد، بینید که از لشکر روز چه کار ما سر انجام بر آید.

قصه دلچسپ ہے۔ بزرگ تو ولی اللہ ہوتے ہیں، بہر حال ان کے لیے دونوں فریق ایک جیسے تھے۔ جانی بیگ سندھیوں کے ساتھ اچھابرتاؤ کرتے تھے۔ رشتہ داری قائم کر کے ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ خان خانان بھی اکبر کے نمائندہ تھے جو عمر کوٹ سندھ میں پیدا ہوئے تھے۔ سندھ اور اہل سندھ کے لیے ان کے دل میں خاص کشش تھی۔ فیضی، ابوالفضل اور ان کے والد اکبر کے درباری تھے۔

صاحبِ "تبیان" نے تمباکو نوشی کے مسئلے کے سلسلے میں مخدوم عثمان کے پوتے کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم صاحب کے علامہ عبداللطیف نامی مشہور فرزند تھے۔ جس کے فرزند علامہ محمد جان السندی الحنفی تھے۔ صاحب "تبیان" نے یہ بیان ۱۱۹۸ھ میں کیا ہے۔ (مطبع یوسفی لکھنو) ممکن ہے یہ سلسلہ مخدوم عثمان در بیلائی کی اولاد کا ہو۔

باب ۔ ۹

زندگی کے کشمکش کی ابتداء

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ میر معصوم نے چند اشاروں کے سوا اپنی زندگی کے متعلق کوئی بھی مواد یا معلومات نہیں چھوڑی۔ سلطان محمود بکھری کے یہاں ملازمت میں داخل ہونا تو سمجھ میں آسکتا ہے۔لیکن سیر سفر اور شکار کا یا تو اتنا امیرانہ ٹھاٹ یا پھر عسرت کی یہ صورت کہ پیدل گجرات پہنچنا اور آخوند اسحاق کے ذریعے بخشی نظام الدین کے یہاں ملازمت کرنا۔ وہاں سے اکبری امراء کے زمرے میں آنا، یہ تمام ایسے واقعات میں جن کی تفصیل معلوم ہوئے بغیر میر کی سوانح کے کل پہلو واضح نہیں ہوسکتے۔میر معصوم کو سمجھنے کے لیے جب تك ان کی زندگی کے ہر ایك عمل اور خدو خال کی تفصیل نہیں ملے گی تب تك ان کے ساتھ سیر حاصل یا اطمینان بخش ملاقات ممکن نہیں۔ ان کی شخصیت اور شخصیت کی ہمہ گیر نوعیت مجسم ہو کر ذہن میں آنا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر افسوس کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ بہر حال جو کچھ میسر ہوسکا وہ پیش خدمت ہے۔

محمود بکھری کے یہاں ملازمت:

عملی زندگی کا پہلا واقعہ سلطان محمود کے یہاں میر صاحب کی ملازمت کا ہے۔ جس کی اطلاع "تحفة الکرام" کے ذریعے ملتی تو ہے لیکن ان کے مآخذ کا پتہ نہیں چلتا۔ لکھتے ہیں میر معصوم ابتداء میں سلطان محمود کے یہاں اور بعد میں اکبر بادشاہ کے یہاں مرتبے پر پہنچے۔ [۱]

قرین قیاس بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم سے فراغت

حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے ضرور خاندانی تعلق اور دستوری تقاضے کے مطابق انھوں نے سلطان محمود کے یہاں ملازمت کی ہوگی۔ خود ان کے اپنے نوشتوں میں کچھ تاریخی واقعات ملتے ہیں۔ جو انھوں نے براہ راست سلطان محمود سے سن کر لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات اسی ملازمت اور ہر وقت ساتھ رہنے کے سبب حاصل کرسکے ہوں گے۔

اکبری دربار:

بکھر سے نکل کر دربار اکبری میں رسائی حاصل کرنے تک انھوں نے ہفت خوان طے کیا؟ کیسے پہنچے اور کب پہنچے؟ اس کے لیے کوئی سیدھی سادھی اطلاع نہیں ہے۔ کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل واقعات ذہن میں آتے ہیں۔ میر معصوم ۹۹۸ھ میں گجرات سے اکبر کے یہاں لاہور پہنچے۔ اس وقت والدہ کے یہاں سے تحائف پہنچے جو انھوں نے شاہی حضور میں پیش کیے۔ اکبر شاہ دلنواز اورظاہری ملک کے ساتھ دلوں کی مملکت کے بھی بادشاہ تھے۔ انھوں نے خوشی سے تحائف قبول کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ والدہ سے جدا ہوئے تمھیں کتنے سال ہوئے۔ میر نے عرض کیا: جناب تقریباً بیس برس ہو گئے ہیں۔ ۲؎ ان روایات کے حساب سے میر نے ۹۷۹ھ کے لگ بھگ اپنا وطن چھوڑا ہو گا اور یہ زمانہ تھا جب محب علی خان بن میر خلیفہ ۳؎ اور سلطان محمود بکھری کے درمیان روہڑی اور میر پور ماتھیلہ کی حدود میں معرکے ہورہے تھے۔ جن کا سلسلہ ۹۷۸ھ سے شروع ہو کر سلطان محمود کی وفات (۹۸۱ھ) تک برابر چلتا رہا۔ ۴؎

سلطان محمود بکھری بوڑھے ہوچکے تھے ۵؎ ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ان کی ایک بیٹی (اکبری بیگم) تھی۔ جسے وہ اس دور میں اکبر کے حرم میں بھیج چکے تھے۔۶؎ خود اکیلے اپنی زندگی کے دن فکر اور پریشانی میں گزاررہے تھے کہ کہیں ان کے بعد ان

کے رقیب ترخان ان کے حصے پر قابض نہ ہوجائیں۔ اسی لیے اکبر کو اطلاع بھیج کر محب علی خان کادرد سر اپنے ہی سر لے لیا تھا۔ جنھوں نے زندگی کے آخری سالوں میں انھیں آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ انھوں نے بھی کئی لوگوں کو عذاب دیکر مارا تھا۔ یہ قدرت کا انتقام ہے جو ہر ظالم سے لیا جاتا ہے۔ سندھی کی کہاوت: جیسی کرنی ویسی بھرنی، اسی موقع پر صادق آتی ہے۔ ممکن ہے کہ میر معصوم اپنے ملک کے یہ حالات دیکھ کر ان دو سالوں (۹۷۹-۹۸۰ھ) میں اکبر بادشاہ کے دربار میں پہنچ گئے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ ضعیفی میں سلطان محمود کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کی وفات (۹۸۲ھ)۷ کے فوراً بعد سکھر آئے ہوئے اکبری امراء کی وساطت سے دارالسلطنت روانہ ہوئے ہوں۔

ذخیرۃ الخوانین کی غلطی:

شیخ فرید بکھری نے میر کے ہندوستان جانے کی داستان عجیب طرح بیان کی ہے۔ روایت کہاں سے آئی؟ کس نے سنائی؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

> "جب افلاس اور تنگدستی نے انھیں انتہائی مجبور کیا، اس وقت دو تین ہم وطنوں کے ساتھ، پا پیادہ گجرات روانہ ہوئے۔ شہاب الدین احمد خان نیشاپوری ۸۔ (متوفی: ۹۹۹ھ) صوبیدار اور خواجہ نظام الدین احمد ہروی صاحبِ "طبقات اکبری" وہاں کے دیوان تھے۔ میاں شیخ اسحاق فاروقی - راقم کے طغائی - خواجہ نظام الدین ہروی کے مطلق العنان وکیل تھے اور میر کا اُس طرف جانا بھی اسی سبب ہوا۔ کیوں کہ شیخ اسحاق سے ان کی دوستی تھی اور ہم درس بھی رہ چکے تھے۔ شیخ نے ان کی آمد کو غنیمت سمجھ کر انھیں صوبیدار اور صاحبِ دیوان کی خدمت میں

پیش کر کے ان کے لیے منصب کی تجویز کی۔
خواجہ نظام الدین احمد کو اس وقت تاریخ" طبقات اکبری" کا شوق تھا جیسا کہ میر کو تاریخ کے علم میں کامل دسترس تھی۔ اس لیے خواجہ نے انھیں اپنا ندیم اور صاحب مقرر کیا۔[۹]

میر صاحب کے افلاس اور تنگدستی کی صورتحال کو روشن کرنے کے لیے شیخ فرید نے یہ حکایت بھی لکھی ہے:

" جب میر گجرات پہنچے، تو ایک صراف ہزار اشرفیاں گن کر کوٹھی میں بند کر رہا تھا۔میر نے یہ منظر دیکھ کر، ٹھنڈی سانس لے کر، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا:اے میرے مولا اپنے اس بندے کو بھی اتنی دولت عطا کر، تاکہ واپس بکھر جا کر اپنے بچوں کے ساتھ خوشی کے ساتھ، اپنا وقت گزارے۔ اس پر ان کے ساتھی شاہ قلی نے کہا، اے پست ہمت یہ کیا تم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہو، یہ نہیں کہتے کہ یا الٰہی مجھے اتنا رتبہ اور جاہ و جلال عطا کر، کہ میں اتنی رقم میں ہر ماہ اپنے ایک سپاہی کو دوں ، میر نے اپنا سر زمین پر رکھ (سجدہ کر کے) کر اپنے رب سے یہی سوال کیا۔ ستارہ موافق تھا اور سوال ایسا قبول ہوا کہ میر واقعی اپنی زندگی ہی میں تیس چالیس لاکھ روپے کے سرمائے کا مالک ہو گیا۔[۱۰]

اس داستان کی ابتداء "آوردہ اند" سے کی گئی ہے کہ شیخ فرید نے یہ عبارت کسی کتاب سے لی ہے جس کے نام سے ہم واقف نہیں ہیں۔ بہر حال شیخ فرید کی اس داستان میں مندرجہ ذیل سقم ہے:

۱) شہاب الدین احمد خان کا گجرات میں تقرر، وزیر خان کی جگہ پر ۹۸۴ھ[۱۱] میں ہوا۔[۱۲] اور میر معصوم کا تقریباً سات

برس بعد گجرات میں تقرر ہوا۔ جب شہاب الدین کا تبادلہ ہوچکا تھا اور ان کی جگہ پر اعتماد خان کو ۹۹۱ھ[۱۳] میں بھیجا گیا۔ خواجہ نظام الدین کا تقرر بھی اسی موقع پر ہوا۔ یہ وہی وقت تھا جب میر معصوم دوسرے امراء اور افسران کے ساتھ مقرر ہو کر گجرات آئے تھے۔

۲) میر معصوم ۹۸۴ھ میں، جب کہ ان کی موجود گی گجرات میں دکھائی جاتی ہے۔ خواجہ غیاث الدین علی، آصف خان ثانی[۱۴] کی سپہ سالاری کی تحت ایدر کی لڑائی میں شریک تھے جس میں ۴ ذی الحج ۹۸۴ھ (جون ۱۵۷۶ء) کو شاہی لشکر کو آخری مرتبہ کامل فتح حاصل ہوئی۔[۱۵] جیسا کہ آئندہ صفحات میں ظاہر ہو گا، میر معصوم در حقیقت سلطان محمود کی وفات (۹۸۲ھ) کے بعد جب بالائی سندھ اکبری سلطنت کا جزو بننا تھی یا بن چکی تھی۔ ہوا کا رخ دیکھ کر بکھر کو خیر باد کہہ کر، قسمت آزمانے کے لیے، ہندوستان گئے ہوں گے۔ مآثر رحیمی کی ایک عبارت سے بھی ایسا اشارہ ملتا ہے۔ گجرات میں اعتماد خان اور شہاب الدین خان سے مظفر خان گجراتی کی چپقلش کا ذکر کرتے ہوئے ایک جنگ کی روداد بتا کر عبدالباقی نہاوندی نے لکھا ہے:

> "میر معصوم بکھری جو بکھر کے عظیم سادات میں سے تھا ......وہ بادشاہی امراء میں "فتح بکھر" کے موقعے پر شامل ہوئے تھے۔ اس وقت (۹۹۱ھ) گجرات میں معاون کار تھے۔[۱۶]"

فتح بکھر سے عبدالباقی کی مراد وہ تھوڑا عرصہ ہے جو محب علی کی معرکہ آرائیوں (۹۷۹ھ) سے شروع ہوا اور سلطان محمود بکھری کی وفات کے بعد بکھر کے پہلے مغل صوبیدار میر گیسو خان بکاول بیگی کی آمد (۹۸۲ھ) پر ختم ہوا۔

میر معصوم کے ایک قول سے جس کے راوی ملا بدایونی ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ میر بکھر سے گجرات نہیں بلکہ سیدھے آگرہ دربار میں پہنچے تھے۔ ملا صاحب کا بیان ہے کہ

> میر معصوم چوں کہ تقویٰ، پرہیز گاری، درود ، نماز اور تلاوت کے بہت پابند تھے۔ کسی نے کہا کہ تب تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک رشد کی رہنمائی حاصل نہ ہو۔میر معصوم نے جواباً کہا کہ میرے تین مرشد ہیں۔ زیادہ کی فی الحال ضرورت نہیں ہے ان تین مرشدوں کی نوعیت بیان کرتے ہوئے میر معصوم نے ابتداء اسی طرح کی ہے۔ اپنے وطن سے دار الخلافہ روانہ ہوا اس وقت جوانی کی ہوا و ہوس میں دماغ اس حد تک خراب تھا کہ ہزاری اور دوہزاری کے سامنے سر نہیں جھکا۔ میں جس وقت دربار میں پہنچا اور چوبداروں کے چابک کھائے اور ذلت اٹھانی پڑی اور کافی انتظار اور تکالیف اٹھانے کے بعد منصب بیستی نصیب ہوا ...۱۷۔

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ میر بکھر سے سیدھے دارالخلافہ (آگرہ)پہنچے۔ دوسرے جملے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں جوانی اور جوانی کی مستی تھی، افلاس زدہ نہیں تھے۔ اور نہ ہی بے سروسامان تھے۔ جیسا کہ ذخیرۃ الخوانین نے نقشہ کھینچا ہے ۔ بہر حال ان کے یہاں اتنا کچھ اثاثہ تھا کہ ہزاری اور دو ہزاری امیروں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ افلاس اور تنگدستی میں یہ گھمنڈ نہیں ہوتا۔ مال و دولت کے علاوہ میر کو اپنے علم اور عملی قوت پر بڑا بھروسا تھا۔ اس لیے کسی کو خاطرمیں نہیں لاتے تھے۔ "کافی انتظار" کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ جس صورت میں ہزاری اور دو ہزاری امراء کی پروا نہیں کی۔ اس لیے انھیں ٹھہرنا پڑا جب تک

بادشاہ کسی نہ کسی طریقے ان کی خوبیوں سے آگاہ ہو کر انھیں کوئی منصب عطا فرمائے۔

میر معصوم در حقیقت ۹۸۴ھ سے کافی عرصہ پہلے اکبری ملازمت میں داخل ہو چکے تھے۔ ملازمت حاصل کرنے اور منصب لینے کے سب مراحل طے کر کے اسی سال تاریخ کے صفحات پرنمایاں ہوئے۔ اور مختلف معرکے سر کرنے میں اس دور کے سب اہم امراء اور سپہ سالاروں کی انھیں معیت حاصل تھی۔ آصف خان ثانی، خان اعظم کوکا، شہاب الدین احمد خاں، اعتماد الدولہ اور خان خاناں مرزا عبدالرحیم جیسے عظیم المرتبت جرنیلوں کی کمان میں کئی معرکے سر کر کے سرخرو ہو چکے تھے۔

جنگوں، ملکی معاملات کو سلجھانے اور مسائل کا مقابلہ کرنے اور عام کارکردگی کے سبب میر معصوم نے اپنے آپ کو اتنا اہم اور بلند تر ثابت کیا کہ مورخین نے انکا ذکر کیا اور نام لیا۔ ان سب کی عبارات اور تحریروں سے میر کے لیے نہایت عزت آبرو اور احترام کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔

اکبر نے اپنا سارا دور جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہو گا خیرو خوبی سے مکمل کر کے میرنے جہانگیر کے سال اول میں جب انتقال کیا تب تک ان کا وقت نہایت اچھے طریقے سے گذرا۔ کبھی بھی عتاب میں نہ آئے۔ حال آں کہ متعدد معاصر کبھی شاہی عتاب میں آتے اور کبھی بحال ہوتے لیکن میر صاحب نے آخری وقت تک اپنے منصب پر فائز رہ کر اپنی زندگی بخیر و خوبی سے گزاری، جو شخصی اور مغلیہ حکومت میں ایک بڑی کامیابی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر نہ صرف مردم شناس تھے بلکہ اچھے لوگوں کے حصول میں بھی وہ خوش قسمت تھے جیسے مشیروں اور امیروں کی قربت انھیں حاصل تھی کسی اور بادشاہ کو میسر نہ آسکی۔ اکبر واقعی خوش قسمت اور بہت اچھے آدمی تھے۔ [۱۸]

حوالہ جات

۱۔ ...میر نخست پیش سلطان محمود، آنگاه به حضور اکبر بادشاه به مرتبه والا رسیده...(تحفة الکرام قدیم چاپ ۳:۱۲۷)

۲۔ ...چند سال است که از والده جدا شده اید؟ میر نے کہا: قریب به بیست سال باشد. (معصومی ۲۵۱- بلا خمن ۴۶۳)

۳۔ میر نظام الدین علی خلیفه امیر بابر بادشاہ، محب علی کی بیوی ناہید بیگم تھی، جو حاجی بیگم کی بیٹی تھی اور یہ حاجی بیگم پہلے شوہر قاسم کوکا سے ہوئی تھی۔ حاجی بیگم خود مرزا محمد مقیم بن امیر ذوالنون کی بیٹی تھی، ان کی وفات کے بعد ان کی شاہ حسن ارغون سے شادی کی۔ فخری ہروی نے اسی حاجی بیگم کے لیے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ سندھ کی سیاست میں حاجی بیگم یا ناہید بیگم کا کیا حصہ رہا ہے، کے لیے ملاحظہ ہو: (مآثر: ۳: ۲۳۹ ببعد)۔

۴۔ معصومی: ۲۲۹۔ آئین بلاخمن

۵۔ ولادت ۸۹۸ھ اور اس وقت ۹۸۰ھ میں ان کی عمر ۸۳ سال تھی۔

۶۔ معصومی: ۲۲۹

۷۔ سلطان کا انتقال ۸ صفر، پیر کے دن دو پہر کو ہوا۔ (معصومی: ۲۳۵-۲۳۶) اکبر بادشاہ کو یہ اطلاع ۲ ربیع الثانی ۹۸۲ھ کو پہنچی جب وہ بنگال کی طرف جاتے ہوئے جونپور کے قریب، یحیٰ پور کے گاؤں میں منزل انداز ہوا۔ طبقات اکبری میں ہے کہ: درین زمان منهی اقبال به عرض رسانید که: سلطان محمود خان بکری داعی اجل را اجابت

نمود و قلعه بکر معظم قلاع است بَه تصرف اولیاءِ قاهره در آمد. (۲۸۷:۲) اس اطلاع کو فتح بنگال کے لیے بادشاہ نے نیك فال سمجھا۔ اسی کے ساتھ انھیں یہ عریضہ بھی پہنچا کہ محب علی خان اور مجاہد خان پر اعتبار نہیں اسی لیے کوئی دوسرا امیر آئے تاکہ سلطان محمود کا وکیل قلعے کی چابیاں حوالے کرے - و دریں ایام عرضداشت وکلای سلطان محمود رسید کہ سلطان محمود ودیعت حیات سپرد ومارا بر محب علی خان و مجاهد خان اعتبار نیست اگراز درگاہ کسی را فرستند قلعه را حوالی اونماییم . حضرت خلیفه الٰهی میر گیسوی بکاول بیگی را کہ "گیسو خان" خطاب داشت به جهت حراست قلعۂ بکر فرستادند- (طبقات: ۳۰۱:۳) میر معصوم کا قول ہے کہ گیسو خان ۱۲ جمادی الاول ۹۸۲ھ کو بھکر میں داخل ہوئے۔ (معصومی : ۲۴۲)

۸۔ شہاب الدین کا حال مآثر الامراء میں دیکھیے (۵۶۶:۲)

۹۔ ...میان شیخ اسحاق فاروقی - طغائی مسود اوراق شیخ فرید بکری - وکیل مطلق العنان خواجه نظام الدین هروی بود. و عزیمت میر به صوب گجرات محض از تقریب محبت شیخ اسحاق بود، که در بکر یکجا کسب علوم مشغولی داشتند، شیخ قدوم میمنت لزوم میر را از جمله مغتنمات دانسته ملازمت صاحب صوبه و دیوان کنانیده منصب تجویزی دهانید.

خواجه نظام الدین احمد را ذوق تصنیف "تاریخ طبقات اکبری" بود. و میر در علم تاریخ بهره کامل داشت. جمعیت ایشان برار کرد مصاحب و ندیم گردید ند . آخر به مرور ایام به منصب هزاری ذات سوار رسیده و در خدمت عرش آشیانی قرب و حالت بهم رسانید . (ذخیره: ۱: ۲۰۱-۲۰۲)۔ مآثر الامراء کے مؤلف نے وہی روایت ذخیره

سے لے کر آخر میں لکھتے ہیں کہ میر معصوم پہلے نظام الدین کے ہاں اور پھر شہاب الدین کے ہاں ملازم ہوئے۔

پس ازان بہ ملازمت شہاب الدین احمد خان صاحب صوبہ آنجا فایز گشت. تجویز منصب امتیاز گرفت ومرور ایام نامی بہ شجاعت و مردانگی بر آوردہ در خدمت عرش آشیانی دولت روشناس اندوخت. (۳۳۷:۳)

۱۰۔ آوردہ اند کہ: چون میر محمد معصوم بکری بہ گجرات تشریف بودند بہ دو کانچہ صراف منزل کردند، آن صراف بزرہ ہزار اشرفی را شمردہ در کوتری نہادہ. میر آہ سرد از دلِ پر درد بر آوردہ و دست بر آسمان برداشت کہ: بار خدایا! این قدر زر بہ بندہ عطا فرمایی (کہ) بہ بکر رفتہ در گوشہ انزوا بافرزند ان اوقات گذر نماید! شاہ قلی یار ایشان کہ درین سفر رفیق بود. از روی ابرام بہ میر گفت: ای پست ہمت! این قدر آرزو است؟ بدرگاہ قاضی الحاجات مسئلت نما کہ: مرتبۂ جاہ و جلال من چنان زیادہ گردان کہ این قدر زر درماھہ یك سپاھی من باشد. میر جبین نیاز بہ درگاہ بی نیاز بر زمین نہاد مسئلت این مطلب نمود، اختر در گذر بود، مستجاب شدہ میر در زمان دولت خود، صاحب سی وچھل لك روپیہ گردید. (۱:۲۔۲)

۱۱۔ مراۃ سکندری ص ۴۵۷، مراۃ احمدی ۹۸۵ھ لکھا ہے۔ (۱:۱۳۷)

۱۲۔ اکبر نامہ، ۲۱۷:۳

۱۳۔ اکبر نے ۹ ربیع الاول بروز چہار شنبہ ۹۹۱ھ کواعتماد کے تقرر کا حکم جاری کیا (طبقات ۳۶۸:۳۔ اکبر نامہ ۴۰۳:۳، مراۃ احمدی ۱۴۲:۱) ۱۲ شعبان ۹۹۱ھ کو اعتماد خان احمد آباد میں داخل ہوئے۔

۱۴۔ آصف خان کے لیے دیکھو، نور جہاں کا مادری اور پدری

شجرہ مطبوعہ، مظہر شاھجہانی مرتبہ راقم۔

۱۵۔ طبقات ۲: ۳۳۰، اسمتھ مطبوعہ ص ۱۰۸

۱۶۔ میر معصوم بکری که از سادات رفیع الشان بکربوددرسلك امرای پادشاهی، در هنگام فتح بکر منتظم شده بود. در ان وقت کمکی گجرات بود. (مآثر رحیمی ۲: ۲۲۶)

۱۷۔ بدایونی ۴: ۳۶۳ ...از اوطان مالوف به جانب دارالخلافه روانه شدیم از ...هوا و هوس جوانی-که سرمایهٔ آمال و امانی است-سرما به هزاری او دو هزاری هم فرونمی آمد، چون به در بار رسیده چوبِ پسا ولان و چوبداران صاحب اهتمام، خوردیم و رذالت کشید و بعد از طول انتظار ما را به منصب بیستی سر فراز ساختن...“

۱۸۔ ۳۱۔۱۲۔۱۹۸۵، کراچی، علی رضا منزل الحمرا سوسائٹی۔

باب ۔ ۱۰

اکبری دربار میں شروعاتی زندگی

اکبری دربار یا سرکاری ملازمت میں میر معصومؒ کے داخل ہونے کا، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے، کوئی بھی حتمی اطلاع یا نشان نہیں ملتا۔ قرین قیاس ہے کہ میر مرحوم نے سال ۹۷۹ھ میں بکھر کو خیرباد کہا ہوگا۔ ۹۸۴ھ میں پہلی بار ان کا نام اکبری دور کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ درمیان کے ان برسوں (۹۷۹-۹۸۴ھ) میں ان کی کیفیت اور حال کا علم خدا کو ہے۔ البتہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ضرور ۹۸۴ھ سے کچھ عرصہ پہلے باقاعدہ شاہی ملازمت میں شامل ہوئے ہوں گے۔ ورنہ تاریخ کے صفحات میں ایک نئے یا زیر تربیت رنگروٹ کو یہ شرف کہاں حاصل ہوسکتا تھا کہ کہنہ مشق جرنیلوں کے ساتھ ان کا نام لیا جائے۔ پہلے سال ملازم ہوتے ہی مغلوں کے دستور کے مطابق اتنی اہمیت کے مستحق نہ سمجھے جاتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انھیں پہلے سے یقیناً جنگ جوئی اور رزم آرائی کے گر اور بادشاہی ملازمت کے آداب اور امتحان کے مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا۔

ایدر کی جنگ ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء:

خواجہ نظام الدین بخشی سال ۲۳ الٰہی (۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء) کے آخری مہینے کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بادشاہ ذی الحج میں دیبال پور (مالوہ) پرگنے میں مقیم تھے۔ جہاں اطلاع پہنچی کہ راجا نارائن داس والی کیکا، جو کچھ وقت پہلے رائے مان سنگھ کے ہاتھوں شکست کھا کر کوہستانی علاقے کی طرف روپوش ہوگئے تھے۔[۱] اس پر بادشاہ نے حملہ کرنے کا حکم دیا ہے اور

کمان قطب الدین کے سپرد ہے۔ ان کے ساتھ قلیچ خان کی امدادی فوج بھی روانہ کی گئی اور علی مراد خان اوزبک بھی ایدر سے اس فوج کشی میں شامل ہوئے۔

نارائن داس مقابلے کے لیے آس پاس کے زمینداروں اور پڑوسی راجپوتوں سے مدد لے کر ایدر [۲] کے تھانے سے دس کوس کے فاصلے پر شب خون مارنے کی تاک میں بیٹھا تھا۔ موقع اور محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بادشاہ نے متعدد جرنیلوں کو روانہ کرنے کا انتظام کیا۔ "طبقات" میں آصف خان، میرزا محمد مقیم، تیمور بدخشی، مظفر خان (برادر خان عالم)، خواجہ ناصر وغیرہ کے بھیجنے کا ذکر آیا ہے۔ ایسے مشہور جری اور قدیم سپہ سالاروں کی صف میں میر معصوم کا نام بھی شامل کیا گیا جس سے بخوبی میر معصوم کی اہمیت اور جنگی اہلیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ [۳]

چوتھی ذی الحج ۹۸۴ھ کی صبح جنگ شروع ہوئی جس کا نارائن داس مقابلہ نہ کرسکا اور شکست کھا کر جان بچا کر بھاگ گیا۔ بادشاہ کو جب یہ اطلاع پہنچی تو ہر ایک امیر کو تحسین کے پیغام روانہ کیے گئے۔ [۴]

بہار اور بنگال ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء:

گزشتہ چند سال یعنی ۹۸۴ھ سے ۹۸۸ھ تک میر معصوم کے سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ کہاں رہے، کس مہم پر رہے، کونسا کام ان کے سپرد رہا، تقریباً پانچ سال تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ ہم انھیں دوبارہ سال ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی کمان میں بہار اور بنگال کی طرف معرکوں میں مشغول اور مصروف دیکھتے ہیں۔

بنگال میں مظفر خان کو صوبہ دار بنا کر مرکز سے بھیجا گیا تھا جس نے وہاں پہنچ کر اتنا سخت رویہ اخیار کیا کہ رعایا کو سکون حاصل نہ ہوسکا۔ انتشار، بے اطمینانی اور بغاوت بڑھ گئی۔

مظفر خان اسی کشمکش میں مارا گیا۔ جس سے متاثر ہو کر مرکز کی طرف سے راجہ توڈرمل، محمد صادق خان اور ترسون خان بھیجے گئے وہ ابھی پہنچے بھی نہ تھے کہ بغاوت بڑھ کر بہار کی سرحدوں میں داخل ہوئی۔ گویا اب دونوں علاقوں کے عوام مشترکہ طور پر آگرہ میں بیٹھ کر، حاکموں کے خلاف ایک دوسرے کے معاون بن کر بر سر پیکار ہو گئے۔

حالات جب اس مرحلے پر پہنچے، اس وقت خان اعظم مرزا عزیز کو کلتاش کو بہار کی طرف روانہ کردیا گیا۔[۵] پیچھے کمک کے لیے محب علی خاں بھی روانہ ہوئے۔ "اکبر نامہ" نے اس سلسلے میں میر معصوم کا نام بھی لیا ہے۔ "سید مظفر، میر معصوم اور دوسرے تجربہ کار ان کی مدد کے لیے بھیجے گئے۔[۶]

مختصر یہ کہ "اس قسم کے تجربہ کار، خدمت گزاروں" کے انبوہ کے پہنچنے کے بعد لوگوں میں کہاں دم تھا کہ مقابلہ کرسکیں۔ اس لیے وقتی طور پر شورش ختم ہو گئی اور انتظامی طور پر سکون ہو گیا۔

بنگال ۹۹۱ھ/۱۵۸۴ء:

لیکن پھر بھی مخالفت کی بیخ کنی نہیں ہوئی تھی اور وقتاً فوقتاً ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ جن کا سر خیل معصوم کابلی تھا۔

خان اعظم بنگال نے ۹ محرم ۹۹۰ھ میں واپس دربار پہنچ کر ساری روداد پیش کی۔ چند دن وہاں رہ کر خان اعظم جب پٹنہ (حاجی پور) واپس پہنچے اس وقت بادشاہ در پیش حالات کے مد نظر کابل سے واپس آئے ہوئے لشکر میں سے چیدہ چیدہ سپاہی ان کے ساتھ کردیے۔ تاکہ وہاں پہنچ کر معصوم کابلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود کرنے کی کوشش کریں۔[۷]

خان اعظم ابھی راستے ہی میں تھے کہ معصوم کابلی کی از

سر نو شورش کی اطلاع پہنچی، طبقات کے مصنف ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء کے واقعات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"(۲۸ سال الٰہی) گذشتہ صفحات میں مذکور ہے کہ خان اعظم اور دوسرے جاگیر دار حاجی پور سے در گاہ میں آئے کیوں کہ صوبہ خالی تھا اس لیے نمک حراموں نے فرصت کو غنیمت جان کر، کونے کونے سے فتنہ اور فساد بر پا کردیا۔" ۸۔

خبسہ نامی معصوم کابلی کے ملازم نے ترخان دیوانی اور سرخ بدخشی سے مل کر بہار کے صوبے میں قتل و غارت گری کا طوفان برپا کردیا۔ اتفاق سے محمد صادق خان بخشی وہیں موجود تھے۔ جس نے محب علی خان سے مل کر حالات کا مقابلہ کیا۔ مقابلے میں خبسہ مارا گیا۔ جس (سبب) سے باغی گروہ دل شکستہ ہو گیا کچھ مغلوب اور باقی منتشر ہو گئے۔

اس بغاوت کو ختم کرنے کے بعد محمد صادق خان بہار سے واپس دربار میں آئے اور وہاں کے سارے حالات بادشاہ کے گوش گزار کیے۔ اکبر مطمئن نہ ہوئے انھوں نے محمد صادق خان کو فوراً پیچھے واپس بھیجا تاکہ خان اعظم کے ساتھ مل کر اس فتنے کو آئندہ کے لیے نیست و نابود کرنے کی تدابیر کریں۔ شاہ قلی، شیخ ابراہیم حبشی اور دوسرے امراء بھی ان کی مدد کے لیے بھیجے گئے۔یہ بیان "طبقات" کے مصنف کا ہے۔ جنھوں نے فوجی سرداروں میں میر معصوم کا نام نہیں لیا ہے۔ "دیگر امرائے کبار" کا فقرہ مطلب کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھ کر سلسلے کو ختم کردیا ہے۔ لیکن خدا ابو الفضل کا بھلا کرے، جنھوں نے "اکبر نامہ" میں اس سال ان جاتے ہوئے امیروں میں میر معصوم کا نام لا کر سوانحی کڑیوں کو ملانے میں آسانی پیدا کردی خاص امیروں کی فہرست اس طرح دی گئی ہے۔

بنا بران سبز دھم اُردی بھشت، میرزا خان و زین خان کوکہ، واسماعیل قلی خان و مخصوص خان و

مطلب خان ورای سر جن و شیخ جمال بختیار و شیرویه خان وصفر بیگ و میر ابو المظفر ومیر معصوم بکری وبسیاری دیگراز ملتزمان بار گاہ حضور دستور شرقی دیار یا فتند و هر یك را به خلعت فاخره اسب خاص سر بلندی بخشیدند۔"[۹]

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ ابھی یہ کمک بمشکل روانہ ہی ہوئی تھی کہ مخالف گروہ کی شکست ہزیمت کی خوش خبری دربار میں پہنچ گئی۔ "طبقات" کے مصنف نے تفصیل دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بنگال سے خبر آئی کہ خان اعظم کی فوجیں ٹانڈہ میں پہنچیں اس وقت خالدی خان، جبار بردی اور مرزا قاقشال نے اسی مجرم (معصوم کابلی) سے الگ ہو کر خود کو خان اعظم کے سامنے پیش کردیا اس لیے معصوم کابلی کی کمر ٹوٹ گئی اور میدان چھوڑ کر عیسیٰ زمیندار کے ہاں جا کر پناہ لی۔ اس طرح ولایت بنگال کا جو حصہ باغیوں کے قبضے میں تھا وہ دوبارہ شاہی تصرف میں آگیا۔[۱۰]

میر معصوم کو زندگی میں ان چھوٹی اور ابتدائی مہمات کے علاوہ آئندہ دور میں چند اہم ترین واقعات اور مہمات درپیش رہیں جن کو حقیقت میں ان کی سرکاری زندگی کا ماحصل اور ان کی اپنی حیات کا سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ اس آنے والے دور میں انھوں نے اس دنیا میں اپنے عملی کارناموں کے ایسے نشانات چھوڑے جن کی وجہ سے نہ صرف تاریخ میں اہم مقام اور دوام حاصل ہوا بلکہ آپ کی شخصیت کو حقیقی عظمت اسی دور میں حاصل ہوئی۔

میر کے آئندہ دور کو ہم تین عنوانات میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔ گجرات کی مہم، خواجہ نظام الدین صاحب "طبقات" سے تعلق اور تاریخ نویسی کے رجحان کا پیدا ہونا اور "تاریخ سندھ" لکھنے کا ذہنی خاکہ۔

۲- سندھ پر لشکر کشی میں خان خاناں کے ساتھ شمولیت اور سندھ میں اپنے اثرات چھوڑنا۔

۳- ایران کی سفارت اور وہاں کے علمی حلقوں میں رسوخ اور ساکھ پیدا کرنا۔

آنے والے صفحات میں ان تین عنوانات کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ ان تین اہم عنوانات کے علاوہ میر کی زندگی میں اور بھی ایسے واقعات گزرے ہوں گے جن کو یا تو تاریخ ضبط نہ کرسکی یا کسی اور ذریعے سے ہمیں میسر نہ ہوسکا مثلاً سیوی پر حملہ، قندھار میں قیام ،وقت کا تعین، اور وہاں پر ان کی خدمات اور کارنامے وغیرہ وغیرہ یہ ایسے مسائل ہیں جن کی تفصیل سے ہم محروم ہیں۔ آنے والے صفحات میں ہم نے صرف اندازوں پر انحصار کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ۲۰ محرم ۹۸۵ھ بادشاہ نے اجمیر کی منزل سے رائے مان سنگ کو اسی رانا کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ (طبقات ۲:۳۲۱) کوہستان ہند واڑا کے شہر میں کوکندہ کے پاس جنگ ہوئی۔ جس میں رانا شکست کھا کر زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ (طبقات ۲:۲۲۲۔۲۲۳) مان سنگ کوکندہ پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے اور کچھ عرصے کے بعد قحط کے سبب لشکر واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد اجمیر سے یہ لشکر کشی کی گئی۔ جس میں کچھ بادشاہ بذات خود بھی شریک ہوئے۔

۲۔ ایدر پرگنا، احمد آباد سے ۴۵ کوس پر مشرق کی طرف ہے جس کی سرحدیں اودھیپور اور ڈونگر پور سے جا ملتی ہے۔ ایدر میں قدیم قلعہ موجود ہے (مراۃ احمدی: ۳: ۱۹۵، بڑودو ۱۹۳۰ ترجمہ انگریزی از نواب علی، ص ۱۶۴ بڑودو ۱۹۲۸ء)

۳۔ بدایونی (۲:۲۴۵) میں مرزا ابواللغیث بخاری کا بھی نام آیا ہے۔

۴۔ طبقات (۲:۳۳۱) بدایونی میں اس جنگ کی تاریخ، ۴ ذی الحج ۹۸۴ھ درج ہے (۲:۲۴۴)

۵۔ اکبر نامہ ۳:۲۲۴ "چون خان اعظم بجنود اقبال طراز پیوست عشرت رایات بلند شد.

۶۔ اکبر نامہ، ۳:۲۲۴۔ "سید مظفر و میر معصوم و دیگر خدمت گزینان کارشناس را همراه گردا نیدند."

۷۔ طبقات، ۲ : ۳۶۴

۸ـ طبقات ۲:۳٦۵-" در اوراق گذشته ذکر یافت که خان اعظم و سایر جاگیر داران از حاجی پور بدرگاه آمدند. چون آن صوبه خالی مانده بود حرام نمکان فرصت یافته از هر گوشه سر فتنه و فساد بر آور دند."

۹ـ اکبر نامه: ۲:۳۹۹

۱۰ـ طبقات ۲: ۳٦۸-"از بنگاله خبر رسید که خان اعظم و افواج قاهره در تانده در آمدند. و خالدی خان وجبار بردی و میرزا بیگ قاقشال از عاصی (معصوم) کابلی جدا شده، پیش خان اعظم آمدند، واو (معصوم) فرارنموده پناه به عیسیٰ زمیندار برد. و آنکه از ولایت بنگاله به تصرف باغیان در آمده بود، باز به تصرف اولیای دولت روز افزون در آمد."

باب۔ ۱۱

گجرات کی مہم اور قیام

گجراتی سلطنت کے زوال کے آخری ایام میں سلطنت کے امیر الامراء اور وزیر ممالک اعتماد خان جو ایک نہایت زیرک، چالاک اور موقع پرست شخص تھا کی خود غرضی پر مبنی چال بازیوں نے استحکام کے بجائے قدیم آزاد مملکت کو مغلوں کا غلام بنادیا۔

سلطان محمود شاہ سوم (۱۵۳۷/۹۴۴ - ۱۵۵۳/۹۶۱) لاولد قتل ہوا۔ اعتماد خان نے شخصی مصلحت کی خاطر رضی الملک نامی ایک لڑکے کو سلطان احمدشاہ (بانی احمد آباد) کی اولاد میں سے ظاہر کر کے انھیں سلطان احمد شاہ کے لقب سے تخت نشین کیا۔ اس خود ساختہ لڑکے کو حرم سرا میں بٹھا کر وہ سیاہ و سفید کا مالک بن کر حکومت کرنے لگا۔پانچ سال تک اس تماشے کو صبر سے سہنے کے بعد حرم سرا کو چھوڑ کر باہر نکلا اور دوسرے امراء کو اپنا ہم خیال بنا کر حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جس کے نتیجے میں ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ اعتماد خان نے چند ہی روز میں سلطان کو سوتے میں قتل کروا کر (۱۵۶۱/۹۶۹)ا۔ دوسرے ایک لڑکے کو سلطان محمود کا فرزند ظاہر کر کے تخت پر بیٹھا دیا اور ان کا سلطان مظفر لقب ظاہر کیا اس طرح اعتماد خان نے ایک بار پھر نہ صرف اپنی وزارت مضبوط کی بلکہ اپنے لیے "مسند عالی" کا خطاب تجویز کر کے دوبارہ اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔یہ وہ زمانہ تھا جب زیریں سندھ پر مرزا عیسٰی ترخان کی حکومت تھی اور بالائی سندھ پر سلطان محمود بکھری اپنی جبری حکومت چلا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے اہل سندھ کا دم گھٹ رہا تھا۔ ٹھٹھہ والے حصے میں اگرچہ خیریت تھی، لیکن عیسیٰ کے بیٹوں میں اندر ہی اندر ایک دوسرے کے خلاف

کدورتیں ہورہی تھیں۔ گجرات سے سندھ کے سما سلاطین کا جو تعلق تھا وہ شاہ بیگ اور بعد میں شاہ حسن کی معاندانہ روش کے سبب کب کا ختم ہوچکا تھا۔ سندھ اور گجرات کے درمیان کوئی بھی سیاسی اور سماجی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ گجرات ہی اس دور میں سندھ کے مظلوم اور ستائے ہوئے لوگوں کی پناہ کا کام دے رہاتھا۔ یہاں کے مظالم سے بھاگ کر سندھی وہیں جا کر پناہ لیتے تھے۔ یہ بات مقبوضہ سندھ کے حکمرانوں کو ناگوار گزر رہی تھی۔ لیکن ان کے پاس اس کا کوئی علاج بھی نہ تھا۔

اکبر کو گجرات کی دعوت:

مسند عالی اعتماد خان نے جو نیا نظام تشکیل دیا وہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ نہ صرف سلطان مظفر ان کے مخالف ہو گئے بلکہ دوسرے امراء بھی گروہ بندی میں مصروف ہو گئے ۔ اعتماد خان کو جب حالات پر قابو نہ رہ سکا تو وطن فروشی پر اتر آیا اور اپنے کارندوں کے ذریعے اکبر کو سندھ پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔[۲]

اکبر کو یہ دعوت ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں ناگور میں ہی اکبر درون خانہ کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہیں سے گجرات کی طرف روانہ ہوئے یہ بات اکبر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ گجرات کی سلطنت اس حد تک تباہ حال اور زوال پزیر ہوچکی ہو گی کہ اسے ایک دن کے مقابلے کی بھی تاب نہ ہو گی۔ اکبر جب احمد آباد پہنچے تو اس وقت شیر خان فولادی شہر کا قبضہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور مظفر خان کے لیے لڑنا بیکار تھا۔ وہ خود ہی آکر اکبر کی خدمت میں پیش ہوا۔ ایسی آسانی سے اس قدیم سلطنت یا ملک کا ہاتھ آجانا، خدائی عنایت سے کم نہ تھا۔ نمک حرام "مسند عالی"، اعتماد خان جنھوں نے ملک و ملت کی آزادی اپنے ذاتی مفاد کے خاطر ختم کرادی ان پر اکبر کی عنایات کا کوئی شمار نہ تھا اور اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔

نیا حاکم، نیا دور (۹۸۱-۹۹۱/۱۵۷۲-۱۵۸۳ء):

اعتماد خان گوکہ حکومت میں تھے لیکن گورنر مغلوں کی طرف سے آتے رہے۔ بالا دستی بہر حال نئے لوگوں کی تھی۔ کچھ عرصے تو گجراتی حالات کا مطالعہ کرتے رہے، آخر کار سردار شیر خان فولادی، اور معزول سلطان مظفر خان مقابلے کے لیے میدان میں نکل آئے۔ حقیقی ورثا اور قابضین کے درمیان معرکے شروع ہوگئے۔ یہ سلسلہ پورے دس سال (۹۸۱۔۹۹۱) تک چلتا رہا۔

آخری دور میں شہاب الدین احمد خان مغلوں کے صوبے دار تھے، اکبر نے مجبور ہوکر اعتماد خان کو صوبے دار مقرر کرکے انھیں مختار کل بنا دیا تاکہ لوہا لوہے کو کاٹ سکے، گجراتی مقابلے کے لیے، گجراتی غدار ہی موزوں ہوسکتا تھا جو تمام کوتاہیوں اور کمزوریوں سے واقف تھا۔[۳]

اعتماد خان کا تقرر:

اس اسکیم پر عمل کرتے ہوئے بادشاہ نے نئے انتظام کے تحت، اعتماد خان کے ساتھ اپنے قابل اعتماد امراء بھی شامل کردیے۔ غدار بہر حال غدار ہوتا ہے۔ ان سے کام تو لیا جاسکتا ہے لیکن اس پر کامل بھروسا کرنا سیاست اور مصلحت کے خلاف تھا۔ بادشاہ اس بات سے غافل نہ تھا۔

۱- میر ابو تراب — امین الملک
۲- خواجہ ابو القاسم — دیوان
۳- خواجہ نظام الدین احمد — بخشی

مذکورہ بالا تینوں امراء خاص عہدوں پر مقرر کیے گئے اس کے علاوہ ملک کو مندرجہ ذیل جاگیر داروں میں تقسیم کرکے انھیں بھی روانہ کردیا گیا۔

محمد حسین شیخ

میر ابوالفضل
میر حبیب اللہ ابو اسحاق
میر صالح
ہاشم داعی
بنیاد بیگ
سید جلال بخاری
بیگ محمد توقبائی
میر شرف الدین

"اکبر نامہ" میں ان ناموں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔

سید جلال بکھری
سید ابو اسحاق، اور
میر معصوم بکھری

"اکبر نامہ" کے مصنف نے انھیں "مجاہدان اخلاص گر" کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو خلعت اور انعام و اکرام سے نواز کر روانہ کیا گیا۔ ؎ اس اہتمام سے یہ اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ گجرات کے عوام کی مخالفت اور مغل حکومت سے نفرت کی کیا کیفیت تھی۔دس سال تک کشمکش رہی لیکن کمی نہ آئی، نہ تو اکبر جیسا طاقتور حکمراں انتظام درست کرواسکا اور نہ ہی گجراتیوں کی تالیف قلب ہوسکی۔

کشمکش، اور آزادی کے لیے جدو جہد:

اتنے بڑے اہتمام اور انتظام کے بعد بھی گجراتی اپنے قدر پر قانع نہ رہے، مسلسل لڑتے رہے ۔ "اکبر نامہ" میں ان سب معرکوں کا بیان اور تفصیل موجود ہے جو اس سر زمین میں ہوتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گجراتی جان کی پروا کیے بغیر بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے رہے۔

ہمارے ممدوح میر محمد معصوم بکھری کو ان سب معرکوں میں مغل لشکر میں نمایاں سپاہی اور جرنیل کی حیثیت حاصل تھی۔ کبھی "جرانغار" میں تلوار چلا رہے تھے، کبھی "برانغار" میں شمشیر زنی کررہے تھے۔[۵]

خواجہ نظام بخشی چوں کہ ذاتی طور پر موجود تھے اس لیے انھوں نے چشم دید واقعات وضاحت کے ساتھ لکھے ہیں۔

سروہی: گجرات جاتے ہوئے شاہی حکم تھا کہ سب سے پہلے سروہی کو سرنال دیو سے آزاد کرواکر ان کے بھائی جگ مل کے حوالے کیا جائے۔ چناں چہ گجراتی حدود میں داخل ہوتے ہیں اعتماد خان خود اس طرف گئے اور خواجہ نظام الدین احمد اور میر معصوم بکھری کو احمد آباد کی چارج (کوتوالی) میں چھوڑا لیکن جلد ہی دونوں روپے پیسے اور دوسرا سامان لے کر اعتماد خان کے یہاں پہنچے۔ خواجہ خود لکھتے ہیں "...... فقیرو میر محمد معصوم بکری ...... به او ملحق شدیم۔"[۶]

عبارت کے اس انداز سے یا جہاں جہاں خواجہ نظام الدین میر معصوم کا نام ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کی ایک دوسرے سے انسیت اور دوستی تھی[۷]۔ "اکبر نامہ" میں بھی میر کا نام اکثر خواجہ نظام الدین کے ساتھ لیا گیا ہے۔

بالاخر سروہی سر نال دیوسے لے کر ان کے بھائی جو "ازدولتِ خواہان بود" کو دے گئی۔

عبدالرحیم خان خاناں کا تقرر (۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء):

بادشاہ کا اندازہ غلط نکلا۔ لوھا لوھے کو کاٹ نہ سکا۔ گجراتی اعتماد خان کی قوت سے واقف تھے۔ اعتماد خان ناکام ہو گیا۔ شیر خاں فولادی اور سلطان مظفر خان کے حملے چاروں طرف سے شروع ہو گئے۔ اور ایسے مواقع بھی آئے کہ ملک اکبر کے تسلط سے آزاد ہوتے ہوتے رہ گیا۔

دربار میں جب ایسی رپورٹیں پہنچی۔ تو اس وقت مجبور ہو کر بادشاہ نے مرزا خان خان عبدالرحیم کو نئے انتظام اور تازہ دم سپاہیوں کے ساتھ گجرات روانہ کیا جو اسی سال (۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء) ذی الحج کی آخری تاریخوں میں گجرات پہنچے۔

جنگ اور آخری شکست (۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء)

جنگ اور مقابلے کے لیے احمد آباد سے تین کوس کے فاصلے پر سر کیچ کا میدان منتخب ہوا۔ عبدالرحیم اپنا لشکر وہیں لے آئے۔ اور مظفر خان بھی اپنی قسمت آزمانے کے لیے اپنے سب سپاہیوں کو جمع کر کے اکبری لشکر سے دو کوس دور منزل انداز ہوئے۔ [۸]

جمعے کے دن ۱۳ محرم ۹۹۲ھ (۱۶ جنوری ۱۵۸۴ء) دونوں لشکر سینہ سپر ہو کر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ جنگی دستوں کی ترتیب بیان کرتے ہوئے طبقات کے مصنف نے لکھا ہے:

> "سپہ سالار عبدالرحیم خان ...... اس تاریخ کے مؤلف (یعنی خواجہ نظام الدین) میر ابو المظفر، میر معصوم بکھری، میر حبیب اللہ اور بیگ محمد توقبائی کو متعین کیا۔ تاکہ مل کر سر کیچ شہر کے دائیں طرف پیچھے سے دشمن پر حملہ کریں......"

گویا میر معصوم اور خواجہ نظام الدین میدان میں ایک دوسرے کے ساتھ شامل رہے مقابلہ کرتے ہوئے تلواریں نیام سے نکلیں چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو گئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ لاشوں کے انبار لگ گئے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ کون مرا کون بچا کون کہاں گرا؟ کسی کو ہوش نہ تھا جو اس کا حساب کرتا۔ سب کو صرف یہ فکر تھی کہ غنیم کو کس طرح زیر کیا جائے اور دشمن کو کس طرح نیست و نابود کیا جائے۔

مقابلے کے دوران "طبقات" کے مصنف نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیچھے سے آکر اچانک مظفر پر زور دار حملہ کیا ساتھ ہی رائے درگا نے بھی عبدالرحیم کے حکم کے مطابق خواجہ کے ساتھ آکر مخالف پر حملہ کردیا ۹۔ اس اچانک اور غیر متوقع حملے نے مظفر کے پاؤں اکھاڑ دیے اور جان بچا کر میدان سے بھاگ نکلے۔ لشکر کا بڑا حصہ قتل ہوا اور باقی گرفتار ہوئے۔ ۱۰۔

اگرچہ بظاہر مظفر کی یہ آخری شکست تھی جس نے گجراتیوں کو آئندہ کے لیے مغلوں کا محکوم بنادیا اور ان کی جدا گانہ حیثیت او رملکی آزادی سلب ہوگئی۔ لیکن مظفر دل شکستہ نہ ہوا۔ اور آخری دم تک لڑتا رہا۔ اسے جب موقع ملتا مغلوں پر شبِ خون مار کر انھیں نقصان پہنچاتا۔ ۱۱۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ ملکی غداروں نے ذاتی مفادات کا شکار ہو کر مغلوں کے قدم مضبوط کردیے۔ گجرات کو گھر سے آگ لگی۔ اعتماد خان کی غداری اور وطن فروشی نے ملک اور لوگوں کو یہ دن دکھائے۔ گجرات کی تہذیب، کلچر، تمدن، ہنر، فن اور عمارت سازی نیز نشست و برخاست پر مغلوں کا رنگ چڑھتا گیا اور آخر رفتہ رفتہ سارے نقوش مٹ کر مغلوں کا حصہ بن گئے۔

یہی صورت حال پونے صدی قبل سندھ کے ساتھ تھی۔ سما سلاطین کے نا اہل ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ ماچھیانی کے بطن سے پیدا شدہ در اصل فیروز اپنے آبائی ملک سے قندھار کے مغلوں کو حملے کے لیے لے لیا۔ قاضی قاضن جیسے موقع پرست انسان نے غیروں کی جاسوسی اورپشت پناہی کی۔ وطن دوست قدم قدم پر لڑ رہے تھے لیکن گھر کی لگی ہوئی آگ کو وہ کیسے بجھا سکتے تھے۔ مقامی کالی بھیڑیں اور مخبروں نے مغل حملہ آوروں کی مدد کی وہ انھیں مقابلے کے ہر نقشے سے واقف کرتے رہے، پھر غاصبوں کو مفت کا مال ہاتھ آنے میں کون سی رکاوٹ تھی۔ سندھ کا بھی

یہی حال تھا جو گجرات کے غداروں نے اپنے وطن کے ساتھ کیا۔

سندھ گجرات کی سرحد پر تھا۔ سلاطین اور گجراتی سلاطین کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ [۱۲] اگر سندھ آزاد ہوتا اور یوں صدی سے غیروں کی غلامی میں نہ ہوتا تو گجرات اکیلے موت کے منہ میں نہ جاتا۔ اس وقت گجرات مصیبت میں مبتلا تھا اس وقت سندھ مرزا باقی (۹۷۳ - ۹۹۳) جیسے خوں خوار درندے کے ظلم اور قہر کا نشانہ بن کر موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا اور شب و روز خوف و ہراس میں گزار رہا تھا کوئی زندہ دفن تھا۔ کسی کی کھال اتاری جاتی تھی، کسی کو سر راہ بے گناہ شہید کیا جاتا تھا۔ نہ کسی کی جان سلامت تھی اور نہ عزت محفوظ۔ حتیٰ کہ عورتوں کی عزت کا بھی خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ انھیں شرمناک تکلیفیں پہنچا کر تماشا دیکھتے تھے۔ رات بسر کرنے والوں کو صبح اور صبح گزارنے والوں کو شام تک زندہ سلامت رہنے کا یقین نہ تھا۔ اس درد ناک اور بھیانک صورت حال میں گجراتیوں کے ساتھ ہمدردی کرنا مشکل ہی نہیں نا ممکن تھا۔

فتح گجرات کی خوش خبری:

اکبر کو اپنی سلطنت میں ایک نئے ملک کی شمولیت کی خوش خبری وہ بھی "بزور شمشیر" الہٰ آباد میں پہنچی۔ جس وقت وہ فتح پور کی طرف سفر کررہے تھے۔ [۱۳] فتح کی تاریخ، شیخ محمد غزنوی نے یوں کہی ہے:

فتح گجرات بعد چندین ظلمات
گردید بتو نصیب چون آب حیات
تاریخ چو جستم ز دل خردہ فروش
دل گفت: بجوز "فتح گجرات" [۱۴]

خان خاناں کا خطاب:

جس وقت گجرات کی فتح ہوئی اس وقت مرزا خان عبدالرحیم کی عمر ۲۸ برس [15] تھی۔ ان کی نوجوانی اس بات کی متقاضی نہ تھی کہ انھیں اس عمر میں مغل سلطنت کا بڑے سے بڑا خطاب [16] ملا، لیکن ملکی اور سیاسی لحاظ سے گجرات کی فتح اتنا اہم کارنامہ تھی کہ آئندہ کی فتوحات ملک گیری اور توسیع پسندی، کی پالیسی کا پیش خیمہ بنی۔ بادشاہ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ اسی لیے انھوں نے ان کے لیے "خان خاناں" کا خطاب ہی پسند کیا جو اس سے قبل ان کے والد کو عطا کیا جاچکا تھا۔ باقی سرداروں کے لیے انعامات خلعتیں اور شاہی خوشنودی کے پروانے جاری ہوئے [17]۔ ظاہر ہے کہ میر معصوم بکھری بھی انعامات کی اس بارش سے محروم نہ رہے ہوں گے۔ امیروں کے نام لے کر انعامات کی فہرست نہیں دی گئی ہے اس لیے میر معصوم کا نام علیحدہ سے نہیں آتا ہے۔

گجرات کا قیام (۱۵۸۳/۹۹۱-۱۵۸۸/۹۹۸ء):

سلطان مظفر گجراتی لائق صد آفریں ہیں کہ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک ملک کی آزادی کے لیے کوشاں رہے جب بالکل ہی نا امید ہو گئے تو محکومی کے مقابلے میں موت کو ترجیح دی۔ جب سندھ مغلوں کی ہندی سلطنت کا حصہ بنا تو انھوں نے بالآخر انتہائی مایوسی کے عالم میں خود کشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

میر معصوم ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں گجرات گئے تھے۔ فتح کے بعد عبدالرحیم خان واپس لوٹ گئے لیکن وہ خود خواجہ نظام الدین کے ساتھ مملکت کے کاروبار میں مصروف ہونے کی بناء پر آٹھ سال یہاں مقیم رہے۔ ممکن ہے کہ خواجہ نظام الدین نے انھیں یہاں قیام پر آمادہ کیا ہو۔

طبقات اکبری:

خواجہ نظام الدین احمد نہ صرف ایک سپاہی، سیاستدان اور اکبر کے معتمد اور اہم امراء میں سے تھے بلکہ ایک علم دوست، ادب پرور اور اہل قلم بھی تھے۔مغلیہ دور کی پہلی عمومی تاریخ "طبقات اکبری" ان ہی کے ذہن و فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ تاریخی لحاظ سے نہ صرف اکبری دور کی ایک اہم دستاویز ہے بلکہ مغلوں سے قبل کی پوری ہندی تاریخ پر محیط ہے۔

خواجہ نظام الدین قیام گجرات کے دوران لکھتے رہے اور اس سلسلے میں میر معصوم خاص طور پر ان کے معاون و مدد گار رہے۔ دونوں بزرگوں کی دوستی اور مودت کا ایک سبب باہمی تاریخی ذوق اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔ اس ہم آہنگی کے سبب "طبقات اکبری"[۱۸] جیسی اہم کتاب علمی دنیا کو میسر آئی۔ خواجہ نظام الدین نے میر کی مصاحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سالها به فقیر همدم و مصاحب بود..."[۱۹]

اس مصاحبت اور ہم دردی نے دونوں کو فائدہ پہنچایا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "قران السعدین" علمی دنیا کے لیے بھی اکسیر ثابت ہوا۔

جس وقت طبقات لکھا جارہا تھا اس وقت غالباً میر کو "تاریخ معصومی" کا خیال پیدا ہوا ہو گا۔ کیوں کہ سندھ کے سلسلے میں خود صاحبِ "طبقات اکبری" کو ماخذ کی کمی محسوس ہوئی ہو گی اور میر کو بھی اس کمی کا احساس ہوا ہو گا۔ گویا گجرات میں قیام کے دوران میر کو نہ صرف ملکی سیاست جنگی مشقوں اور مغل امراء کے طور طریقوں کا تجربہ حاصل ہوا اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوا بلکہ ایک کتاب لکھنے کا خاکہ بھی ان کے ذہن میں آیا۔

شعراء کے ساتھ تعلقات:

نظام الدین احمد علم دوست اورادب پرور امیر تھے - آپ جہاں بھی رہے وہاں متعدد شعراء، ادباء اور اہل علم ان کے دربار سے وابستہ رہے۔ ظاہر ہے کہ جن ادباء اور شعراء سے ان کا تعلق تھا لا محالہ میر معصوم کا بھی ان سے تعلق رہا ہو گا۔ بالخصوص گجرات کے آٹھ سال قیام کے دوران متعدد شعراء نظام الدین کے دربار سے وابسہ ہو کر آتے جاتے رہے۔ اس طرح میر کے ساتھ ان کے مراسم کا ہونا قدرتی امر تھا۔ مثلاً

۱۔ میر امانی
۲۔ بقائی ملا (مشغولی تخلص)
۳۔ حیائی
۴۔ صرفی ساؤجی
۵۔ میر شریف وقوعی
۶۔ ملاحالتی
۷۔ ملا امینی یا امین (خوافی)
۸۔ ملا لطفی منجم
۹۔ ملا عبدی رازی
۱۰۔ ملا حیفی ساؤ جی [۲۰]۔
۱۱۔ عہدی شیرازی

اس علمی و ادبی ماحول نے میر کی آئندہ زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ صلاحیت اور استعداد پہلے سے موجود تھی۔ فقط مہمیز کی ضرورت تھی۔

گجرات میں میر صاحب جب تیر اور تلوار سے تنگ آجاتے تھے تو شعر کہہ کر دل بہلاتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی صاحب "منتخب التواریخ" جیسے سخت گیر، دینی مزاج کے حامل اور اپنے

دور کے ماحول سے بیزار سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ جو میر کی خوش مزاجی اور اعتدال پسندی کی واضح دلیل ہے۔ میر جس وقت احمد آباد میں مقیم تھے۔ اس وقت انھوں نے وہاں سے ایک منقبت منظوم کرکے ملا بدایونی کی خدمت میں روانہ کی۔ جو اس وقت اٹک میں قیام پزیر تھے۔ منقبت کا مطلع یہ ہے:

داغی کہ بود بر دلم از عشق در ازل
از دولتِ فراق تو با درد شد بدل [۲۱]

حوالہ جات

۱۔ یہ سال فرشتہ نے لکھا ہے ۲: ۴۵۱

۲۔ یہ حالات "اکبر نامہ"، مآثر رحیمی" اور "طبقات" (۲:۲۴۴-۲۵۹) سے لیے گئے ہیں۔ "مرات سکندری" اور "مرات احمدی" کو بھی دیکھنا چاہیے۔ "طبقات" میں ہے کہ: چون اعتماد خان دید کہ کاری از پیش نمی رود، عرضداشت به حضرت خلیفه الهی فرستاده ترغیب تسخیر گجرات نمود. (۲:۲۵۹)

۳۔ "طبقات" کے مصنف نے ۹۹۱ھ (۲۹ سال الہی) کے واقعات میں لکھا ہے: درین ولا به خاطر اشرف رسید که چون اعتماد خان سالها حکومت گجرات کرده بود، طریق آباد انی از دیگران بهتر می دانسته باشد و چون گجرات به اوعنایت شود، سبب امید واری حکام بلادی که در تصرف نیست، میشود. بنا بران حکومت گجرات را به اعتماد خان مرحمت فرمودند. (۲: ۳۶۸)

۴۔ اکبر نامہ (۳:۴۰۳)۔ "وهر کدام به گرامی خلعت و گزیده بارگی سر بلندی یافت، و گونا گون اندرزها آویزۂ گوش هوش آمد."

۵۔ اکبر نامہ، ۳:۴۰۳، ۴۱۱، ۴۱۹، ۴۲۴، ۴۳۰، ۴۳۷، ۵۲۴، ۵۳۰، ۵۳۱

۶۔ طبقات ۲:۳۷۰

۷۔ طبقات ۲ : ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۶، ۳۸۲، ۳۸۵، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹ میں کبھی اپنے ساتھ کبھی دوسرے امراء کے ساتھ بھی شامل دکھایا گیا ہے۔

۸۔ "مرات سکندری" (۴۶۴) میں اس جنگ کی تفصیل اس

طرح ہے:

سلطان (مظفر] متوجه احمد آباد شده تاریخ ششم شهر محرم الحرام سنه اثنی وتسعین و تسع مائه در شهر احمد آباد آمد وروز دو شنبه تاریخ نهم شهر مذکور از شهر بر آمده در ناحیه موضع محمد نگر- که بریك کروهی شهر احمد آباد واقع است- رفته مقیم گشت. روز سه شنبه آنجا مقام نمود، روز چهار شنبه نواب میرزا خان آمده سر کیچ را دست چپ داده نزدیك به آب سانبرا جلال نمود، وسلطان نیز از محمد نگر کوچ کرده از آب گذشته قریب به روضه منوره شاه بیکن ابن حضرت شاه عالم فرود آمد . روز پنجشنبه طرفین مقام نمود ند.

آخر میں لکھا ہے:

روز جمعه تاریخ سیز دهم شهر محرم سنه مذکور (۹۹۲ھ) هر دو لشکر صف کشیده جنگ کر دند، حق تعالیٰ باب فتح بر ناصیه دولت نواب میرزا خان کشاد، سلطان هزیمت یافته به کنبایت رفت. (۳۶۴)

۹۔ ...هنوز مظفر گجراتی با میرزا خان مقابله داشت که مؤلف تاریخ با یارانِ خود اتفاق کرده از عقب رسیده، غنیم را برداشت ورای دِرگا نیز از جرانغار به فر مودۀ میرزا از عقب مایان رسیده... (طبقات).

۱۰۔ ”مرات احمدی“ (۱۵۳) میں ہے کہ تقریباً مظفر کے دو ہزار سپاہی میدان میں تھے اور پانچ سو کے قریب گرفتار ہوئے انھیں بھی قتل کردیا گیا۔

۱۱۔ دیکھیے طبقات ، ۲: ۳۷۷ کے بعد کے صفحات

۱۲۔ دیکھیے ”مکلی نامه“ میں دیے ہوئے شجرے اور تحفة الکرام کے فارسی ایڈیشن، ص: ۱۱۰

۱۳۔ طبقات ۲:۳۷٦

۱۴۔ رحیمی، ۲: ۲۳۸

۱۵۔ تولد ۱۴ صفر ۹٦۴، ۱۷ دسمبر ۱۵۵٦ بروز جمعرات۔

۱٦۔ مغل بادشاہت میں تین انتہائی بڑے خطاب تھے۔ خان خاناں، خان اعظم اور امیر الامرا

۱۷۔ طبقات ۲:۳۷٦

۱۸۔ ”نظامی“ (۱۰۰۱ھ) سے تکمیل کی تاریخ نکلتی ہے۔

۱۹۔ طبقات ۲:۵۰۰

۲۰۔ دیکھیے ”طبقات“ ج ۳ ”بدایونی“ ج ۳ ”تذکرہ جہانگیری مطربی“۔ نظام الدین ہروی مقالہ حسام الدین مجلہ جام جم کراچی اکتوبر ۱۹٦۷ء فرہنگ مخنوران خیام پور۔

۲۱۔ مکمل منقبت شاعری کے باب میں آئے گی۔
(بدایونی :۳:۳٦٦)

باب ۔ ۱۲

گجرات سے لاہور روانگی

۹۹۶ھ/ ۱۵۸۶ء اعظم خان، اعتماد خان کی جگہ گجرات کے صوبہ دار ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۹۹۸ھ/۱۵۸۸ء میں خواجہ نظام الدین کا بھی وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ اکبر لاہور میں مقیم تھے۔ اس لیے انھیں وہاں پہنچنے کا حکم ملا۔

۳۵ سال جلوس ۱۴ جمادی الاول ۹۹۸ھ، بدھ سے شروع ہوا۔ خواجہ نظام الدین نوروز کے تیسرے دن (۱۶ جمادی الاول ۹۹۸ھ) لاہور پہنچے۔ طبقات میں ہے کہ چھے سو کوس کی مسافت تھی جسے انھوں نے بارہ دن میں طے کیا۔[۱]

میر معصوم کی آمد ۹۹۸ھ/۱۵۸۸ء:

اس وقت میر معصوم بھی اس قافلے کے ساتھ لاہور پہنچے۔ شاہی حضور میں پیش ہوئے۔ اگرچہ اس قافلے کی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن عبارت کے انداز (هم درین ایام) سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔[۲]

والدہ کی طرف سے تحائف:

آپ، نظام الدین کے ساتھ وابستہ تھے ظاہر ہے کہ جب نیا انتظام ہوا اور نئے لوگ آئے تو عملہ بھی اپنی پسند اور مرضی سے لے آئے۔

میر کے واپس آنے کی اطلاع ان کی والدہ کو بکھر میں پہنچ گئی تھی۔ جنھوں نے اپنے بچھڑے ہوئے فرزند کے لیے بکھر سے کچھ تحفے تحائف پہلے سے بھیج دیے تھے۔ میر صاحب جیسے ہی لاہور پہنچے تو ظاہر ہے انھوں نے سب سے پہلے اپنے گھر اور وطن

کا احوال معلوم کیا ہو گا۔ اور والدہ کے بھیجے ہوئے تحائف آنکھوں پر رکھے ہوں گے۔ انھوں نے سوچا کہ ان میں سے کچھ تحائف اگر بادشاہ کی خدمت پیش کیے جائیں تو بے جا نہ ہو گا۔ بلکہ وہ تحائف شاہی دربار میں ان کی سرخ روئی اور خوشنودی کا باعث بنیں گے۔ جب مناسب موقع آیا تو انھوں نے وہ تحائف پیش کرتے ہوئے حقیقت عرض کی۔ بادشاہ نے بکمال بندہ نوازی نہایت شفقت و عنایت سے وہ تحائف قبول کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ والدہ سے جدا ہوئے تمھیں کتنے برس ہو گئے؟۔ میر نے عرض کی، جہاں پناہ! بیس برس ہوچکے ہیں۔ ۳۔ اکبر نہایت نرم مزاج اور غیر معمولی عظمت کے حامل تھے نجی زندگی میں ان جیسا شریف النفس اور مہربان کوئی مغل شہنشاہ نہیں ہوا۔ انھوں نے نہ صرف تحفے قبول کرکے ان کی عزت افزائی کی بلکہ انھیں اجازت دی کہ اپنے گاؤں جا کر والدہ سے ملیں۔ میر تقریباً ۲۰ برس کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ روز سوم نوروز مؤلف تاریخ با جمعی شتر سوار به طریق ایلغار ششصد کروه راه را در دروازه روز طی کرده شرف زمین بوسی دریافته، مورد مراحم خسروانه شد. (۲:۰ ۴۱)

۲۔ هم درین ایام فقیر مؤلف تاریخ (معصومی) از گجرات آمده به ملازمت بند گان حضرت مشرف شد. (معصومی: ۲۵۱)

۳۔ از اتفاقات حسنه والدهٔ فدوی تحفه فرستاده بود ند، به نظر اشرف انور گذرا نیده. حضرت از کمال توجه و اشفاق التفات فرمودند که: چند سال است که از والده جدا شده اید؟ فقیر عرض کردم که قریب به بیست سال باشد! (معصومی، ص ۲۵۱)

(۳۱۔۳۔۱۹۷۸ء)

باب ۔۱۳

سندھ پر یلغار

خان خاناں پہلے ہی شاہی دربار میں لاہور میں موجود تھے۔ میر معصوم کے پہنچنے کے بعد بادشاہ کو سندھ یاد آیا۔سلطان محمود کی وفات کے بعد بکھر مغلوں کے زیر تسلط ہو گیا تھا۔ زیرین سندھ بچا ہوا تھا جو مرزا باقی کی خود کشی (۹۹۳ھ) کے بعد ان کے پوتے مرزا جانی بیگ کے قبضے میں تھا۔

جاگیر ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۸ء:

اکبر نے زیریں سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے خان خاناں میرزا عبدالرحیم کو منتخب کیا۔ اور انھیں ہر طرح کی تیاریاں کرنے کا حکم ملا۔ بکھر کا علاقہ انھیں بطور جاگیر میں دیا گیا۔

ادھر میر معصوم نے جب شادی کی اس وقت ان کی جاگیر کا مسئلہ پیدا ہوا۔ محمد صادق خان کی رائے تھی کہ چوں کہ میر کا وطن بکھر ہے اس لیے مناسب یہی ہو گا کہ انھیں اس علاقے میں سے جاگیر عنایت کی جائے۔ رائے مناسب تھی لیکن سارا علاقہ خان خاناں کے نام مخصوص ہوچکا تھا۔ اس لیے بادشاہ کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ ایک دفعہ ایک حکم دے کر پھر اسے تبدیل کرلے۔ بہر حال اس مشکل کو خان خاناں نے خود ہی حل کردیا وہ بکھر کے بجائے کوئی اور جاگیر لینے پر راضی ہو گئے۔ اس طرح معاملہ آسان ہو گیا ۔ میر کو بکھر سرکار میں سے تین پر گنے بطور جاگیر دیے گئے دربیلا۔ کاکڑی اور چانڈ کا۔(چانڈ کا۔ موجودہ ضلع لاڑکانہ)اور اس کے بجائے خان خاناں کو بکھر جاگیر میں اور حصے شامل کیے گئے۔ یہ فرمان شوال ۹۹۸ھ میں صادر ہوا۔

خان خاناں کی روانگی، ۱۴ صفر ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء:

زیرین سندھ کا علاقہ عرصے سے اکبر کے ذہن میں تھا لیکن چوں کہ بنگال، بہار، گجرات اور کشمیر کی اہم مہمات پہلے سے درپیش تھیں۔ خان خاناں، اپنی فتوحات کے باعث کافی شہرت پاچکے تھے اور اتفاق سے فارغ بھی تھے اس لیے ان سے بڑھ کر اور کون شخص یہ کام بہتر سر انجام دے سکتا تھا۔

اس سے پہلے بادشاہ محمد صادق خان [۱] کو لشکر دیکر سندھ کی فتح کے لیے روانہ کیا گیاتھا۔ لیکن رسوا کن شکست ان کا مقدر بنی۔ ان کا توپ خانہ تباہ ہوا۔ سیکڑوں سپاہی مارے گئے جو بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور آخر میں وہ خود بھی میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ مآثر رحیمی کے مصنف نے اس شکست کا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے۔ [۲] بادشاہ کو اس شکست اور خواری کا انتقام دل میں رہ رہ کر کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا علاوہ ازیں کافی عرصے سے وہ لاہور میں مقیم تھے جہاں دور و نزدیک کے سب امراء آکر پیش ہوئے تھے۔ صرف ایک جانی بیگ تھے جنھوں نے خوش آمدید اور وفاداری کی یقین دہانی کی عرضی پر اکتفا کر کے بادشاہ کے غصے میں اور اضافہ کردیا تھا۔ اس لیے بادشاہ نے اب پہلی فرصت میں سندھ کا مسئلہ طے کرنا ضروری سمجھا اور اس طرف متوجہ ہوئے۔

مرزا جانی کی بہادری اور ملک کی دفاعی قوت اور تربیت سے مغلوں کی مرکزی حکومت اتنی متاثر تھی اور ہند امراء کے دلوں میں ان کا اتنا خوف طاری تھا کہ تازہ فتوحات میں جن جرنیلوں نے شہرت حاصل کی یا بہادری دکھائی تھی۔ ان سب کو سندھ کی فتح کے لیے مقرر کیا گیا۔ جیسا کہ مآثر رحیمی کی تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے۔ [۳]

الغرض "ولایت دلپسند سند" کو ہندستانی حکومت کا ضمیمہ بنانے کے لیے روانہ کیا گیا۔

"...در ماہ ربیع الثانی سنہ تسع و تسعین تسع مائۃ...

خانخانان را با جمعی دیگر از امرای نامدار مثل ...
رخصت کردند۔"[۴]

روانہ ہونے کی تاریخ پر مصنفین کو اختلاف ہے۔ میر معصوم نے ایک جگہ پر لکھا ہے:

"در تاریخ ۲۱ شوال سنہ مذکور (۹۹۸ھ) میان خریف بہ بکر آمدہ بہ مہمات و معاملات پر داخت۔"[۵]

مآثر رحیمی مصنف خان خاناں کا سرکاری سوانح نگار تھا وہ خان خاناں کے خاصہ خیل پہنچنے کا یہی مہینہ اورسال لکھتے ہیں:

"بہ تسخیر تتہ و تادیب میرزا جانی مقرر نمودند و بہ تاریخ شوال سنہ مذکور (۹۹۸ھ) میان خریف خاصہ خیل سپہ سالاری بہ ضبط بکر آمدہ بکر را بہ ضبط خود در آوردہ ...[۶]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"این سپہ سالار میان خریف خاصہ خیل خود را بہ ضبط بکر فرستاد۔"[۷]

مذکورہ بالا تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوال ۹۹۸ھ خان خاناں نے کچھ اپنے لوگ پہلے ہی روانہ کردیے تھے جو ۲۲ تاریخ خریف کی پیداوار سمیٹنے اور جمع کرنے کے لیے پہنچے تھے۔ اور خود کچھ وقت کی تیاری کے بعد ۹۹۹ھ لاہور سے نکلے ان کی روانگی کی تاریخ فیضی نے - قصد تتہ / (۹۹۹ھ) - سے نکالی۔

بکھر میں آمد ۱۴صفر ۹۹۹ھ:

ہم پہلے ہی طبقات اور بدایونی کے حوالے سے خان خانان کی روانگی کا مہینہ ربیع الثانی ۹۹۹ھ رقم کرچکے ہیں۔ جس میں مؤرخین سے غلطی کا احساس ہوتا ہے شوال ۹۹۸ھ میں خان خانان کے لوگ بکھر آئے اور خود مآثر رحیمی کے قول کے مطابق ۱۴ صفر ۹۹۹ھ[۸] یعنی تین مہینے کے بعد بکھر پہنچے۔

میر معصوم بھی اس وقت بکھر پہنچے جیسا کہ خود رقم طراز ہیں "......الغرض که به تاریخ ۱٤ صفر ۹۹۹ھ به بکر رسید ......" دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:ونواب خانخانان نیزبه بکر تشریف آوردند چون هوا گرم بود و طغیان آب، چند روز در بکرتوقف فرمودند ." ۹۔ خریف کا موسم تھا آب کلانی کازمانه اور بکھر کی گرمی ، سیلاب اس کے علاوہ، اس لیے خان خاناں فی الحال چند دن کے لیے بکھر میں ٹھہر گئے۔ اور دوسرے امراء کو سندھ کے اہم محاذوں کے دفاع پر روانہ کردیا۔

لاہور سے روانگی کا اہتمام:

اکبر بادشاہ نے جس طور طریقے سے خان خاناں کو لاہور سے رخصت کیا اس کی روداد سے اس مہم کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے سفر دریائے راوی کے ذریعے کشتی سے ہوا۔ بادشاہ خود دریا کے پتن پر خان خانان کو خدا حافظ کہنے آئے۔ مآثر رحیمی کے مصنف لکھتے ہیں:

> "به تاریخ نهصدونود و نه به اعزاز وشوکت هرچه تمام تر از دارالسلطنت لاهور از خلیفه الٰهی مرخصی شده بیرون خرامید." ۱۰۔

اسی "بیرون خرامید" کے وقت خان خاناں کے اعزاز و اکرام کا ایسا غیر معمولی اہتمام کیا گیا کہ بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ رخصت کرنے آئے:

> "حضرت ظل الاهی وجمیع ارکانِ دولت و عیان سلطنت به بدرقهٔ این سپه سالار بیروَن آمدند و چند کشتی و غراب ترتیب یافت که به آب راوی از لاهور به سند می رود، روانه شدند." ۱۱۔

جب ظل الٰہی خود راوی تك آئے تو کون سا امیر پیچھے ہوگا سارے درباری لوگ (جمیع امکان دولت و اعیان سلطنت) آکر

حاضر ہوئے۔ گویا اس اہتمام اور اس احتشام سے سندھ کو زیر کرنے کے لیے پنجاب کی سرزمین سے تیاریاں ہوئیں اور فاتح سندھ اپنی نئی مہم پر تیاریاں کر کے روانہ ہوئے۔ متعدد دانشور اور شعراء ان کے ساتھ تھے فیضی کی تاریخ اوپر درج کی گئی ہے۔ یولقی بیگ انیس نے فتح پر طویل قصیدہ کہا ہے جس میں انھوں نے اس سفر کی روداد بھی لکھی ہے۔ روانگی کی تاریخ کا شعر ہے ؎

بفتح تتہ و تاریخ این قصیدہ، قضا
نوشت: تسعمائہ بعد تسع و تسعین [۱۲]

میر معصوم کی روانگی ۱۴ صفر ۹۹۹ھ:

رحیمی کے مصنف نے لکھا ہے کہ دو امراء کے ساتھ میر معصوم کو بھی روانہ کیا گیا [۱۳] جس صورت میں انھیں والدہ سے ملنے کی اجازت مل چکی تھی لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ بادشاہ کو مرزا جانی کی بے پروائی پر غصہ تھا اور موقع پر خان خاناں کی لشکر کشی بھی عمل میں آئی۔

میر معصوم نے جس انداز سے بکھر پہنچنے کا ذکر کیا ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خان خاناں کے ساتھ گئے تھے۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ بکھر روانہ ہوئے لیکن میر صاحب نے سپہ سالار کے مقابلے میں اپنی آمد اور اپنی پذیرائی کو اہمیت دی ہے اپنی آمد کا ذکر اہتمام سے کیا ہے خان خاناں کی آمد ایک ضمنی یا اضافی واقعے کے طور پر اہم الفاظ میں تحریر کی ہے۔ واقعات کی ترتیب اور اصل عبارت اس طرح ہے کہ جاگیر حاصل ہونے کے بعد حضرت (بادشاہ) نے مرحمت کی انتہا اور کمال بندہ نوازی کرتے ہوئے کشتی تک تشریف لائے۔ اور پوستین خاص سے سرفراز فرماتے ہوئے بندہ کو رخصت کیا کہ تشریف رکھیے، سفر انتہائی خوشگوار گزرے گا:

"بنشین و سفر کن کہ بغایت خوبست! [۱۴]

اس کے بعد میر صاحب نے اپنی آمد کی یہی تاریخ لکھی ہے جو خان خاناں کے پہنچنے کی ہے یعنی ۱۴ صفر ۹۹۹ھ خان خاناں کے متعلق لکھتے ہیں: "ونواب خان خانان نیز بہ بکر تشریف آوردند۔" لاہور سے روانہ ہوتے وقت شاہانہ رخصت وغیرہ کے سلسلے میں انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ حالانکہ مآثر رحیمی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ خان خاناں کو رخصت کرنے آئے تھے۔ میر صاحب بھی چونکہ اسی کشتی میں سوار ہورہے تھے اس لیے ان کی خدمات کے پیش نظر اور بیس برس کے بعد اپنے گاؤں جانے کے سبب ان کی دلبری کرنا بھی مناسب خیال کیا۔ ظاہر ہے کہ دوسرے بھی کئی امراء اس قافلے میں تھے، لیکن مآثر رحیمی نے خان خاناں کے سوانح نگار کی حیثیت میں اپنے ممدوح کا ذکر کیا اور میر معصوم نے اپنی تاریخ میں اپنی پذیرائی کو اہمیت دی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بادشاہ نے دوسرے امراء سے بھی سلام کلام کیا ہوگا بہر صورت اس میں کوئی شک نہیں کہ رخصت ہوتے وقت اکبر جیسے عظیم بادشاہ کی میر معصوم پر یہ عنایت معمولی بات نہیں تھی بلکہ قطعی غیر معمولی اور واقعی بڑے افتخار کا سبب تھی۔

اس طرح رخصت ہو کر کشتیاں اور غوراب، ......ساتھ لے کر راوی کے بہاؤ میں "ولایت دلپسند سند"، کی تسخیر کے لیے خان خاناں کے ہم رکاب ہو کر میر معصوم بھی روانہ ہوئے۔

یوالقی بیگ اپنے طویل قصیدے کے ابتدائی ابیات میں اسی سفر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

تاسمند رایش از لاھور عزم سند کرد
همچو موسیٰ بر کفش از لطف شد چوب شبان
چون سحاب، اندرلب دریای راوی خیمه زد
آن نهنگِ هفت دریا دیو بند هفت خوان

همچو دریا شد روان بهر و داعش هر که بود
از خدیو هفت کشور تا امیر و پاسبان
با مقیمان دیار از بس هوای خدمتش
گفتی، این ساحل به همرا هیش خواهد شد روان
شد مرتب کشتیِ ای بهر نشستن کزشرف
نیز آن کشتی نزیبد جز در فش کاویان

سفر میں دس بارہ دن لگے قافلہ راستے میں کہیں نہیں رکا۔ اگرچہ سلتان اور آس پاس کے علاقے خان خاناں کی جاگیر میں تھے لیکن وہ کہیں بھی متوجہ نہ ہوئے۔اور سیدھا بکھر آپہنچے۔[۱۵]

میر معصوم بکھری اپنے قول کے مطابق بیس برس کے طویل عرصے کے بعد وطن لوٹے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بکھرسے تقریبا ۹۷۹ھ میں ہندوستان گئے تھے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ص:۱۱۸) بیان کیا گیا ہے۔

اس طویل غیر حاضری کے دوران ان کے اپنے وطن یا اپنے خاندان میں کئی واقعات ہوچکے تھے۔ مثلاً ان کے والد (۹۹۱ھ) میں فوت ہوئے، ان کے بھائی ابوالقاسم نے بھی اسی سال(۹۹۱ھ) وفات پائی۔ سلطان محمود نے اگر ان کے اپنے قول کے مطابق حساب لگایا جائے تو ان کی غیر حاضری میں (۹۸۲ھ) وفات پائی تھی اور مرزا باقی ترخان نے اپنی خوں خواری اور درندگی سے وحشت زدہ ہو کر دماغی توازن کھو بیٹھنے کے بعد خود کشی کرلی تھی۔ اور ان کا پوتا مرزا جانی زیریں سندھ کا والی تھا جس کے ساتھ جنگ کرنے اور سندھ کو ہندستان سے ملانے کی اسکیم پر عمل درآمد کرنا میر کی وطن واپسی کے اہم مقاصد میں سے تھا۔ مرزا جانی کو تخت نشین ہوئے سترہ برس گزرچکے تھے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مرزا باقی اگرچہ مغلوں میں سندھی بچہ سمجھا جاتاتھا کیوں کہ وہ "سندھی بطن" سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن اہل سندھ نے اپنے اس بیٹے سے خدا خدا کر کے جان

چھڑا کر اطمینان کی سانس لی تھی ۔مرزا جانی اگرچہ اخلاقی کمزوریوں میں شرمناک حد تک مبتلا تھے [16]۔ تاہم طبعاً وہ نرم اور مہربان مزاج حکمراں تھے اس کے علاوہ سندھی قبائل سے رشتہ داری قائم کرنے کے بعد سندھ کو آبائی وطن کی طرح بنا چکے تھے۔ اور سندھ کے باشندوں کو غیر نہیں بلکہ اپنا عزیز سمجھ کر ان کے ساتھ اپنوں جیسا سلوک کرتے رہتے تھے جب آسیر (خاند یش) میں فوت ہوا تو وصیت کے مطابق ان کی لاش مکلی پر لا کر دفن کی گئی۔ انھوں نے ارغونوں کی طرح نہیں کیا کہ اہل سندھ کا خون چوستے چوستے اور بہاتے بہاتے انھیں جب موت آئی تو انھوں نے اس سر زمین سے اتنی دلچسپی بھی ظاہر نہ کی کہ یہاں دفن ہی ہوجاتے۔

حوالہ جات

۱۔ نورجہاں کا بہنوئی اور خواجہ محمد طاہر و صلی کا بیٹا وفات ۱۰۴۳ ہجری دیکھیے نسب نامہ پدری نور جہاں، مظہر شاہ جہانی۔

۲۔ "پادشاہ را ہوای تسخیر ولایت سند در خاطر بود بہ انتقام آنکہ محمد صادق خان را با فوجی عظیم بہ تسخیر آن ولایت (سند) فرستادہ بودند، و میرزا جانی ترخانی والی آنجا را راہ صواب گم کردہ بہ محار بہ ومقابلہ در آمدہ. از ان جا کہ زبونی محمد صادق خان بود وازر ھگذراین کہ خلاف و نقاق باطنیت او مخمر بود واین قسم ذات ہرگز موفق ومنصور نمی گردد، تاب مقاومت با میرزا جانی نیاوردہ شکست یافت و ملک گیری را بہ گریز و شکست قرار داد واکثری از ملازمان و منصب داران پادشاہی را درین سفر بہ کشتن داد وخزانہ وتوپ خانہ- کہ با اوبود- تمامی رابہ دشمن سپردہ نیم جانی بہ تگ پا از میانۂ سندیان بہ صد ننگ وعار بد رآورد. وھیچ یك از امرا را شایستۂ این مہم وشایان این امر خطیر نمی دانستند کہ چنانچہ باید و شاید تلافی و تدارك این بی ادبی از میرزا جانی بکند چرا کہ میرزا جانی از دلاوران روز گار بود، ودر سرحد نشان ممالك محروسہ مثل وی پیدانمی شد و بہ کثرت خدم و حشم نیز مشہور و معروف بود. وبہ تد بیر و کار دانی نیز بی نظیر و ہمال بود. بارھا معارك برہم زدہ ودستبرد ھا نمود ہ بود. واھل سند و طبقۂ ارغون نیز بہ غایت دلاور و شجاع ونامدارند. واز شکست دادن محمد صادق خان نیز- کہ بہ سابق رفت - باد نخوت وغرور بہ کاخ دماغ خود راہ دادہ بودند.

خلیفه الٰهی صاحب صوبگی و حکومت گجرات را به خان اعظم عنایت نموده این سپه سالار (خان خانان) را به گرفتن ولایت دلپسند سند وبه دست در آوردن میرزا جانی فرمان دادند۔" (رحیمی ۲: ۲۴۵-۲۴۶)

۳۔ چون محمد صادق خان به در باررفته زیادتی و غلبه میرزا نسبت به محمد صادق خان بر ضمیر انور پر تو افگن شد، ناموس سلطنت و اسالت چنان اقتضا نمود که تنبیه و تادیب میرزا جانی و بلوچان سند نماید. بنا بر این مطلب سپه سالار را از ولایت گجرات که به تازگی فتح نموده بود، طلب داشته بکر و ملتان و آن نواحی به جاگیر ایشان مقررشد که سند رفته و میرزا جانی را به دست در آورد و سند را فتح نماید. (رحیمی ۲: ۳۴۵)

۴۔ بدایونی ۲: ۳۷۴ طبقات ۲: ۴۱۲۔ اگر ربیع الثانی ۹۹۹ھ میں نکلے تو صفر ۹۹۹ھ میں کیسے پہنچے اس لیے صاحب طبقات نے مہینہ غلط دیا ہے۔ جو آگے آئیگا۔

۵۔ معصومی، ص: ۲۵

۶۔ رحیمی، ۲: ۳۴۲

۷۔ رحیمی ۲: ۳۴۵

۸۔ ..."وخان خانان به تاریخ چهار دهم صفر نهصد ونود و نه به بکر آمده ابواب معدلت برروی رعایا ی آنجا کشادند۔" (رحیمی ۲: ۳۴۲)

۹۔ معصومی ۲۵۱

۱۰۔ رحیمی ۲: ۳۵۷

۱۱۔ رحیمی ۳۵۷

۱۲۔ مکمل قصیده رحیمی ۳: ۵۲۱ میں اور تحفة الکرام ۳: ۱: ۳۶۲ میں دیکھیے۔

۱۳۔ جمعی از اُمرای نامی... میرمعصوم خان بکری و دیگر امرا به

کمك و مدد مقرر گشتند و در ملازمت این خدیو کامگار روانه شدند. (۲۰:۲۵۷)

۱۴ے بعد از تشخیص جاگیر حضرت از کمال مرحمت و بنده پروری بر سر کشتی تشریف شریف ارزانی داشتند و به پوستین خاصه سر افراز ساخته، بنده را رخصت فرمودند ... واز زبان الهام بیان فرمودند که: بنشین! وسفر کن که به غایت خوب است!... (۲۵۱)

۱۵ے ...چون از دارالسلطنت لاهور بر آمدند، باآنکه ملتان و آن حدود دیگر به جاگیر ایشان مقرر بود، به هیچ چیز و هیچکس مقید نشده رفتن را ساعی بودند. (رحیمی ۲:۳۵۹)

۱۶ے دیکھیے تحفة الکرام فارسی (حسام الدین) ص ۳۱۰، تاریخ طاہری کے حوالے میں یہ عبارت اس طرح آئی ہے:

میرزا از اطوار شایسته و افعال پسندیده خودباز گشت و چنین چیز های نا هموار و نالایق، شیوه و شعار خویش ساخت که، علانیه به اغلام پیشه بی اندیشه گردیده، پسر ان خوبصورت را بهر بد سیرت نگاه نمودن گرفت. چنانچه بعضی از خانه های سترگ و سلسلهای بزرگ بل سید زاده مهین نسب - که نام ایشان اظهار و اشکار داشتن از ادب دور است - اما مردم آن ملك می دانند، آنرا دست برنجن ولباس از بهر انوست خاطر داده، درون بجایِ عورات نگاه داشت. ازین فعل زشت - که لائق حکام وقت نیست - هر که استماع داشت بی اختیار استغفار و استغفار گفته، انگشت آوخ به دندان دریغ کرده...“

”مرزا نے اچھے اطوار اور شایسته افعال چھوڑ کر اس حد تك غلط کام شروع کیے که کھلم کھلا اغلام بازی پر اتر آئے۔

خوب صورت لڑکوں کو غلط کاری کے لیے اپنے یہاں رکھتے تھے اور کئی بڑے خاندانی بلکہ سید زادوں کے گھروں سے جن کے نام ظاہر کرنے سے شرم آتی ہے سب کو ان کے افعال کا علم تھا۔ ان لڑکوں کو کنگن پہنا کر اور زنانہ لباس زیب تن کروا کر اپنے شوق کے لیے زنان خانوں میں ٹھہراتے تھے۔ ان کی یہ بد افعالی دیکھ کر لوگ توبہ و استغفار کرتے تھے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تاریخ طاہری کے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے اپنے والد کی زبانی روایات اور ان کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔ در حقیقت ما وراء النہر سے آئے ہوئے قبائل نے سندھ میں اس کمینگی کو رواج دیا۔ کیوں کہ وہاں یہ عادات عیب شمار نہ کی جاتی تھیں۔ چنانچہ تاریخ و تذکرے اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جانی بیگ کے سلسلے میں کچھ کہاوتیں مشہور ہیں۔ جن سے ان کی بد کرداری ظاہر ہوتی ہے۔ ارغون اور ترخان یا ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کی جہاں جہاں کالونیاں بنیں وہاں کے شہر اخلاقی طور پر خراب اور تباہ ہو گئے۔

باب - ۱۴

لاوارث سندھ پر غیروں کی یورش

سندھ میں جب خان خاناں کا لشکر پہنچا اور میر معصوم بھی بکھر کی سر زمین پر پہنچ گئے تو اس وقت خان خاناں اپنی مہم سر کرنے کی فکر میں مصروف ہو گئے لیکن میر معصوم نے ظاہر ہے سب سے پہلے اپنی والدہ کی قدم بوسی کی ہو گی- والد اور بھائی کی قبروں پر فاتحہ پڑھی ہو گی اور خاندانی رسم و رواج میں شرکت کی ہو گی- بہر حال یہ سب کچھ تیزی سے مکمل کر کے خان خاناں کے لشکر میں شامل ہو گئے کیوں کہ شاہی فرمان پہلے مقدم تھا- اور بعد میں دوسرے کام- اس لیے میر معصوم دوسرے چند امراء کے ساتھ سیہون روانہ ہوئے-[۱]

جنگ شروع ہوتے ہی سندھ کے کونے کونے سے مقابلے اور معرکے کا آغاز ہو گیا- مرزا عبدالرحیم خان خاناں اپنے وقت کے مانے ہوئے سپہ سالار تھے بلکہ انہیں اکبر کے "ترکش" کا آخری "خدنگ" کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا وہ فن حرب، لشکر کشی کے اور ملک گیری کے داؤ پیچ سے اچھی طرح واقف تھے- حال میں کئی ممالک فتح کرچکے تھے اس لیے ہند اور سندھ میں ان کی دلیری اور فنی قابلیت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی-

سندھ کے سلسلے میں تو اکبر نے خاص احتیاط اور اہتمام کیا تھا اور ان کے ساتھ دوسرے کئی منتخب امراء، فوجی ماہرین اور بہادر جنگجو شامل تھے- جنھوں نے کئی معرکے سر کیے تھے- ان میں سے ہر ایک کے ساتھ سرکاری لشکر کے علاوہ اپنے دستے بھی ہم راہ تھے-

تاریخ میں کچھ امراء کے نام آئے ہیں- جن کے مطالعے سے مہم کی نزاکت اور اکبر کے ذہن میں سندھ کے مسئلے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱) شاہی بیگ خان کابلی
۲) سید بہاء الدین بخاری
۳) فریدون برلاس
۴) شیر خان
۵) جانش بہادر
۶) بختیار بیگ
۷) قرا بیگ ترکمان
۸) محمد خان نیازی
۹) خواجه محمد مقیم خان بخشی
۱۰) رستم سلطان
۱۱) گوردھن راول
۱۲) بھیم درپت
۱۳) بہادر قور دار
۱۴) علی مردان خان بہادر
۱۵) بلب دھر راٹھور
۱۶) حسن علی عرب
۱۷) خواجه حسا م الدین
۱۸) سید درویش
۱۹) قاسم خان کوکه
۲۰) خاکی گله بان
۲۱) نور محمد
۲۲) خواجه خضری
۲۳) عبدالغنی
۲۴) الغ بیگ
۲۵) سال النگی
۲۶) خاکی بیگ
۲۷) سید میر علی
۲۸) میرزا بیگ سالار قلی
۲۹) میرزا محمد
۳۰) سیدبنده علی
۳۱) ابراہیم بیگ
۳۲) مرشد قلی چولك
۳۳) شمشیر بیگ
۳۴) محمد زمان باقی چہار دانگی
۳۵) عبداللطیف
۳۶) بہادر ملك
۳۷) عزت علی کابلی
۳۸) الله بردی تولکچی
۳۹) الیاس توبچی
۴۰) محمد قلی تنگری بردی
۴۱) فرخ بیگ
۴۲) قلی محمد
۴۳) مریدخاں سرمدی
۴۴) دھارو ولد راجه توڈرمل
۴۵) بسنت راءِ والد راءِ سنگ
۴۶) میاں دولت خان لودھی
۴۷) بہادر خان
۴۸) ملا محمود
۴۹) جان بیگ
۵۰) مقصود بیگ [۲]

ان کے علاوہ بھی کئی جنگی پہلوان اپنے اپنے ساتھیوں اور سپاہیوں کے ہم راہ سندھ پر حملے میں شریک ہوئے جن کے متعلق

طبقات کے مصنف نے لکھا ہے کہ سب کا نام بہ الترتیب لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔ "ومردم دیگر کہ تفصیل ایشان بہ اطناب میکشد۔" اکبر نامہ کے مصنف نے "بسیار مردان کار آگاہ"- لکھا ہے- جو بھیجے گئے تھے وہ سب مغل مؤرخین کے قول کے مطابق" امرای نامی "اور "مردان کار آگاہ" تھے- ان میں سے ہر ایک اپنی حیثیت میں فیل مست، اور رستم زمان معلوم ہوتا تھا- سپاہیوں کے علاوہ سامانِ حرب وضرب کی کوئی انتہا نہ تھی- مثلاً

۱) ایک سو ہاتھی (صد زنجیر فیل) [۳]۔

۲) توپ خانہ (بقول رحیمی: فیلان جنگی توپچیان خاور انداز مع توپ خانہ)

۳) دو ہزار گھوڑے [۴]۔

لڑائی شروع ہوتے ہی فورا دوسری کمک بھی پہنچ گئی جس کی تفصیل یوں ہے:

۱) ایک لاکھ پچاس ہزار روپے نقد، پہلی بار [۵]۔

۲) ایک لاکھ روپے دوسری بار [۶]۔

۳) اناج ایک لاکھ من

۴) چند بڑی توپیں، کئی گولہ انداز اور عظیم لشکر

۵) رائے سنگھ چار ہزاری منصب والا امیر اپنی کمک سمیت جیسلمیر کے راستے سے آن پہنچا۔ [۷]

اس تفصیل کے دکھانے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی عظیم مغل شہنشاہیت کو اکبر جیسے جری بادشاہ کے زمانے میں جبکہ ان کے اقبال کا آفتاب عروج پر تھا سندھ کو زیر کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کرنا پڑا آزادی سے رہنے اور غلامی کی زندگی گذارنے کے ذہنی اور جسمانی نتائج قوموں اور ملکوں کے لیے کیا نکلتے ہیں ان کا اندازہ بھی اس سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے- آزاد فضا میں رہنے والوں کو زیر کرنا واقعی کوئی آسان کام نہیں ہے-

جنگ شروع ہوئی فریقین نے بے جگری سے ایک دوسرے کا

مقابلہ کیا۔ طبقات کے مصنف لکھتے ہیں کہ سندھیوں نے ہر طرف سے اناج اور خوراک کے راستے بند کردیے۔ اس لیے جلد ہی خان خاناں کے لشکر میں قحط پڑ گیا۔ اس حد تک کہ" نانی بہ جانی ارزان" یعنی اپنی جان دیکر اگر نان ملے تو وہ ارزان تھا۔

میر معصوم ہر جگہ پر میدان میں موجود تھے اور اپنے ولی نعمت کے لیے نہایت بہادری سے لڑ رہے تھے لیکن وطن دوست سپاہ کا مقابلہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سندھی اگرچہ سمجھ رہے تھے کہ سندھ پر کسی سندھی کی حکومت نہیں ہے۔ جانی بیگ بھی ایک غیر مغل ہے لیکن اس مغل کے ہاتھوں سندھ کو آزاد کروا کر دس دینا رسے نکال کر گویا سو دینار میں جکڑنا تھا"۔۹۔

اتنا سازو سامان اور مغلوں کے "دلاور ان کا رشناس و کار آگاہ" کی کثیر نفری مرزا جانی بیگ کی سندھی فوج کو ہراساں نہ کرسکی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ سندھ کے جوانوں نے مغلوں کے اوسان ایسے خطا کیے کہ خان خاناں جیسے مشہور سپہ سالار نے بھی دوسری کوئی راہ نہ دیکھ کر پیروں اور فقیروں کی مدد چاہی۔

سندھ پر جب بھی غیروں نے حملہ کیا ہے تب اسے اپنوں ہی نے نقصان پہنچایا ہے۔ گھر کو گھر کی آگ نے ہی جلانے میں پہل کی ہے۔ فیروز تغلق ٹھٹھہ کے قلعے پر قابض نہ ہو سکا تو چراغ دہلوی اور جلال بخاری اوچی کو لے آئے ان کے تقدس کے واسطے دے کر قلعے سے باہر لا کر دھوکہ دہی سے قید کر کے دہلی لے آئے۔ ان دونوں بزرگوں کو کچھ نذرو نیاز ملا وہ اس میں خوش ہوئے اور اس کو دینی خدمت سمجھ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کیا ۱۰۔ اسی طرح شاہ بیگ ارغون نے سندھ کے ہی علماء، پیروں اور فقیروں کو لالچ دے کر انھیں ملک سے غداری پر آماد کر کے ملک کے رہبر کا خاتمہ کر کے سندھ پر اپنے قبضے کو مضبوط کیا۔ یہی طریقہ خان خاناں نے بھی اختیار کیا۔ دینی جاسوسوں اور روحانی پیشواؤں کے ذریعے کوشش کی اس سلسلے میں میر معصوم بکھری نے ان کی مدد کی اور انھیں دربیلا کے مخدوم قاضی عثمان کے

ہاں لے گئے جس کو "مجتہد وقت اعلم العلماء اور اکمل الاولیاء" کے دلفریب القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مخدوم صاحب نے جو کچھ کیا۔ اس کا ذکر پچھلے صفحات (۱۱۲۔۱۱۳) میں آچکا ہے۔

واقعہ صحیح ہو یا مشکوک لیکن اس میں شک نہیں کہ مذہب کی آڑ لینے والے شکاریوں نے ہمیشہ اپنی ہی زمین سے بے وفائی کرتے ہوئے کوئی رحم نہ کھایا اور نہ ہی غیرت آئی وہ ہمیشہ 'فتوحات" کے قائل رہے ہیں جس کی بہر حال ہر غاصب کے ہاں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

اس قسم کے واقعات کو بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ خان خاناں کے لیے سندھ کو فتح کرنا آسان نہ تھا۔معرکے سخت تھے۔ ایک جنگ جس میں راجہ توڈرمل کا بیٹا مارا گیا۔ ذخیرہ الخوانین میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

"جنگ سخت ہوئی راجہ توڈرمل کا بیٹا دھارو نہایت مردانگی سے لڑا لیکن مارا گیا۔ میاں محمد خاں نیازی نے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ جنگ کرنے میں موت اور زندگی کی پروا نہ کی غرض کہ تمام لوگ جان کی پروا کیے بغیر بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے مارے گئے۔ دولت خان لودھی جو نہ صرف ایک سپہ سالار، بے مثل شجاع اور اپنے وقت کے رستم تھے اتنا لڑے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی محال ہے ... دلپت چار سو راجپوت سواروں کے ساتھ لڑتے رہے اسی طرح میر معصوم بکھری اور شاہ بیگ خان نے بھی بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ [۱۱] یہ جنگ جو براہ راست جانی بیگ سے لڑی گئی اس میں ان کا ذرا بھر بھی نقصان نہ ہوا وہ آرام سے میدان جنگ سے نکل کر دوسری جگہ چلے گئے۔ اسی طرح سندھ کے مختلف حصوں کی معرکہ آرائی میں سال لگ گیا۔

آخر کار اپنوں کے نفاق، ملکی غداروں کی سازشوں
اور وطن فروش اور وطنی جاسوسوں کی ریشہ دوانیوں
نے مرزا جانی بیگ کو تھکا دیا۔ ایک تو مسلسل
جنگ کے سبب ملکی معیشت تباہ ہو گئی اور قحط
پڑ گیا۔ ۱۲؎ اور اس سے زیادہ مرزا کو یہ ذاتی نقصان
پہنچا کہ ان کے والد مرزا پایندہ بیگ اور بیٹا مرزا فتح
بیگ فوت ہو گئے یہ دونوں سانحے یکے بعد دیگرے
ہوئے۔ جنگی وجہ سے مرزا کی کمر ٹوٹ گئی۔

مرزا اس دل شکستگی کی کیفیت میں مبتلا تھے کہ خان خاناں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے حالات کا اندازہ لگا کر انہیں صلح کا پیغام بھیجا۔ خان خاناں خود بھی طویل جنگ سے تنگ آچکے تھے بہر حال دونوں فریقوں کی رضامندی سے انڑ پور میں معاہدہ ہوا شرائط طے پائیں۔ ۲۶ محرم۔ ۱۷ اگست ۱۵۹۱ء ۱۳؎ خان خاناں نے محاصرہ ہٹالیا۔

اس صلح کو "فتح" سے منسوب کر کے، ٹھٹھہ میں چراغاں کیا گیا جشن منعقد ہوئے۔ اور محفل میں موجود شعراء نے قصائد پڑھے۔ انعام و اکرام حاصل کیے۔ ۱۴؎

قرار داد کے مطابق میرزا جانی ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۰۱ھ /۱۵۹۲ء میں شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ ۱۵؎ ان کی روانگی کی تاریخ ہے:

کردہ کلکم نام تاریخش رقم بستان فتح
باغ اقبال تو بادا داغ گلزار جنان ۱۶؎

میر معصوم بکھری نے اسی سلسلے میں "بستان فتح" کے گلگشت میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ بہر حال بقول مرزا غالب:

ز گلفروش ننالم، کز اهل بازار است
تپاك گرمی رفتار باغبانم سوخت

حوالہ جات

۱ـ معصومی : ۲۵۱
۲ـ اکبر نامہ ، ۳: ۸۸۵، طبقات ۲: ۴۱۲، رحیمی ۲:۳۵۸، ذخیرہ ۱:۳۶،معصومی ۲۵۱ـ۳۵۴ـ ان امیروں کا حال مغلیہ دور کے تذکروں سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔
۳ـ بدایونی ۲:۳۴۴
۴ـ طبقات : ۲:۴۱۷، معصومی میں گھوڑوں کی تعداد ۱۲ سو ہے (۲۵۶)
۵ـ بدایونی: ۔ ۲: ۳۷۹
۶ـ رحیمی : ۲:۳۶۲
۷ـ طبقات ۲: ۴۱۴، ۴۱۵
۸ـ طبقات ۲:۴۱۶ـ رحیمی ۲: ۳۶۳ـ سندیان از اطراف راہ آمدو شد غلہ را بر لشکر خانخانان بستند و غلہ بہ حدی نایاب گشت کہ نانی بہ جانی ارزان بود.

گشتہ زان تنگی جہانی تنگدل گرسنہ نالان وسیران سنگدل
ہر کرا، دیدار نان، بودی ہوس قرص خور در آسمان دیدی وبس

۹ـ شیخ سعدی کا قول، دیکھیئے گلستان میں۔
۱۰ـ دیکھیے مکلی نامہ، ص ۱۳۱ ، سے ص.۱۳۶
۱۱ـ ”جنگ صعب افتاد و دارو و ولد راجہ تودرمل تردد ہایِ مردانہ بہ ظہور رسانیدہ بہ قتل رسید و میان محمد خان نیازی بذات خود ترددات نمایان کردہ جمعی از خویش و تبار خودرا بہ کششن داد. و دولت خان لودی (کہ سپہبد و شجاع بی نظیر ورستم وقت خود بود .) چندان سعی و تلاش و تردد کردہ کہ مزید بر ان تصور نبا شد...دلپت با چہار صد سوار راجپوت بہ کنارہ جنگ گاہ استادہ ماند، و میر معصوم بکری و شاہ بیگ خان ترددات مردانہ کرد.“ (ذخیرہ ۱ : ۳۷)

۱۲۔ قحط اور صورت حال کی نزاکت کے لیے دیکھیے تحفۃ الکرام، ص ۲۸۰ تا ۲۸۱۔
۱۳۔ رحیمی، ۲: ۳۷۶
۱۴۔ دیکھیے تحفۃ الکرام فارسی ص: ۲۵۹۔ ۲۷۵
۱۵۔ رحیمی، ۲:۳۷۶
۱۶۔ رحیمی ۳: ۵۳۴۔ ۵۵۱۔ یہ ۱۷۱ ابیات پر مشتمل قصیدہ ہے جس کو تحفۃ الکرام (حسام الدین) میں بھی (۲۶۳۔ ۲۶۸) شائع کیا گیا ہے۔ قصیدہ دلچسپ اور واقعاتی ہے۔ مثلاً صلح باہمی ملاقات، ٹھٹھہ میں خان خاناں کی آمد اور چراغاں وغیرہ کی داستان تاریخی ہے یہ قصیدہ یوقلی بیگ انیسی شاملو کا ہے ان کا ایك اور قصیدہ ۷۸ ابیات پر مشتمل ہے۔ (تحفۃ الکرام ۲۵۹۔ ۲۶۲)

مطلع یہ ہے:

ببین بہ حشمت شاھی و جشن فرور دین
کنون ببالد مھر و کنون نہ با دِل کین

آخری شعر پر تاریخ ہے:

بفتح تتہ و تاریخ این قصیدہ قضا
نوشت تسع مائہ بعد تسعہ و تسعین

انیسی نے ترکیب بند بھی کہا ہے۔ (تحفۃ الکرام ۲۶۸۔۲۷۰) اس کا مطلع ہے!

نسیم گل بہ چمن تا نبرد مستان را
ھوای باغ قفس بود،مرغ بستان را

اسی طرح شکیبی نے ساقی نامہ کہہ کر ۱۲ ہزار روپے اور سروپا وصول کیے مطلع ہے:

بیا! تا ز میخانہ، بستان کنیم
بہ ویرانہ ، کشت گلستان کنیم

(تحفہ الکرام ۲۷۱۔ ۲۷۵)

٭(کراچی ۵-۴-۱۹۷۸ء)

باب۔ ۱۵

بکھر میں قیام، سیوی کی فتح

سندھ کی جنگ سے فارغ ہو کر خان خاناں اور مرزا جانی بیگ کو دربار کی طرف روانہ کر کے میر معصوم خود بکھر چلے آئے۔ ٹھٹھہ کا انتظام خان خاناں، دولت خان لودھی کے حوالے کر گئے تھے۔ میر صاحب کو صحیح معنوں میں فراغت دراصل اس کے بعد حاصل ہوئی اور انھوں نے سکھر میں رہ کر اپنے نجی کام سر انجام دیے اور جاگیر کا انتظام خاطر خواہ طریقے سے کیا۔

میر معصوم کو پُر فضا اور خوش نما مقامات پر رفاہی عمارات تعمیر کرانے کا بہت شوق تھا۔ یہ مغل امیروں کا ذوق اور طریقہ رہا ہے۔ مساجد، سرائیں، کنویں، باغات، نہریں، عید گاہ اور اس قسم کے دوسرے کام کرانا اور ایسی یاد گار چھوڑنا جن سے ان کی شہرت ہو اور عزت میں اضافہ ہو۔ یہ تمام مغل امراء اور جاگیر داروں کا بڑا مشغلہ اور تفریح تھی اس سلسلے میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میر معصوم کو اس کے علاوہ یہ بھی شوق تھا کہ جہاں جہاں سے ان کا گزر ہو وہاں کچھ یاد گار مقامات پر تاریخی کتبات لگاتے جائیں۔ اس سلسلے میں کوئی اور مغل سردار ان کا ہم پلہ اور ہم سر نہیں تھا۔

بکھر میں قیام اور یاد گار (۱۰۰۱-۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۱-۱۵۹۳ء)

بکھر میں میر بمشکل ڈھائی، پونے تین سال رہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اتنے متحرک، پُر کار اور شاہ خرچ امیر تھے کہ انھوں نے اس تھوڑے عرصے میں کتنی ہی یاد گار عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ مثلاً

۱- چھتری:

والد کی قبر پر چوکھنڈی اور چھتری تعمیر کروائی جس کی تاریخ، "عمارت سر کوہ" (۱۰۰۲ھ) سے نکلتی ہے۔

۲- عید گاہ:

روہڑی میں نہایت پر فضا پہاڑی اور خوش نما جگہ پر عید گاہ تعمیر کروائی غالباً یہ بکھر اور روہڑی دونوں شہروں کے لیے مشترکہ تھی وہ بھی اسی سال یعنی ۱۰۰۲ھ میں تعمیر ہوئی۔ یہ آج بھی موجود ہے اور دریا کے کنارے سے دیکھا جاسکتا ہے۔

۳- مینارہ:

اپنے خاندانی قبرستان میں اسی سال ۱۰۰۲ھ میں مینار کی بنیاد ڈالی ان کے سامنے دلی کے قطب مینار کی مثال موجود تھی۔

۴- گورستان:

اسی احاطے میں اپنے خاندان کے قبرستان کا نہایت خوب صورت نقشہ بنایا۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے والد، بھائی اور دوسرے کچھ خاندانی افراد دفن ہوئے تھے۔ گورستان میں اپنے والد، بھائی اور اپنی قبر کے لیے مذکورہ بالا چھتری کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے گجرات اور سما سلاطین کی گورستانی چھتریوں اور چوکھنڈیوں کا نقشہ اور نمونہ ان کے سامنے تھا۔

۵- قبریں:

والد اور بھائی کی قبروں کے لیے نہایت خوب صورت اور منقش پتھر تیار کروائے۔

اس کے علاوہ بھی ممکن ہے ان کے ذہن و فکر میں کچھ اور یادگاروں کا نقشہ یا پروگرام ہو جو صدیوں کی لپیٹ میں آکر مٹ گیا ہے یا سرے سے بنائے ہی نہیں گئے۔

سیوی (۱۰۰۳/۱۵۹۵ھ):

میر صاحب کا بکھر میں یہ قیام بہت مختصر لیکن نہایت مصروف تھا ابھی انھیں پورے تین سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۰۰۳/۹۵-۱۵۹۴) میں انھیں پہلے سیوی اور وہاں سے قندھار جانے کا حکم ملا۔ سیوی کی طرف ان کے ساتھ مندرجہ ذیل امراء اپنے فوجی دستوں کے ساتھ روانہ ہوئے:

۱) میر ابو القاسم نمکین: آپ کے ہم وطن اور بکھر کے جاگیری دار اور حاکم۔

۲) بختیار بیگ: سیوہن کا اقطاع دار ا۔

۳) سید بہاء الدین بخاری: اُچ کا تیول دار

اکبر نامہ کے مصنف نے یہ واقعہ ۳۹ سال الٰہی (۱۰۰۳ھ) کی روئیداد میں بیان کیا ہے۔ فوج کشی کا سبب بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں: سیوی کا قلعہ پہلے بکھر سرکار کے ماتحت تھا اور کچھ دنوں سے پنی قبائل کے افغان خودسری کر کے اس پر قابض ہو گئے تھے ان کی گوشمالی کے لیے یہ فوجی اقدام کیا گیا۔ ۲۳ تاریخ ماہ دی میں فوجیں روانہ ہوئیں۔ گنجابہ کے زمیندار اور آس پاس کے بزرگ مثلاً دریان خان اور داؤد خان وغیرہ مقابلے کی تاب نہ لا کر پیش ہوئے۔ اسی لیے بغیر کسی رکاوٹ کے فوج ۳ تاریخ اسفند ماہ، قلعے کے سامنے پہنچ گئی۔

قلعہ نہایت مضبوط اور ہر طرح سے مستحکم تھا۔ پانچ ہزار افراد فوراً مقابلے کے لیے قلعے سے نکل آئے۔ سرکاری فوج تربیت یافتہ اور منظم تھی۔ قلعے کے مکین غیر منظم اور جنگی ضابطوں سے نا آشنا تھے۔ اسی لیے پہلی جھڑپ میں پسپا ہو گئے اور صلح کے لیے اپنے بزرگوں کو درمیان میں لا کر امان کی درخواست کی۔ اور چابیاں شاہی فوج کے حوالے کر کے خود پیش ہو گئے۔

اس قلعہ کے ہاتھ آنے سے سیوی اور کیچ مکران سے لے کر قندھار تک کا سارا درمیانی علاقہ اکبری فرمان کے تحت آ گیا۔ ۲

میر ابو القاسم نمکین:

مظہر شاہ جہانی کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہم کے لیڈر میر نمکین تھے جو اس دور میں بکھر کے جاگیر دار تھے دوسرے امراء ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ روانہ ہوئے تھے میرک یوسف لکھتے ہیں کہ سیوی کی فتح کے بعد والد نے بادشاہ کو ایک درخواست بھیجی کہ اگر حکم ہو تو کیچ مکران پر قبضہ کیا جائے لیکن بادشاہ نے انکار کیا۔ اور کہا کہ چوں کہ یہ ملک شاہ عباس والی ایران کی سرحد پر ہے اس لیے اس پر قبضہ کرنا سیاسی مصلحت اور دونوں حکومتوں کے باہمی تعلقات کے لیے نا مناسب ہو گا۔ سیوی کے باشندوں پر لگان بھی میر نمکین نے مقرر کیے۔ جو بقول میرک یوسف ان کی کتاب لکھنے تک (۱۰۴۴ھ) اسی شرح سے چلی آرہی ہے۔ ۳

مظہر شاہ جہانی کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بکھر کا یہ علاقہ جو ۹۹۹ھ میں خان خاناں کی جاگیر میں دیا گیا تھا۔ وہ سندھ فتح ہونے کے بعد غالباً جیسے ہی خان خانان ۱۰۰۱ھ میں واپس گئے تب وہ بدل کر میر ابو القاسم نمکین کی جاگیر میں دیا گیا یہی وجہ ہے کہ طبقات اکبری میں جو ۱۰۰۱ھ میں ختم ہوئی، میر نمکین کو بکھر کا حاکم بتایا گیا ہے ۴ اور مظہر شاہ جہانی سے اس کی تصدیق اور وضاحت ہوتی ہے۔ لگان کی وصولی بھی میر نمکین کے لوگ بکھر جا کر کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر معصوم سیوی کی مہم پوری ہونے کے بعد وہاں سے ہی قندھار کی فوجی خدمت پر چلے گئے اور باقی سر دار علیحدہ علیحدہ اطراف روانہ ہو گئے۔ ۵

حوالہ جات

۱۔ بختیار بیگ کے لئے دیکھئے مظہرشاہجہانی ص ۱۰۱ وغیرہ

۲۔ اکبر نامہ (۳:٦٦٢)...سیوی... استوار قلعہ ایست نزد قندھار، درباستان زمان مرزبان بکر داشت و از دیر باز افعانان پنی برو چیرہ داشت. سید بہاء الدین بخاری تیول دار اوچہ و بختیار بیگ اقطاع دار سیوستان و میر ابوالقاسم نمکین جاگیردار بکر و میر معصوم و دیگر سپاہ صوبہ ملتان را فرمان شد کہ بہ آنجا شدہ اندرز گوئی را دستمایہ کشیاش بر سازند، اگر نہ نیوشند بہ سزا برمالند. بیست و سوّم دی بدین بسیج بر آمدند. زمینداران گنجابہ و دیگر سران آن سو (چون دریا خان و داؤد) سر بفرمان در آویزش در آمدند، و بکمتر آویزہ شکست یافتہ حصاری شدند. پس از گرد گرفتن و آمادہ ساختن دست افزار گشایش زینہاری شدہ کلید سپردند. و از ابن فیروزی تاقندھار و کیچ و مکران بہ قلمرو در آمد ...'' مزید دیکھئے امیرخانی ص ۲۲ اور مظہرشاہجہانی.

۳۔ دیکھئے تذکرہ امیرخانی (۲۳-۲۴) مظہر شاہجہانی میں ہے:

''فتح قلع سیوی را از دست افاغنہ پنی در زمان حضرت عرش آشیانی بہ عنایت الٰہی و بہ اقبال بی زوال پادشاہی، پیر غلام کردہ بود. زمانی کہ ملک بکر از تغییر خان خانان عبدالرحیم در جاگیر او نمودہ . و دران ایام پیر غلام استعداد ملک بکر را دانستہ از حضرت عرش آشیانی استدعا کردہ بود کہ: اگر حکم شود ملک کیچ و مکران را در قبضہ تسخیر اولیاء قاہرہ در آرم! حضرت پادشاہ ابا نمودند و فرمدند کہ: چون کیچ و مکران بر سرحد ولایت شاہ عباس است و

درمیان ما و ایشان اخلاص می گذرد بی وجه دست به آن ملك ها کردن خوب نیست!

و تا حال همان اجاره که پیر غلام بر مردم افاغنه سیوی از نقد و جنس بر بسته، منظور شده می آید. سر فصل مردم تعیینات ملك بکر، باحشام رعیت رفته مقطعی را ازان مردم می گیرند."
(ص ۲۸-۲۹)

۴۔ در زمرۂ امرا است و حکومت بکر دارد. طبقات ۲:۴۵۵۔ بکھر سرکار آٹھ پرگنوں پر مشتمل تھی۔ جیسا کہ تاریخ مظہرشاہجہانی سے معلوم ہوتا ہے۔ (ص ۵ اور ص ۱۰۸)

۵۔ دیکھئے مظہرشاہجہانی (ص ۱۰۲)

باب ۔ ١٦

قندھار میں فوجی خدمت اور قیام

سرحدی صوبہ ہونے کے سبب اور ویسے بھی توسیع پسندی کی عادت اور پالیسی کے سبب، قندھار کافی عرصے سے ہندی مغلوں کے لیے درد سر بنا ہوا تھا۔ ایک زمانے میں جب وہ ہمایوں کے قبضے میں تھا اور ہمایوں کو ہندستان پر دو بارہ قبضے کے لیے ایرانی امداد کا محتاج ہونا پڑا اس وقت انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ سکون حاصل ہونے اور ساز گار حالات کے بعد وہ قندھار، ایران کے حوالے کردیں گے لیکن اچانک ہمایوں انتقال کر گئے اور ایران کے حالات بھی تیزی سے بدلتے رہے۔ شاہ طہماسپ جنھوں نے ہمایوں کی مدد کی تھی (۹۸۴) فوت ہوچکے تھے ان کے بعد شاہ اسماعیل ثانی آئے۔ ان کے بھائی خدا بندہ تخت پر بیٹھے جسکے بعد شاہ عباس اول (۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء) تخت نشین ہوئے۔

قندھار پر قبضہ:

وعدے کے مطابق جب قندھار ایران کو نہ ملا تو شاہ طہماسپ نے اپنے ہی عہد میں مغلوں کے گورنر شاہ محمد کلاتی سے (۹٦۵ھ/۱۵۵۸ء) اسے چھین کر اس پر اپنے بھتیجے شاہ حسین مرزا ولد بہرام مرزا کو مقرر کردیا تھا۔ یہ بات اکبر کو ناگوار گزری لیکن اس وقت وہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ حال ہی میں تخت پر بیٹھے تھے ملکی استحکام کے لیے انھیں وقت درکار تھا۔ دہلی سے لشکر کشی کرنا آسان نہ تھا، ایران سے جنگ کرنے کے لیے حالات ساز گار نہ تھے۔ اکبر بظاہر تو خاموش رہے لیکن ان کے دل میں تڑپ رہی اور یہی وجہ ہے کہ

دونوں حکومتوں کے تعلقات میں کچھ عرصے تک سرد مہری رہی۔ یہاں تک کہ ۹۱۹ھ/۱۵۲۶ء میں جب شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی وفات پر تعزیت کے لیے شاہی خط کے ساتھ اپنے سفیر سید بیگ بن معصوم بیگ صفوی[1] کو روانہ کیا تو اکبر نے ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہ کی اور نہ ہی مناسب جواب دیا کچھ عرصے کے بعد سلطان محمود بکھری کے لیے خطاب کی سفارش لے کر اکبر کے ہاں ایران سے سفیر آیا۔ (۹۷۱ھ/۶۴-۱۵۶۳ء) لیکن اکبر نے اگرچہ قانوناً درست لیکن روابط کی صورتحال کے مطابق خشک جواب دے دیا۔[2] حال آں کہ وہی جواب نرم لہجے میں بھی دیا جاسکتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ سفیر کو کھڑے کھڑے رخصت کر دیا گیا۔ (۹۷۳ھ/۱۵۶۴ء)[3]

سفیروں کی یہ سرسری آمدو رفت شاہ طہما سپ سے لے کر شاہ عباس ثانی کے ابتدائی دور تک قائم رہی۔ اکبر کا دل صاف نہ تھا اسی لیے تعلقات میں گرم جوشی پیدا نہ ہو سکی اس بات کو ایرانی حکومت نے محسوس تو کیا تھا لیکن مصلحتاً ان کے اظہار یا ان پر احتجاج کی ضرورت نہ تھی۔

اوزبك:

اسی دور میں توران اور ایران کے سرحدی علاقوں میں عبداللہ خان اوزبک کی نئی طاقت پروان چڑھی جس نے وسط ایشیاء کی ملکی اور سیاسی صورت حال میں بڑی تبدیلی پیدا کردی۔ عبداللہ خان نے بخارا (۹۶۴ھ/۱۵۵۳ء)، سمرقند (۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء) بلخ (۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) اور بدخشان (۹۹۲/۱۵۸۴ء) کو اپنے قبضے میں لا کر آخر میں (۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء) خراسان پر بھی قبضہ کر کے اپنے آپ کو توران کا خان کہلوا کر اپنی علیحدہ، مستقل سلطنت قائم کر کے ایک طرف ایران کے لیے

خلفشار پیدا کرلیا اور دوسری طرف اکبر کے لیے سیاسی شطرنج کا میدان مہیا کیا اب عبداللہ خان کے ہاں سے بھی سفیر ہندوستان کے دربار میں آنے جانے لگے توران کے اس سنی خان کے ہاں سے ایران کی شیعہ حکومت کے خلاف جہاد کرنے کی تربیت بھی دی گئی یہ دعوت اور ترغیب مسلسل جاری رہی لیکن اکبر ہمیشہ سیاسی نوعیت کے جوابات بھیجنے پر اکتفا کرتے رہے [۴] ایک دفعہ مصلحتاً اکبر نے مرزا فولاد خان جیسا کڑک اور متعصب سنی سفیر جنھوں نے ملا احمد ٹھٹھوی کے شیعہ ہونے کے سبب اُن کو چھرا مار کر قتل کردیا تھا، عبداللہ خان کی طرف بھیجا تاکہ عبداللہ خان بالکل نا امید بھی نہ ہوں اور سنی سفیر کا ان کے ہاں جانا خان کے لیے خوشنودی کا سبب بنے۔

کابل:

میرزا حکیم ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء کابل میں فوت ہوئے تو اکبر کو کابل میں اپنا مضبوط اور مستحکم مرکز قائم کرنے کا موقع مل گیا اس طرح اکبر نے پہلی مرتبہ مرکزی ایشیا میں اپنے قدم جمائے اس نے ایک طرف توران اور دوسری طرف ایران کی سرحدوں پر اپنی قوت کو مضبوط کیا درحقیقت انھیں نہ تو ایران کا کوئی حصہ درکار تھا اور نہ وہ توران کے کسی حصے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا بلکہ قندھار واپس لے کر صرف اپنی انا برقرار رکھنی تھی اور اپنی سرحدوں کو محفوظ بنانا تھا تاکہ نہ تورانی قوت انھیں پریشان کرسکے اور نہ ایرانی سلطنت کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ شاہ عباس اول نے ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء میں یادگار سلطان روملو کو اکبر کی طرف بطور سفیر روانہ کیا [۵]۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اکبر اپنے ملک کو وسیع اور مستحکم کرچکے تھے۔ گجرات فتح ہو چکا تھا کشمیر ان کے زیر نگین تھا۔ اور سندھ کی فتح کے لیے لشکر روانہ کر کے وہ خود لاہور میں

حالات کا انتظار کر رہے تھے۔ اس سفارت کا مقصد یہ تھا کہ اکبر سے مدد لے کر از بکوں کا خراسان سے قبضہ ختم کروایا جائے۔[٦]

قندھار کے معاملات:

قندھار ایران اور ہندوستان کے درمیان تلخی کا سبب تھا۔ اکبر نامہ سے (۱۱۸:۳)معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۴ھ/۱۵۷۴ء تک یہ ایران کے قبضہ میں تھا۔ وہاں کے صفوی حکمراں سلطان حسین مرزا کی ذاتی خط و کتابت سے اکبر کو امید تھی کہ سلطان حسین ایک دن خود مجبور ہو کر قندھار اکبر کے حوالے کردے گا۔[۱] اکبر کا یہ اندازہ درست ثابت نہ ہوا کیو ں کہ سلطان حسین اور شاہ طہاسپ دونوں ایک ہی سال ۹۸۴ھ/۱۵۷٦ء میں فوت ہو گئے۔ اور قندھار شاہ حسین کے دو بیٹوں کے ورثے میں آگیا اکبر کی بہر صورت یہی پالیسی رہی کہ قندھار فوج کشی کے بغیر مرزاؤں سے حاصل ہوجائے تو بہتر ہے جس کے لیے انھو ں نے اپنے کابل کے گورنر کو ہدایات جاری کردی تھیں اکبر نے دو مرتبہ فوج کشی کی کوشش بھی کی جیسا کہ ۹۹۸ھ/۱۵۸۴ء میں خان خاناں کے ذریعے قندھار کی طرف لشکر روانہ کیا۔ لیکن وہ لشکر قندھار پہنچنے سے پہلے ہی واپس آگیا[۷]۔ اور خان خاناں گیا لیکن وہ بھی بے نیل و مرام واپس لوٹ آیا۔

قندھاری میرزا:

یہ وہ زمانہ تھا جب قندھار کے دونوں بھائی مرزا رستم اور مرزا مظفر آپس میں لڑ پڑے اور اندر ہی اندر ایک دوسرے کے لیے گڑھے کھودنے شروع کردیے عبداللّٰہ خان اوزبک خراسان میں مضبوط ہوچکا تھا۔ شاہ عباس قندھاری مرزاؤں کی عملاً

کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ایران کے اندرونی استحکام میں اتنا مصروف تھا کہ اس کی طاقت اور اس کا وجود دوسروں کے لیے بالکل بے کار تھا۔ قندھاری مرزاؤں کو اکبر اور عبداللہ اوزبك کے اشتراك عمل سے ہر لحظه خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ اپنے حالات کے سبب، بے بس اور مجبور ہو گئے تھے اپنی ذاتی عداوت اور اختلاف نے انھیں اور زیادہ کمزور اور ضعیف کردیا تھا۔۸

ہندوستانی دربار میں آمد:

دونوں بھائیوں میں سے پہلے رستم میرزا نے ہندستانی دربار کی طرف رخ کیا۔ کیوں کہ ان کا حصه (زمین داور) براہ راست عبداللہ خان کے حملوں کی زد میں تھا۔ اسی لیے غزنی کے مغل کماندار شریف خان کے ذریعے وہ محرم ۱۰۰۲ھ /دسمبر ۱۵۹۳ء میں سندھ سے ہوتا ہوا اکبر کے یہاں پہنچا۔ ۹۔ اکبر نے ان کی بڑی پذیرائی کی اور فوری طور پر پانچ ہزاری منصب اور ایك صوبے کی حکومت ان کو دے کر باقی ماندہ قندھاری مرزاؤں کے لیے لالچ کی مثال قائم کی۔ ایسے استقبال، داد و دہش، سرپرستی اور سرفرازی کے واقعات سن کر اور قندھار کی حکومت کی مصیبت دیکھ کر دوسرے بھائی مظفر میرزا نے بھی پہلے اپنی والدہ اور بیٹے کو ہندوستان بھیج کر (جمادی الثانی، رجب ۱۰۰۸ھ /اپریل ۱۵۸۴ء)اکبر کی طرف قندھار کے لیے حاکم بھیجنے کا پیغام روانہ کیا۔ چنانچہ مغل دربار کی طرف سے قندھار کا پہلا گورنر شاہ بیگ ہوا جو رجب، شعبان ۱۰۰۳ھ/مارچ ۱۵۹۵ء میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ قندھار کے قلعے میں داخل ہوا۔۱۰۔ خود میرزا مظفر جمادی الثانی ۱۰۰۳ھ/فروری ۱۵۹۵ء مغل دربار میں پہنچا۔ جہاں انھیں بھی پنج ہزاری منصب کے علاوہ سنبھل کی حکومت بھی ملی۔ ۱۱۔

میر معصوم ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء:

ایسا دور اور ایسی صورت حال تھی جس میں میر معصوم تعطیلات ختم کر کے سبی گئے۔ اور وہاں سے قندھار روانہ ہوئے۔ شاہ بیگ کی گورنری ۱۲۔ میں فوجی سربراہی (کمکی) ان کے

سپرد ہوئی۔ قندھار کا درد سر جو ہندوستان کی مغل حکومت کے لیے ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ اس طرح اپنے آپ ختم ہوا۔ میر معصوم کے قندھار جانے اور ٹھہرنے کا سبب بھی یہی تھا۔

قندھار میں میر کا قیام ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک رہا ہمیں اس کا علم ان کے نصب کردہ "چہل زینہ" والے کتبے اور تاریخ معصومی سے ہوتا ہے تاریخ معصومی سے معلوم ہوتا ہے کہ قندھار میں کبھی کبھار وبائی امراض پھوٹ پڑتے تھے جس میں کافی جانی نقصان ہوتا تھا اپنے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب لکھتے ہیں کہ ایسی بیماری پھیلی کہ لوگوں کے پیٹ، منہ، ناک اور کانوں سے خون بہنا شروع ہوا اور اس میں تقریباً دو سو آدمی لقمۂ اجل ہوئے یہ ۱۰۰۷ھ کا واقعہ ہے:

> "بعضی سالھا وبا و بیماری بسیار می شود واکثر مردم به علت خون شکم و خون بینی و گوش و خون از دھن رفتن از عالم می روند. چون در زمان خلافت پناھی کاتب به کمك آنجا رفته بودواز مردم تعینات آنجابود در سنه وسبع و الف قریب دویست سوار و پیاده از لشکر این جانب به همین علت از عالم رفتند"۔ ۱۳۔

منصب ۱۰۰۴ھ:

میر صاحب گذشتہ سابقہ عرصے میں کبھی نظام الدین بخشی اور کبھی دوسرے امراء کے ساتھ بطور ضمیمہ نائب کی حیثیت سے شامل رہے۔ غالباً یہی سبب ہو گا کہ ان کے کسی خاص منصب یا عہدے کا تعین نہیں ہوا تھا۔پہلی جاگیر انھیں ۹۹۹ھ میں بکھر میں ملی جس کااوپر ذکر آچکا ہے۔ مآثر الامراء سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۴ھ میں شاید قندھار جانے کے دوران ڈھائی سو منصب تک پہنچے تھے۔

> "تا سال چھلم به منصب دو صدی و پنجا ھی اوج پیمای عزت بود۔۱۴۔

طبقات اکبری ۱۰۰۱ھ میں اور منتخب التواریخ ۱۰۰۳ھ میں ختم ہوئی۔ دونوں میں منصب داروں کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں میر صاحب کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انھیں شعراء میں شامل کیا گیا ہے گویا ڈھائی سو والے منصب کے لیے ایسا سمجھنا چاہیے کہ ۱۰۰۴ھ میں سبی کی لشکر کشی کے وقت یا قندھار میں تعینات ہونے پر انہیں ملا جو کافی عرصے بعد رفتہ رفتہ ہزار ی تک پہنچا۔ جیسا کہ ذخیرۃ الخوانین میں ہے:

"آخر بہ مرور ایام بہ منصب هزاری ذات ،سوار رسید و در خدمت عرش آشیانی قرب و حالت بهم رسانید۔"[۱۵]

"مرور ایام" سے ظاہر ہے کہ کچھ سالوں کے بعد اس منصب تک پہنچے تھے گمان غالب ہے کہ یہ آخری منصب اس وقت ملا ہوگا جب وہ ایرانی دربار میں بطور ایلچی شاہی خط لے گئے تھے۔

قندھار کا قیام ۱۰۰۴ھ-۱۰۰۷ھ/۱۵۹۵ھ-۱۵۹۸ء:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ میر صاحب ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء کے آخر میں قندھار گئے۔ ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک کم و بیش ساڑھے چار سال قندھار میں رہے۔ یہ عرصہ ان کے "چھل زینہ"[۱۶] والے کتبے سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں لکھا ہے کہ انھوں نے اس کتبے کی کندہ کاری کے لیے بکھر سے کاریگر بلوائے تھے۔ جنھیں اس کام میں چار سال لگ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے قندھار کے تاریخی مقامات پر مختلف سالوں میں جو کتبے نصب کیے ہیں ان سے بھی قندھار میں ان کے قیام سے متعلق سالوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل کتبے دریافت ہوئے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔

۱۔ چہل زینہ والا کتبہ۔

۲۔ قندھار کے باہر اسکلچہ میں "سپیروان" نامی پہاڑی پر میر صاحب نے ایک کتبہ کندہ کرایا ہے جس پر ۱۹ شوال ۱۰۰۵ھ کی تاریخ موجود ہے۔[۱۷]

اسی جگہ (دس کوس مغرب کی طرف قندھار سے) سید محمد شیر قلندر کا مزار ہے جس سے ملحق میر معصوم نے ایک مسجد اور ایک حجرہ تعمیر کرایا جو آج تک موجود ہے۔ کتبہ پر یہ اشعار ہیں:

دریں آرامگاہ بی رہ و رو   اگر مردی! منہ دل یکسر مو
ازیں منزل، کہ یاران در رحیل اند   ترا آن جملہ در رفتن وکیل اند
ترا گر آسمان منزل نشین است   ہم آخر جای تو، زیر زمین است
بیا نامی بکار خود بگرییم
زمانی بر مزار، خود بگرییم[۱۸]

۳۔ میر صاحب کے خاندان کے بزرگ بابا ولی (بابا حسن ابدال بن سید؟ بن سید عین الدین ولد شمس الدین کا مزار ارغنداب کے کنارے لنگر نامی گاؤں میں ہے۔ جس کی مرمت میر صاحب کے حکم پر ایک ہزار ہجری میں شروع ہوئی اور ۱۰۰۱ھ میں عید الاضحیٰ پر ختم کی گئی جس پر ان سالوں کا کتبہ موجود ہے[۱۹] یہ کام میر صاحب کے حکم پر اسی وقت کا کیا ہوا دکھائی دیتا ہے جب وہ بکھر میں تھے۔

۴۔ ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۰۶ھ کو میر صاحب نے قندھار میں خواجہ محمد ہاشم سے انگوروں کا ایک باغ خریدا تھا۔[۲۰]

سکھر اور بکھر کے آثار:

میر معصوم سکھر اور بکھر میں جن عمارات کی بنیاد ڈال گئے تھے۔ غالباً وہ ان کی عدم موجودگی میں بھی بنتی رہیں۔ خود قندھار میں رہے لیکن ان کی غیر حاضری میں کام ہوتا رہا۔ مثلاً

۱) آرام گاہ - فیض محل: مینارہ کے ساتھ ۱۰۰۴ھ
۲) آرام گاہ - سادہ بیلا کے سامنے دریا کے کنارے پر ۱۰۰۶ھ
۳) منزل گاہ - اسی احاطے میں ۱۰۰۷ھ
۴) سیتا سر - دریا کے بیچ میں ۱۰۰۷ھ کو تعمیر ہوا۔۲۱

قندھار سے واپسی ۱۰۰۸ھ:

قندھار میں شاہ بیگ کے دور میں پونے چار سال یا کچھ زیادہ رہ کر میر اسی فوجی خدمت سے واپس دارالسلطنت کی طرف لوٹ آئے۔ ظاہر ہے کہ قندھار سے بکھر آئے۔ وہاں سے جیسلمیر کے راستے شاہی دربار کی طرف گئے۔ ان کے آنے جانے کا راستہ ہمیشہ یہی رہا۔

حوالہ جات

۱۔ معصوم بیگ اردبیل میں ہمایوں کے میزبان رہ چکے تھے۔ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے طہماسپ نے ان کے بیٹے کو سفیر بنا کر روانہ کیا۔ تعزیت کے ساتھ تخت نشینی کی مبارک بادی کا خط بھی لائے۔

۲۔ اسی موضوع پر میرا مقالہ پڑھیے۔

۳۔ اکبر نامہ: ۲: ۲۳۷ اور ڈاکٹر ریاض الاسلام

۴۔ اکبر نامہ ۲: ۳۶۸، ۳: ۱۱۲-۲۱۱ انگریزی ترجمہ بیورج کا نوٹ ۳: ۲۹۷، اور ڈاکٹر ریاض الاسلام، ص : ۵۲

۵۔ اکبر نامہ ۳: ۶۵۶-۷۰۵ اور ریاض الاسلام، ص ۵۶

۶۔ اکبر نامہ ۳: ۵۸۸-۷۰۵ اور ریاض الاسلام، ص ۵۶

۷۔ ریاض الاسلام، ص : ۵۸

۸۔ ریاض الاسلام ص، ۵۹، اکبر نامہ ۳: ۶۵۰-۶۴۶

۹۔ دیکھیے تحفۃ الکرام ۳: ۳۰۷-۲۵۵، اکبر نامہ ۳: ۶۴۴ ۔ میرزا غازی ترخان کی وفات (۱۰۲۱ھ) کے بعد یہ ٹھٹھہ کا پہلا مغل گورنر ہوا۔ نہایت ظالم، بے رحم اور بد عقل تھا ۔ اسی لیے فوراً تبدیل کردیا گیا۔

۱۰۔ اکبر نامہ ۳: ۶۹-۶۶۸، بدایونی ۲: ۴۰۲

۱۱۔ اکبر نامہ ۳: ۶۷۱

۱۲۔ ذخیرۃ الخوانین ۱: ۲۳۵-۲۳۶، ٹھٹھے کی فتح میں بھی شامل تھے ”خان دوران“ خطاب تھا۔ مآثر الامراء ۲: ۶۴۱

۱۳۔ معصومی، ۱۳۲-۱۳۳

۱۴۔ مآثر ۳: ۳۲۷

۱۵۔ ذخیرہ الخوانین ۲: ۲۰۰

۱۶۔ معصومی ۱۳۲، بابر والا کتبہ جو کامران، عسکری اور ہندال کی نگرانی میں نو سال تک اکیاسی سنگتراشوں نے بنایا۔ (حبیبی تاریخ افغانسان: ۱۹۵)

۱۷۔ حبیبی تاریخ افغانستان دور تیموریان، ص : ۱۹۷

۱۸۔ حبیبی تاریخ افغانستان ص : ۳۰۲

۱۹۔ حبیبی تاریخ افغانستان دور تیموریان، ص ۱۹۶

۲۰۔ یہ دستاویز برادر بزرگوار میر علی محمد راشدی نے خاندانی ذخیرہ میں دیکھی اور "حیات معصوم" میں اُس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲۱۔ ان جگہوں کی تفصیل علیحدہ باب میں آئے گی۔

باب۔ ۱۷

آسیر (خاندیش) کی مہم

قندھار سے واپسی پر جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ بکھر آکر دربار کی طرف جانے سے پہلے میر صاحب نے اپنے ضروری کام نمٹائے ہوں گے اور آئندہ کا بندوبست و اہتمام کرکے ۱۰۰۸ھ میں روانہ ہوئے۔

"در شہور سنہ ہزار و ہشت ہجری کہ بندگان خلافت پناھی ظل الٰہی جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً، نواب سیادت پناہ، فصاحت و بلاغت دستگاہ امیر محمد معصوم النامی تخلصاً والبکری مسکناً ولد میر سید صفائی الترمذی اباً وبن سید شیر قلندر بن بابا حسن ابدال جداً[۱] از خدمت قندھار طلب فرمودہ بودند، در حین نزول بدین مقام بنای این بقعۂ خیر نہادند – حررہ العبد میر بزرگ ولدامیر محمد معصوم۔"

میر مراد علی نے اپنے مضمون[۱] میں جس کتبے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ بھی اسی مسجد پر نصب ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر معصوم جیسلمیر میں دس دن اپنے دوست مہاراجہ راول کے ہاں مہمان رہے تھے۔[۲]

آسیر کی طرف روانگی ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء:

میر ۱۰۰۸ھ میں حکم کے مطابق شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ اس وقت آسیر کی فتح کے لیے لشکر کشی کی تیاریوں میں مصروف تھا اور برہان پور کی طرف جانے کے لیے زور

شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میر صاحب کو اور دوسرے امراء کی طرح شاہی رکاب میں جانے کا حکم ملا۔ سندھ کے تسلط کے بعد سیوی(سبی) اور قندھار کی مہمات کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے بعد میر صاحب کی زندگی کے لیے یہ اہم موقع فراہم ہو رہا تھا۔ فاروقی سلطنت کی ۔ جن کے حاکموں کی گجراتی حکمرانوں سے رشتہ داری کی وجہ سے سندھ کے سمہ سلطانوں سے بھی رشتہ داری تھی ۔ آزادی سلب ہو رہی تھی۔

مرزا جانی بیگ جو یرغمالی کی حیثیت سے دربار میں زندگی گزار رہا تھا اور شاہی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ”دین الٰہی“ میں داخل ہو کر بادشاہ کا ”خاص چیلا“ بنا تھا وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا۔

برہان پور-آسیر ۱۰۰۸-۱۰۰۹ھ/۱۵۹۹-۱۶۰۰ء:

فاروقی سلطانوں کا پایہ تخت آسیر تھا جس کے قلع کی ساخت اور مضبوطی مثالی اور شہرۂ آفاق تھی۔ قلعے کی صورت حال دیکھ کر ذخیرۃ الخوانین کی روایت کے مطابق مرزا جانی بیگ نے کہہ دیا کہ اگر ان کے پاس ایسا قلعہ ہوتا تو اکبر کا دس گنا بھی ان کے ملک کو ہاتھ نہ لگا سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا جانی کا یہ کہنا ان کی موت کا سبب بنا۔[۳]

یہ ایک فطری امر ہے کہ حکومت کی قوت اور شاہی اختیار خود بہ خود توسیع پسندی کی خواہش اور ہوس کو ابھارتا ہے اس کے لیے کسی بھی حتمی یا حقیقی جواز یا سبب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ایک ہی سبب کافی ہے کہ ایک فریق طاقتور اور دوسرا مقابلتاً کمزور ہو۔ آسیر کے قلعے کو فتح کرنے کے لیے لشکر کشی کا سبب بھی فریقین کے درمیان طاقت کی غیر متوازن صورتحال تھی مغل سلطنت اپنی اقبال مندی اور عروج کی انتہائی بلندی پر تھی ۔ اور اس کے مقابلے

میں بر صغیر کی دوسری چھوٹی چھوٹی مسلم سلطنتیں قدامت اور دوسری اندرونی کمزوریوں کے سبب انحطاط کا شکار تھیں اور ضعیفی ہی سب سے بڑی لعنت ہے جس کے نتیجے میں خاندانی جھگڑے ابھرتے ہیں اور امراء کی باہمی کشمکش اور اندرونی سازشیں حکومت کی بنیادوں میں شگاف ڈالتی ہیں۔

خاندیش پر حملے کا سبب:

دکن کی مسلم حکومتوں کا تقریباً یہی حال تھا اور یہی کیفیت خاندیش کے فاروقی گھرانے کی تھی۔ جس میں یہ عجیب دستور تھا کہ تخت پر بیٹھنے والا حاکم اپنے اعزاء و بھائیوں اور بیٹوں کو ساری زندگی قید میں رکھتا تھا، تاکہ باہر رہ کر سازش نہ کر سکیں۔ نتیجے میں پسماندگان نا اہل، حکومتی تجربے سے ناواقف، ذہنی اور جسمانی قوتوں سے محروم رہ جاتے۔ راجہ علی خاں فاروقی کا جانشین برائے نام "بہادر خان" تھا۔ تیس برس باپ کی زندگی میں زنداں میں رہنے کے بعد جب تخت پر بیٹھا تو شعور، عقل، سوچ اور عمل کی قوت سے بالکل عاری، ایک نا اہل روح کی طرح انسانی زندگی بسر کررہا تھا۔ اکبر کی نظر دکن کی مسلم حکومتوں پر تھی۔ خاندیش راستے میں پڑتا تھا۔ گجرات سے اکبر کو پیش قدمی کی ترغیب ملی تھی۔ سندھ کا جانی بیگ ذاتی طور پر لاہور میں سلام کے لیے آیا تھا خاندیش کے لیے یہ سبب کافی تھا کہ وہاں کاوالی کمزور تھا ریاست راستے میں پڑتی تھی اور مزید یہ کہ شہزادہ دانیال کی سربراہی میں جو لشکر دکن جارہا تھا خاندیش کے سست سلطان نے ان کی سلامی کے آداب بجانہ لا کر جو گناہ کیا وہ آسیر پر فوری حملے کا سبب بنا۔ ابو الفضل بھی اس دکن کی مہم پر تھا۔ اسی زمانے میں ایسے ناگہانی واقعات رونما ہوئے کہ اکبر کو خود اس مہم پر جانا پڑا۔ پہلے مراد کا چھوٹا

بیٹا (نومبر ۱۵۹۸ء) فوت ہوا اور خود مراد اس صدمے اور کثرت شراب نوشی کے سبب مہم کے دوران (۲مئی ۱۵۹۹ء) کو مر گیا۔ اکبر سلیم کو بھیجنا چاہتا تھا لیکن ان کا مزاج باپ کے خلاف تھا انھوں نے انکار کیا اس لیے مجبور ہو کر اکبر نے شہزادہ دانیال کو روانہ کیا۔ خیال تھا کہ شہزادہ دانیال کے برہان پور پہنچنے پر بہادر خان فاروقی آداب شاہی کے لوازمات بجالاتے ہوئے سلام کے لیے خود حضور میں حاضر ہو گا۔ لیکن فاروقی حکمران حالات کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ انھوں نے شہزادے کی آمد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس لیے ضروری ہو گیا کہ جب تک دکن کی مہم سر ہو اس سے پہلے بہادر خان کو اس گستاخی کی سزا دی جائے۔

اکبر کی آمد:

غیر معمولی حالات نے اکبر کو سخت انتظار کی کیفیت میں مبتلا کردیا تھا اس لیے انھوں نے موقع پر اپنی موجودگی ضروری سمجھی۔ چناں چہ وہ بہ ذات خود ۳۰ مارچ ۱۶۰۰ء برھانپور پہنچے۔ اکبر منتخب امراء اپنے ساتھ لائے۔ مثلاً آصف خان، شیخ فرید اور خان اعظم وغیرہ

اسی طرح میر معصوم بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ ابو الفضل پہلے ہی میدان میں موجود تھا۔ اکبر نے پہنچتے ہی ان امراء کو آسیر پر حملے کا حکم دیا (۱۱ اپریل ۱۶۰۰ء) اور خود بھی آٹھ دنوں کے بعد آسیر کے قلعے کے پاس منزل انداز ہوا۔ اسی موقع پر ابو الفضل کا منصب چار ہزاری کیا گیا کیوں کہ ان کی کوششیں اور جاں نثاری مثالی تھی۔ [۴]

آسیر میں وہی نسخہ استعمال کیا گیا جو ہر "فتح" کے موقع پر استعمال ہوتا رہا۔ یعنی مقامی امیروں کو لالچ، رشوت اور آئندہ کا آسرا دے کر اپنے مالک سے نمک حرامی کرنے پر

آمادہ کرنا۔ یہاں بہادر خاں کے وزیر افضل خان کو دوسرے امراء کے ساتھ بغاوت پر آمادہ کیا گیا تھا۔

اکبر کے لشکرنے پہلے ہی حملے میں "ساپان قلعہ" (۱۲ جون ۱۶۰۰ء) پر قبضہ کیا ۵۔ جس کے بعد (۱۳ اگست لالنگ کا قلعہ فتح ہوا۔ جس میں اناج کا ذخیرہ موجود و محفوظ تھا۔ ۶۔ اسی قلعے پر قبضہ نے خاندیش کی حکومت کو حواس باختہ کردیا۔ اکبر کو قلعے پر قبضے کرنے کی جلدی اس لیے تھی کہ دارالخلافے کی صورتحال ان کو دور رہنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ شہزادہ سلیم باغی ہو گیا تھا۔ اس لیے دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مغل اور راجپوت زیادہ عرصے تک محاصرہ کرنے کے عادی نہیں تھے۔ اس لیے اکبر کہتا تھا کہ آسیر کا مسئلہ فوراً طے ہوجائے۔

اکبر نے اپنے امراء اور ابو الفضل کے بھانجے صفدر خان کو ایک ہزاری منصب پر فائز کر کے انھیں فاروقی امراء کو رشوت کے ذریعے ورغلانے پر مامور کیا۔ جس نے جلد ہی ایسی صورتحال پیدا کی کہ بہادر خاں مجبور ہو کر اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ (۱۰ دسمبر ۱۶۰۰ء) اطاعت گزار ہوا۔ اس شرط پر کہ ان کی عزت، جان اور آزادی بحال رہے گی۔ لیکن ان کی حیرت کی حد نہ رہی جب انھوں نے "شاہی قول" کے برعکس عمل دیکھا بادشاہ نے آتے ہی انھیں شیخ فرید بخاری کے کیمپ میں نظر بند کردیا۔

بہادر خان کے دو عزت مند امراء ملک یا قوت اور اس کا بیٹا ملک مقرب خان نے غلامی میں زندہ رہنے کے بجائے موت کو ترجیح دی۔ نتیجتاً خود کشی کرلی۔ ۷ جنوری ۱۶۰۱ء میں ابوالفضل نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو بھیجا جسے قلعے کی چابیاں حوالے کی گئیں۔

اس طرح آسیر کے قلعے کی فتح اور فاروقی خاندان کے

اختتام کا باب پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ شاہی حکم صادر ہوا کہ یہ فتح ابو الفضل کے نام شمار کی جائے ۔ے جو در حقیقت جنگی فتح سے زیادہ حیلہ جوئی، رشوت ستانی اور امراء کو لالچ دیکر بغاوت پر آمادہ کرنے پر مبنی تھی۔ بہر حال میر معصوم اس جنگ میں موجود تھے جو خدمت ان کے سپرد کی گئی ہو گی۔ وہ انھوں نے یقیناً خوش اسلوبی اور سلیقے سے سر انجام دی ہو گی۔

برہانپور کے سفر کی یاد گاریں:

اکبر نے ۱۶ ستمبر ۱۵۹۹ء میں آگرہ کو خیر باد کہا تھا۔ وہ ۳۰ مارچ ۱۶۰۰ء میں برہانپور پہنچا۔۸ آگرہ سے برہانپور تک ۸۰۰ میل کا فاصلہ تھا جسے بادشاہ نے ساٹھ منزلوں میں طے کیا میر معصوم اپنی عادت کے مطابق راستے میں کتبے نصب کرتے گئے۔ جس کی وجہ سے راستے اور تاریخوں کے متعلق معلومات ملتی ہیں ان کتبوں میں سے کچھ کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱)	فتح پور	بلند دروازہ	۱۰۰۸ھ
۲)	اجین	داخلی دروازہ	۱۰۰۸ھ
۳)	دھار	لاٹ مسجد	۱۰۰۸ھ
۴)	سعدل پور	رودخانہ	۱۰۰۸ھ
۵)	شادی آباد	نیل کنٹھ	۱۰۰۸ھ
۶)	ناگور	خانقاہ	۱۰۰۸ھ

مندرجہ ذیل کتبے بر ہانپور اور آسیر میں میر معصوم نے فتح کے بعد نصب کیے۔

۷)	قلعہ آسیر	داخلی دروازہ	۱۰۰۹ھ
۸)	قلعہ آسیر	جامع مسجد	۱۰۰۹ھ
۹)	برہانپور	جامع مسجد	۱۰۰۹ھ
۱۰)	برہانپور	عادل شاہ کا مقبرہ	۱۰۰۹ھ

آسیر کا قلعہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، ۴ رجب ۱۰۰۹ھ پیر کے دن (۲۲ جنوری ۱۶۰۱ء) و فتح ہوا۔ میر معصوم نے یہ تاریخیں نکالی ہیں۔

نامیا داد الاھی، دادش این فتح عظیم
سال تاریخ الاھی خواہ از دادِ الہٗ

....

چو نامی طلب کرد تاریخ فتح
خرد گفت: بگر فتہ کوہ اسیر

واپسی کے یاد گاری کتبے:

سفر کی واپسی پر میر نے مندرجہ ذیل کتبے نصب کیے۔

۱۱)	شادی آباد	نیل کنٹھ	۱۰۰۹ھ
۱۲)	اجین	عمارت سلطان ناصر الدین	۱۰۰۹ھ
۱۳)	ناگور	خانقاہ	۱۰۰۹ھ
۱۴)	بیانہ	خواجہ باولی	۱۰۰۹ھ
۱۵)	مدھکر	باغ سلیمہ	۱۰۰۹ھ
۱۶)	نرانہ	ترپولی دروازہ	۱۰۰۹ھ
۱۷)	آگرہ	قلعہ	۱۰۰۹ھ
۱۸)	فتح پور	ترپولی دروازہ	۱۰۰۹ھ

سندھ کے لیے یاد گار:

خاندیش کی مہم میں سندھ کے لیے دو اور یاد گار بھی ہیں مثلاً

۱) ۴ یا ۲۲ رجب ۱۰۰۹ء آسیر فتح ہوا۔ جانی بیگ نے قلعے کے استحکام اور بہادر خان کی بزدلی اور کاہلی کو دیکھ کر بقول صاحب ذخیرۃ الخوانین جس رائے کا اظہار کیا اس نے ان کے دل میں ندامت اورخوف پیدا کیا اور ۲۷ رجب ۱۰۰۹ھ کو اس جگہ انتقال کر گئے۔

۲) میر نے اپنی "تاریخ سندھ" کا اختتام برہانپور میں مرزا جانی بیگ کی وفات کے واقعے پر کیا ہے۔[۱۰]

آسیر کی مہم کی اہم تاریخیں:

آسیر کی مہم بہادر خان کی حماقت، امراء کی بزدلی، لالچ اور خاندان کی کمزوری کے سبب نہایت ہی آسانی سے بغیر کسی خاص جنگ اور محنت کے اسی طرح پوری ہوئی،[۱۱] اس جنگ کی اہم تاریخیں اس طرح ہیں۔

اواخر ۱۵۹۸ء	پنجاب میں مسلسل چودہ برس رہنے کے بعد اکبر آگرہ روانہ ہوا تاکہ دکن کی مہم کے قریب ہو۔
۱۶ استمبر ۱۵۹۹ء/۱۰۰۸ھ	اکبر آگرے سے برہانپور روانہ ہوا۔
مارچ ۱۶۰۰ء	دانیال دکن کی مہم کے لیے برہانپور پہنچنے۔ بہادر خان سلام پر نہیں آئے۔
۹ مارچ ۱۶۰۰ء	شیخ فرید بخاری بہادر خان کی طرف گئے۔
۳۱ مارچ ۱۶۰۰ء	برہانپور فتح ہوا۔
۱۰ اپریل ۱۶۰۰ء	اکبر برہانپور پہنچے۔
۱۲ جون ۱۶۰۰ء	ساپان کا قلعہ فتح ہوا۔
۱۳ اگست ۱۶۰۰ء	لالنگ کا قلعہ فتح ہوا۔
۲۶ اگست ۱۶۰۰ء	احمد نگر، شہزادہ دانیال نے فتح کیا۔
۲۹ نومبر ۱۶۰۰ء	مالیگڑھ فتح ہوا۔
۱۰ دسمبر ۱۶۰۰ء	بہادر خان نے بمعہ دو بیٹوں اکبر کی اطاعت قبول کرلی۔
۱۵ جنوری ۱۶۰۱ء	قلعے سے فاروقی امراء اور دوسرے لوگ نکلے۔ابو الفضل دروازہ کے پاس "چبوترہ طفیل خان" پر جا بیٹھے۔

۱۷ جنوی ۱۶۰۱ء	قلعے کی چابیاں فاروقی قلعه دار نے ابو الفضل کے بیٹے عبدالرحمن کے حوالے کر کے قلعے سے دستبرداری اختیار کی آسیر (خاندیش) اکبر کی سلطنت میں شامل ہوا۔ بہادر خان گوالیار کے قلعے میں قید ہوئے۔
۲۲ جنوری ۱۶۰۱ء	(پیر ۱۷ رجب ۱۰۰۹) سرکاری فوجیں آسیر کے قلعے میں داخل ہوئیں۔[۱۳]
۲۱ اپریل ۱۶۰۱ء	دکن کی مہم خان خاناں کے سپرد کر کے، اکبر خود آگرہ روانہ ہو گئے۔
۲۳ اگست ۱۶۰۲ء	اکبر آگرہ پہنچے۔

میر معصوم نے آسیر کی "فتح" اور بہادر خان کے اطاعت گزار ہونے کی جو تاریخیں برہانپور اور آسیر کے کتبوں پر رقم کی ہیں وہ کتبوں والے حصے میں دیکھیے۔

حوالہ جات

۱۔ رسالہ تنویر، کراچی، ۱۹۳۷ء

۲۔ غالباً مضمون نگار سے غلطی ہوئی ہے، یہ کتبہ جیسلمیر میں، بقول دوست عزیزم مالك رام، عمارت کا نام "فقیرون جو تکیو" ہے اس کی جنوبی دیوار پر ہے۔ اور مندرجہ ذیل عبارت سے وہاں ان کے رہنے کا علم ہوتا ہے۔

-- چون درمیان نواب ابوی امیر محمد معصوم
-- وحکومت دستگاه راول بینو (؟ بنیو) نسبت
-- ویگانگی بود بنابران به استدعا راول جیو درین منزل
-- ده روز اتفاق مقام افتاد سنه هزار وده

العبد میر بزرگ کا واپسی کا کتبہ ہے کتبوں کے باب میں اسی سال کے دوسرے کتبے بھی دیکھنے چاہیں۔

۳۔ "اگر این قسم قلعه من می د اشتم اگر حضرت خلیفه الٰهی خود بدولت می آمدند، فتح میسر نمی شد. این ماجرا به عرض مقدس رسید، از نظر حضرت افتاد. دوران چند روز در گذشت." (ذخیرۃ الخوانین ۱:۔۱۸) آسیر کا قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے سب قلعوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ ۲۳۰۰ فٹ سطح سمندر سے اور ۹۰۰ فٹ سطح زمین سے بلند تھا۔ برہان پور سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ قلعے کی حفاظت کے لیے چاروں طرف دوسرے چھوٹے قلعے بھی موجود ہیں۔ مثلاً" کامگھڑ"، "مالیگھڑ" اور "جونامالی" ان قلعوں کی حفاظت کے لیے چاروں طرف قدرتی پہاڑیاں ہیں مثلا "کروہی" اور "ساپان" گویا اصلی قلعہ تک پہنچنے کے لیے حملہ آور کو یہ سب قدرتی ہفت خوان طے کرنے پڑتے تھے۔ قلعے کے چاروں طرف گھنا جنگل ہے اور خود قلعے کی بنیادی دیوار کی حفاظت کے لیے

تین حفاظتی دیواریں موجود تھیں۔ پانی کے لیے کنوئیں اور بے انتہا چارہ موجود تھا۔اناج اس قدر تھا کہ سترہ ہزار سپاہیوں کے لئے کئی سال کافی ہو سکتا تھا تین ہزار توپیں، بارود، گولے اور دوسرا اسلحہ اس کے علاوہ تھا۔

(اکبر نامہ: ۳: ۷۷۸، بیورج ___ Dr. Rizvi 475)

۴۔ اکبر نامہ ۳: ۷۷۱

۵۔ اکبر نامہ ۳: ۷۷۲

۶۔ اکبر نامہ ۳: ۷۷۳، Dr. Rizvi 476

۷۔ اکبر نامہ ۳: ۷۸۰-۷۸۱، Dr. Rizvi 480

۸۔ Dr. Rizvi 471-474

۹۔ Dr. Rizvi 481 بحوالہ فیضی سرہندی میں ۲۲ رجب ۱۰۰۹ھ بیان کی گئی ہے۔

۱۰۔ خواجہ محمد قوربیگی جانی بیگ کی لاش برہانپور سے ٹھٹھہ لے آئے اور مکلی کے خاص مقبرے میں دفن کردی۔ مقبرہ آج بھی موجود ہے (ملاحظہ ہو تحفۃ الکرام، اور مرزا غازی ترخان اور اس کی بزم ادب، حسام الدین)۔

۱۱۔ آسیر کے سلسلے میں اصل مآخذ کے علاوہ نو کتابوں میں سے مندرجہ ذیل دو کتابیں پڑھنا چاہیے۔

1. Religious and Intellectual History of the Muslims in Akbar's Reign, S.A.A. Rizvi, New Delhi 1975.
2. The Deccan Policy of the Mughuls, Dr. Yar Muhammad Khan, Lahore, 1971.

۱۲۔ اپنی کتاب کے ص 474 میں ڈاکٹر رضوی نے اکبر کے پہنچنے کی تاریخ ۳۰ مارچ ۱۶۰۰ء لکھی ہے اور یکم اپریل کے لیے لکھتے ہیں کہ آسیر پر پیش قدمی کا حکم دیا۔

۱۳۔ Dr. Rizvi, 481

باب ۔ ۱۸

ایران کی سفارت اور سفر کی روئیداد

جیسا کہ گذشتہ باب میں بیان کیا جاچکا ہے۔ اکبر کے دربار میں ایران کے ایلچی آتے رہے لیکن اکبر کے دل میں قندھار کے مسئلے کے سبب خلش تھی۔اس لیے ان کی طرف سے کسی جوابی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ سرد مہری کی ایسی روش نمایاں تھی جسے ایرانی دربار محسوس کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنے اندرونی خلفشار اور خصوصاً توران کے شیبانی خان کے خراسان میں اقتدار کے سبب، اس روش کو محسوس کرنے کے باوجود مصلحتاً خاموش رہے۔

سفیروں کی آمد و رفت:

پانچ سال بعد ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں یادگار علی نے سلطان روملو [۱] کو ایران واپس بھیجا اکبر نے اسے بلا جواز روکے رکھا اور واپسی پر مرزا ضیاء الدین کاشی اور ابوالنصر خوافی کو اپنی طرف سے اس کے ساتھ روانہ کیا۔ [۲] شاہ عباس نے قزوین میں اُن کی بڑی پذیرائی کی، کیوں کہ ہندستان کی طرف سے یہ پہلی باقاعدہ سفارت تھی۔ [۳] ضیاء الدین کی روانگی اکبر کے حکم سے سندھ کے راستے لاہری بندر سے ہوئی۔ اور وہ ہرمز کے راستے ایران پہنچا۔ [۴]

اکبر کے بھیجے ہوئے دونوں سفیر ایرانی تھے۔ ایک کاشان کا اور دوسرا خواف کا باشندہ تھا۔ شاہ نے حیرت بلکہ قدرے طنز سے پوچھا کہ ہندوستان، سفارت میں ایرانیوں کو کیوں بیھجتا ہے؟ ہر آنے والا سفیر ایرانی ہے کیا ہندوستان میں انسانوں کا قحط ہے؟

مرزا ضیاء الدین نے جواب دیا کہ اگر وہاں انسان ہوتے تو ہمیں روٹی کہاں سے میسر آتی۔ بادشاہ کو وقتی طور پر یہ جواب پسند آیا اور ضیاء الدین کو اپنے خاص اصطبل سے ایک گھوڑا دیا۔ لیکن ہندستانی حکومت کے چہرے پر جو طمانچہ لگا وہ تاریخ میں دائمی حیثیت کا حامل ہے۔ ۵۔

مغلوں کی ایران اور توران نوازی اور ہندستانی باشندوں سے بے پروائی نیز مقامی لوگوں کو ہیچ سمجھ کر نظر انداز کرنے کی پالیسی نے آخر مغلوں کو تباہ کردیا۔ دھرتی کے باشندوں کی مغلوں کے ساتھ کوئی ہم دردی نہ رہی۔ یہاں کے باشندے انھیں غیر اور بیگانہ سمجھتے رہے۔ انھیں ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ رہی گو کہ مغلوں نے تین صدیاں حکومت کی لیکن یہ پورا عرصہ ہم سایہ ملکوں سے لڑتے، خاندانی جھگڑوں، اندرونی سازشوں اور شکست و ریخت میں بسر ہو گیا۔ چنانچہ جب ان کا تسلط ختم ہوا تو نہ صرف تورانی اور ایرانی امراء جنھوں نے مغل حکومت میں ملک کی معیشت کو خوب لوٹا تھا کی نسل باقی نہ رہی بلکہ خود بادشاہت کی پشت سے بھی کوئی نشانی باقی نہ بچی۔٦۔

ضیاء الدین کاشی جب ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء میں واپس ہوا تو ساتھ میں ایران کا سفیر منوچہر بیگ جو کہ ایشک آقاسی باشی تھا اس کے ہمراہ لاہور پہنچا۔٧۔

اکبر کی پالیسی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایران کا یہ سفیر بھی تقریباً چھ سال بلکہ خود شاہ ایران کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا۔ آسیر کی فتح تک منوچہر بیگ سفرو حضر میں اکبر کے ساتھ رہا۔

میر معصوم کی سفارت:

اکبر نے آسیر کے مسئلے سے فارغ ہوتے ہی سفیر مرزا منوچہر بیگ کو واپسی کی تیاری کی اجازت دیتے ہوئے اپنی طرف سے میر معصوم کو ان کے ساتھ بحیثیت سفیر جانے کا حکم دیا۔

ہندوستان کی طرف سے یہ دوسری باقاعدہ اور پہلی سفارت تھی جسے اکبر نے رسماً نہیں بلکہ خوش اسلوبی، دل جمعی اور حضور قلب سے ایران روانہ کیا۔ میر معصوم کو فوری تیاری کا حکم ملا اور انھوں نے اپنی سرکاری زندگی کے اس اہم ترین مرحلے میں قدم رکھنے کی تیاری شروع کردی۔

خراسان کا فتح نامہ:

ہرات پر ازبکوں کا قبضہ گویا پورے خراسان پر اُن کا اقتدار تھا۔ یہ مسئلہ ایران کے لیے بے حد مشکل اور خطرناک تھا۔ شاہ کی آرزو اور کوشش تھی کہ شیبانی خان ازبک کو اپنی حدود سے نکال کر میدان صاف کردے۔ اکبر کے سلسلے میں شاہ کی نرم پالیسی ازبکوں کے اسی دخل کا نتیجہ تھی۔ شاہ کو خطرہ تھا کہ اکبر، ازبک سے ساز باز کر کے کہیں کوئی الجھن کھڑی نہ کردے اس لیے اکبر کی لاپروائیوں کا درد خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔

محرم ۱۰۰۷ھ اگست ۱۵۹۸ء میں ہرات بالآخر شاہ کے قبضے میں آگیا جس کی وجہ سے شاہ اپنے آپ سے طاقتور محسوس کرنے لگا خراسان کی حدود سے قندھار کی حدود ملتی تھیں ایران، قندھار کی واپسی کا دعویدار رہا۔ لیکن از بکوں کی وجہ سے دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا اب میدان صاف تھا۔ ہرات پر قبضہ کی وجہ سے ایران کے حوصلے بڑھ گئے۔ مرزا منوچہر بیگ ابھی روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایران سے نیا سفیر علی بیگ ہرات

کا "فتح نامہ" لے کر اکبری دربار میں پہنچا۔ فتح نامہ میں ہرات کے قبضے کی تو خوشخبری درج تھی۔

لیکن اس میں نہایت خوبصورت انداز میں قندھار کی واپسی کا اشارہ موجود تھا۔

اکبر کو ایران اور ازبکوں کے ان تازہ بدلتے ہوئے حالات اور اور اس نئی سفارت کے سبب منوچہر والی سفارت کو فوراً واپس بھیجنے پر مجبور کردیا۔

میر معصوم کی روانگی:

میر کو جانے کا حکم ۱۰۰۹ھ میں ملا اس کا علم میر بزرگ کے جیسلمیر والے کتبے سے ہوتا ہے آپ اس خدمت پر ۱۰۱۰ھ میں ہندستان سے روانہ ہوئے۔[۸]

"اکبر نامہ" نے ان کی روانگی رجب ۱۰۱۱ھ/ دسمبر ۱۶۰۲ء عیسویں لکھی ہے۔[۹] شاید یہ تاریخ بکھر سے روانہ ہونے کی ہو۔

سفر کا سازو سامان:

معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب ایران کے سفر پر نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک تو وہ خود شاہ خرچ، عالی ظرف اور کشادہ دل امیر تھے اور دوسری بات یہ کہ وہ اکبر جیسے شاہنشاہ کی طرف سے ایران کے شاہ اور ملک کی طرف جارہے تھے جہاں ہندستان کی دولت اور دادو دہش سے متعلق کئی داستانیں موجود تھیں اس لیے ظاہر ہے کہ انھیں ہر لحاظ سے مقابل فریق اور ملک پر برتری حاصل کرکے اثر انداز ہونا تھا۔منوچہر بیگ ایشک آقاسی باشی، پانچ سو سوار قزلباش چاق وچو بند، اپنے ساتھ لائے تھے۔ تحفے تحائف کے علاوہ ایک سو تازی اور گرجی گھوڑے ان کے ساتھ تھے۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت اس زمانے کے لحاظ سے پانچ ہزار

تومان ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ تین سو تھان نفیس زربفت کے، ایران کے مشہور مصوروں کی نادر تصاویر اور معروف نقاشوں کے تیار کردہ نقش و نگار اور گراں بہا قالین جن میں سے ہر ایک تین سو تومان سے کم قیمت نہیں تھا، بھی ساتھ لائے تھے۔ ۱۰؎

ظاہر ہے کہ میر معصوم اس کے مقابلے میں دگنے اہتمام سے اکبر کی شان اور ہندوستان کی دولت کا بھرم قائم رہے اسی لیے میر نے اپنے ساتھ بے انتہا دولت لی اور بے شمار مختلف قسم کے تحفے تحائف اور ایک ہزار سوار اور پیادہ ساتھ لیے۔ قندھار کے ایک کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر بزرگ انکا بیٹا بھی سفر میں ان کے ساتھ تھا۔

اس سفر میں ایران جیسے دور دراز ملک میں ہندوستانی ثروت، مغلوں کی بے اندازہ دولت، حکومت کی عزت اور شہرت تمام پہلوؤں سے نہ صرف تحفظ کرنا تھا بلکہ معروف روایات کو اور زیادہ نمایاں کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ اس دریا دل امیر نے نمود و نمایش، شان و شوکت اور مال و اسباب جمع کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ایک ہزار شاہ سواروں اور جوانوں کا یہ قافلہ یہاں سے رخصت ہو کر رجب المرجب کے متبرک مہینے میں اس ملک کی طرف روانہ ہوا جسے یہاں ولایت کہا جاتا تھا۔

شاہی خط کی روشنی میں میر کی شخصیت:

میر مرحوم اکبر کا جو خط شاہ ایران کی طرف لے گئے تھے اس کا متن ذیل میں درج ہے۔ اس میں میرصاحب کو جن الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے اس سے دربار میں ان کی عزت، حیثیت اور خاندانی وجاہت پر روشنی پڑتی ہے نیز ان کے اوپر شاہی اعتماد کا اندازہ ہوتا ہے عبارت کا انداز کچھ یوں ہے:

"سیادت و نقابت آثار، افادت و اضافت دثار، محرم
بزم جلالت اساس، مخصوص الطاف و اعطاف
عنایت اقتباس، امین الملک میر محمد معصوم بکر

کہ از اجلۂ سادات این بلاد است و بہ مزید مراتب
اخلاص و رواتب اختصاص مخصوص و ممتاز۔"

خط میں اکبر نے اپنی فتوحات کی مشکلات اور دیر سے سفارت لوٹانے کے اسباب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کچھ ایسے معاملات بھی ہیں جو خط میں نہیں لکھے جاسکتے۔ وہ سب میر صاحب زبانی بیان کریں گے خط کے متن سے میر صاحب، کی شخصیت کے متعلق مندرجہ ذیل تاثر قائم ہوتا ہے :

۱۔ ایران جاتے وقت میر معصوم "امین الملک" کے منصب پر سرفراز ہوچکے تھے جس کا اشارہ اس خط کے علاوہ اکبری عہد کے دوسرے کسی بھی ذریعے سے نہیں ملتا۔ بظاہر روایت کے مطابق لکھا گیا ہے کہ جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت "امین الملک" بن کر بکھر گئے۔

۲۔ ان کا خاندانی وقار اور عظمت مسلمہ تھی۔ سندھ کے جَیّد اور چیدہ سادات خاندان کا معزز فرد ظاہر کیا گیا ہے۔

۳۔ انکی ذات شخصیت قابل احترام اور شاہی اعتماد کی حامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ نازک مسائل جن کا خط میں لکھنا مناسب نہیں تھا وہ انھیں زبانی طریقے سے سمجھائے گئے تھے۔

خط کا متن!

خط کا فارسی متن ذیل میں دیا جاتا ہے ۱۱۔ تاکہ موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کا جزو بن جائے۔ خط میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی اہم بات نہیں ہے۔ بقیہ فقط عبارت آرائی، لفاظی اور رسمی باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور محض خط کی رسم اور روایت کو پورا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔

سواد کتابت خاقان اکبر اعظم (اکبر پادشاه) به نواب اشرف اعلی اکرم (شاه عباس ماضی)

آغاز تحریك خامهٔ نغمه طراز، و افتتاح تحریر نامهٔ نکته پرداز، به نام بی آغازی سزاست، که وجود تمام غیر وجود او را انجامی و آغازی نیست، و در سر انجام مهام انفسی و آفاقی او را وزیری و مشیری و انبازی نه عدم بینوا را که در نها نخانهٔ نیستی و انزوا خزیده بود، به زور قهرمان استیلا برگ وجود و سامان شهود داد، و معالم عالم بی سر و بن رابگفتن دو حرف "کن" پیش از پیوستن کاف به نون، اینهمه اعتبارات و شوون از جواهر مجرده و مادّهٔ عقول و نفوس و اجرام و اجسام نورانیّه و ظلمانیهٔ کواکب وافلاك، و اقسام الوان و اعراض بوقلمون از محدّب فلك الافلاك تامرکز خاك ارزانی داشت، و از زمرهٔ جمیع مکوّنات،نوع انسان را که نسخهٔ جامعهٔ ملك و ملکوت و مجموعهٔ متنوعه مصنوعه از جبروت و لاهوت است، منظور نظر عنایت اثر فرمود، گاهش متوج بتاج اعزاز و نور "خلقنا الانسان فی احسن تقویم" می نماید،و گاهش مشرف به شرف اختصاص "ولقد کرمنا بنی آدم" می فر ماید، و بعد از آن از جمله تمام افراد آن نوع مفتاح صلاح و نجاح نشأه معاش و معاد ایشان را بنا بر و فور اتصاف به وصاف ربانی، و اتسام به صنوف اعطاف و الطاف رحمانی، در قبضهٔ اقتدار و پنجهٔ اختیار انبیا و رسل، که راهنمایان طرق و هدایت فرمایان سبل اند، نهاد. تا به نور"امر و نهی" مقتبس از شعاع وحی ایشان، گم گمشتگان

بیدای ضلالت و طغیان، و هایمان مفاوز جهالت و خذلان، در مهاد علم و عرفان بغنوند، و اختتام این نسق و نظام، درنگین خاتم ختمی انتظام علیه افضل الصلوٰة وا کمل السلام تعبیه فرمود، وتتمیم این مرام را به اولاد فخام و احفاد عظام آن سرور انام الی یوم القیام متعین نمود. اللهم صل علي نبیه وعلی اخیه و بنیه ما دارالفلك السمتدیر و مادام ضیاء الشمس و القمر المنیر. و پس ازین مراتب مواهب، نظام عالم و انتظام مهام بنی آدم را در عهدهٔ سطوت سلطنت و صولت دولت پادشاهان جهان پناه و شاهنشاهان عالم دستگاه نهاد که گاه به سرپنجهٔ قهر و کین از اعدای دولت و دین ستانند، و گاه با یاری لطف ومهر و مرهم مرحمت و عنایت بر جراحت دلهای مظلومان رسانند.

امابعد، از ستایش و نیایش دارای گیتی آراآفرینهای بسزاء، و تحیتهای با برگ و نواء، و عالم عالم تواضع دلکشاء، وجهان جهان پرسشهای دلاراء، تحفهٔ مجلس بهشت نماء، و هدیهٔ محفل جنت نشو و نمای نواب قدسی القاب اقتدار کامران و کامگار، اعنی عالیحضرت گردون بسطت فلك اقتدار ملك انصار آن از میان شهر یاران روز گار بر گزیده، دادای کردار، شهر یار ممالك بی مثلی و یکتایی، شهسوار مضمار دانایی و توانایی.

با ادب دلپسند، باسخن جانفروز
با خرد بیکران، باهنر بیشمار
باهمه عالم جواد، و زهمه گیتی فزون
در همه میدان تمام بر همه دانش سوار

کشور کشای ممالک ستان، مشتری سیمای مریخ سنان، دارا افسر، اسکندر ظفر، کاووس حشمت، سلیمان حشر، پسندیدهٔ خواطر مشکل پسندان، یاد گار پادشاهان جهان، خلف اخلاف سید المرسلین، نقاوهٔ خاندان طیبین و طاهرین، گلدستهٔ حدایق و بساتین ائمه معصومین،نو باوهٔ ریاض سلاطین و خواقین روی زمین، صاحب نسبی که چون مسرع وهم در شاهراه بیان آن باقدام همم، از نام نامی او تا به اسم سامی آدم تدرّج نماید، پای اندیشه اش جز بساط شاهان دنیا و دین، یا اولیای صفوت گزین، یا ائمه معصومین یا انبیاء مرسلین نساید، رشك افروز ماثر پادشاهان، قاعده آموز فطرت سلاطین زمان، ظلمت سوز تاریکی ظلم و عدوان، بدعت گداز رسوم جور و رقوم طغیان، اعنی شاه آگاه والا جاه و شهنشاه جهان پناه ممالك دستگاه، فریدون اساس جمشید التباس خورشید اقتباس، ابوالفوارس قواما للسطنه و العظمة و الحشمة و الابهة و الجلال و الجمال و الکمال والکبریاء و الدنیا و الدین شاه عباس که دامان عمر و زمان ابد تو امانش به دامان روز قیامت باز بسته باد، و به نور حضور و سرور، همواره فرخنده و خجسته بوده، دعایم ارکان دین و ملت، به زور بازوی پاس و سطوت آنحضرت برپا باد وهم قوایم ملك و دولت بقوت نیروی بأس و بطش آن اعلیحضرت بر جاه آمین! یا رب العالمین!

و بعد از سپاس و ستایش و نیاز و نیایش، اولاً تصویر ضمیر الهام پذیر آنحضرت که جام جهان نمای اسرار ملك و ملکوت و لوح محفوظ آثار جبروت و لاهوت است، آنکه هر چند به حسب ظاهر دیدهٔ حق

بین مطالعہ طلعت عالم افروز شاهی، و مشاهدهٔ سیمای نور اندوز پادشاهی ننموده است، و ادراک کحل الجواهر وصال در توقف اتصال دارد، اما وفور استماع اوصاف تمام اتصاف پادشاهانه، و کثرت اصفای کمالات و ملکات شاهنشاهانه وشرف انعقاد معاقد قواعد وداد، واقانین قوانین صادقت و اتحاد، که اباًعن جدٍ میان این دو سلسلۂ علیه ابد امتداد، سمتِ استحکام و استمداد یافته ، نه چندان مورث صداقت و داد و ثمر محبت و اتحاد شده که در طی طوامیر بیان تحریرپذیر و تصویر سمیر تواند شد. رجاء واثق و آمل صداقت که تا فلك را دور است و کواکب راسیر، این طورمحبت فزا و این رسم صداقت انتها، منظور انظار کبریا آثار بوده، تا قیام روز قیام ریاض صداقت اهتمام را به آبیاری ارسال رسل و رسایل، و مدد کاری ایصال سبل و وسایل شاداب دارند، و اشجار آثار بی شمار صداقت شمار را بابن و تیره برومند داند، و از آینۂ خاطر جهان بین به صیاقل صداقت نامهای رنگین، زنگ وحشت جدایی را زدایند، و مواد دوستی را ازدیاد فر مایند، و از چشمۂ نوش وداد،آب حیات محبت و التفات در کام جان عطشان ریزند،تا فضای ضمیر منیر صداقت سمیر را از هوای اروای میاه مراسلات رشك گلستان ارم و روضۂ جنان گر دانند.

ثانیاً آنکه کتاب واجب الاعظام و خطاب لازم الاکرام که در صحبت امارت و ایالت مقام رفعت و قربت مرام، طرازندۂ محفل جلالت، و برازندۂ محمل

رسالت، منوچهر بیگ ایشك آقاسی باشی که به مزید فراست و دقیقه شناسی و وفور کیاست و نیکو اساسی، و استجماع شرایط رسالت و استیفای رواتب سفارت، بر امثال و اقران و اکفا و احوان سمت مزیت رجحان دارد، در اطیب اوقات و ازمنه، وایمن ساعات و آون، کالوحی نازل من السّما، چهره نمای حقایق زمینی و آسمانی و آگاهی قرای درونی و برونی گردید،و تحریك سلسه وداد صمیمی، و تهییج مواد اتحاد قدیمی راکه فیمابین این سلسلهٔ ابد دامان، و آن دولت علیه قیامت توامان، به عهود و ایمان مؤکده و مواثیق و پیمان مشیده، صورت احکام و اتقان پذیر فته بود، به تجدید در میان این دو دوستدار روابط جسمانی و روحانی، و آن نگهدار روایت صوری و معانی، به صد تاکید اول تشیید و تایید یافته است، باعث تر سببی و موجب تر مطلبی گردید. و از تحریر مراتب فتوحات غیبی، و تقریر مواهب فیوضات لاریبی، که به آبیاری شمشیر آتشبار صاعقه کردار آن خسرو جهاندار، در تسخیرانحا و ارجای بلاد خراسان صینت عن الحدثان ، که ملك موروث و مکتسب آن پادشاه عالیجاه ممالك ستانست، وقوع یافته، و به نفس نفیس انفس و ذات مقدس اقدس، مباشر رزم اعدای دین و دولت شده بودند، و برکات اشتغال آن ذات قدسی صفات، آن بلاد عدیم المثال از تصرف دشمنان آن دولت ابد اتصال، به تسخیر دوستان آن سلطنت ابد توامان انتقال یافت، در صحبت شایان مرتبهٔ سفارت میرزا علی بیگ قورچی خاصهٔ شریفه عز انبعاث یافته بود، برچه سان به منصه انها و اعلام جلوه نماید، که چگونه مواد ابتهاج و ترویج در تهییج آمده، در چه

درجه موجب تفتیح و تفریح ضمیر سمیر گردید. و اکنون امید واری به استعانت و یاری حضرت باری آنست که هرچه، بیش ازین به ضرب تیغ بیدریغ آبای کرام نهاد، و اجداد معدلت بنیاد آن پادشاه با دین و داد، در حوزهٔ تصرف اولیای دولت ابد امتداد در آمده به همان عنوان، بل به چندین مرتبه زیاده ازان، به مساعي جميلهٔ آنحضرت، با نهٔمرت و دواعی نهضت مقرون، و به رکضت آن شهسوار مضمار عزت، باز در تصرف اولیای دولت ابد صولت در آید تا مضمون صدق مشحون:

دشمن آتش پرست باد پیما را، بگو
خاک بر سر کن که آب رفته باز آید بجو

به خوبتر وجهی بر منصهٔ ظهور جلوه گر آید والحق کارو هنجار درمیانست و تکلف و تصلف بر کنار که همای رایت مشتری آیت، و عقاب سایهٔ چتر ماه مایهٔ آن طوق نه گردن اعدای دین و دولت، ظلمت سوزتاریکیهای ظلم وعدوان ارباب طغیان، که از دو طرف متوجه ممالك آذربائیجان و بلاد خراسان شده بودند یکی قیصر روم که شرح عدّت و آلت و استعداد لشکر واستبداد حشم و حشر او و از وصف و بیان مستغنی است و دوم خاقان ترکستان که کثرت عساکر و انصار و بست ماثر و اقطار او، از غایت استهار مفتقر به ابراز و اظهار نیست.

یکی به توپ، چو ابرو سر بشك اوسندان
یکی به تیر، چو باد و سموم او پیکان

نشدی، اکنون مدتی بود که بوم ایران از دستبرد ظلم و طغیان آنچنان دشمنان، کنام جغد ویرانی، و آشیان بوم خرابی شده بود، و علاوهٔ آن فرو نشاندن غبار هرج و مرجی است که هم از لشکریان ایران و بغی و طغیان غازیان ظفر فرجام، و صوفیان صدق انجام فتنهٔ فایزه قزلباش و ترکمان بر رخسار ممالك عراق و خراسان نشسته بود، که به اعتقاد آگاهٰن مراتب ملکداری، کار این دشمنان درونی ساختن، و بیرون کردن این ماده فاسده از بدن بیمار ایران - که بحران ظلم و طغیان آن اهل بغی و عدوان - قریب به رفتن بالکلیه و مشرف به زوال حال مآل بالمره شده بود، بسی مشکلتر و صعب تر می نمود، از همه والاتر و بالاتر، مرتبهٔ سیاست ذاتی و عدالت صفاتی است که ذات فرشته صفات آن شهسوار عرصهٔ عدل و داد به آن متصف و مجبور است، چه به تکرار به مسامع عز و وعلا رسیده هر که پیش ازین در بلاد ایران از شعلهٔ ستم ظالمی داغ المی در جگر داشته یا دارد، فی الحال به مسامع جاه و جلال رسیده وسی رسد، در لحظه یی و ساعتی به مرهم داد پرسی و غور رسی جراحت ظلم او اندمال می پذیرد.

بر دوام تو، دلیلی است قوی عدل تو، زانك
بر نگر دند زهم تا به ابد عدل و دوام

......

عدل کن زانکه در ولایت دل
در پیغمبری زند عادل

......

عدن تو، قندیل شب افروز تست
مونس فردای تو، امروز تست

و از برای ایصال این اخبار، مدتی بود که در خاطر ملکوت ناظر می گذشت که صادق الاخلاص و العقیده منوچهر بیگ و میرزا علی بیگ فرستاده شوند، لیکن چون بعضی زمینداران خاندیس و دکن چندی بود که سر از ربقهٔ فرمان برداری وطاعت گزاری پیچیده، در بادیهٔ غوایت و سر گردانی سالك و هالك بودند، اردوی گیهان پوی به عزم گوشمال آنها در نهضت و سیر در آمد، وچون والی خاندیس سالها بود که اباعن جد طوق بند گی این در گاه را در گردن اطاعت و غاشیه عبودیت این بار گاه را بر دوش طاعت داشت، لیکن به اغوای جمعی مفسدان جادهٔ قویم طاعت داری و شارع مستقیم خدمتگذاری را گذاشته سالك بی غولهٔ گمراهی گردید، وبه حصانت حصن فلك اساس ومتانت قلعهٔ گردون مساس مغرور شده، تحصن در آن قلعهٔ فلك بنا را منجی دانست، از دستبرد منجنیق و پامردی تهور شاربان رحیق توفیق، و متجرعان کاسات تحقیق، که به زخم بیلك دیده دوز، وضرب ناوك سینه سوز، کواکب ثواقب را در روز از برج شب افروز بیا بان آورند و عروج بر معارج افلاك و صعود بر مناهج شعری و سماك را کمینه کار و کهینه بازار خود شمار ند. تصور ننمود، تا آنکه بنا بر حفظ ناموس سلطنت عظمی و مراعات قانون خلافت کبری در قلع و قمع اعدا واخذ وفتح آن قلعهٔ فلك بناء که مقیمان

آن از ورود قضا و حوادث سما، قلعهٔ امن و قلعهٔ امان ارتقا داشتند، عزم ملوکانه در بسته شد،وبا آنکه به ضرب تیغ و تیر غازیان جهانگیر، آن قلعهٔ بی نظیرمفتوح گردید، لیکن چون عجز و ناکسی و نادانی ونارسی آن نادان مراتب قدر ناشناسی، معلوم ضمیر احاطت پزیر بود مراحم بی دریغ خسروانه، تدارك حال عاجزانهٔ او نمود، و جان بخشی کرده، اخوان و اولادو اقربا و احفاد اورا ملحوظ نظر عنایت اثر فرمود . وچون خود سایل نشست قلاع بود، در قلعهٔ فلك مدار گوالیار- که در مابین قلاع هند بل قلاع هر دیار به صفت استحکام و اعتبار، امتیاز و اشتهار دارد- جای داده شد. و باز رایت عز و جلال به مرکز اقبال که دار الخلافه آگره است، نزول نمود . در ینوقت ارسال منوچهر بیگ در خاطر ملکوت ناظر پرتو انداخت ، و به جهت رسانیدن اخبار محبت و وداد و یگانگی و اتحاد،سیادت و نقابت آثار، افادت و اضافت دثار، محرم بزم جلالت اساس مخصوص الطاف و اعطاف عنایت اقتباس امین الملك میر محمد معصوم بکری که از اجلهٔ سادات این بلاد است، وبه مزید مراتب اخلاص و رواتب اختصاص مخصوص و ممتاز، به شرف ادراك ملازمت وعز بساط بوسی محفل فردوس مرتبت فرستاده شد، که مکنونات خاطر دوستی ناظر را به زبان بلاغت بیان معروض دارد، و بعضی مقدمات موروثهٔ مراتب وداد به زبان او تفویض نموده شد که به عرض اشرف رساند، مرجو آنست که این صوب باصواب را از خود دانسته در، گاه و بیگاه، به ارسال مراسلات و

مکاتبات، و تقریر و تحریر، حالات دلپزیر و مقالات بی نظیر، خاطر ملکوت ناظر را خوشوقت و خوشحال و مسرور شاد کام می ساخته باشند، وبر جوع مہمات و مطلوبات که ازین صوب صورت پزیر میشده باشد، مسرور می فرموده باشند.

ہمواره انتظام مہلم فرق انام، مفوض برای عالم آراء، وشمشیر جہانکشای آن پادشاه جمجاه ستاره سپاه بوده، کلال و ملال در ہیچ باب و ہیچ حال پیرامون حواشی خاطر ملکوت ناظر نگرداد.

ہمیشه حشمتت در چاره سازی   به قادر سوزی و عاجز نوازی

سپہرت رام در فرمانروایی   خدایت یار در کشور کشایی

....

این دعا را قدسیان از عرش آمین گفته اند.

روانگی کے راستے:

خیال ہے کہ میر صاحب اور منوچہر بیگ ساتھ ہی گئے دارالسلطنت سے جیسلمیر کے راستے بکھر پہنچے وہاں سے یہ قافلہ کس راستے سے گیا، کہاں کہاں پہنچا، کن شہروں سے گزرا یا ٹھہرا اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی مسلسل روایت یا رودادنہیں ہے۔ کچھ کتبے ملتے ہیں کچھ کتابوں میں ضمناً ذکر آگیا ہے جس کی بنیاد پر میر صاحب کی آمدورفت کے راستوں کی کڑیاں کسی حد تک متعین کی جاسکتی ہیں نیز کچھ روایات سے ایران میں ان کی مصروفیات کا بھی اندازہ لگاسکتے ہیں۔

میر صاحب بکھر سے اہم امور نمٹانے اور ذاتی سازو سامان درست کرنے کے لیے سندھ اور بلوچستان عبور کر کے قندھار گئے دلآرام فراہ ١٢ء کے راستے ان کے بیٹے میر بزرگ کے نصب کردہ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ١٠١٢ھ میں یہ قافلہ وہاں سے آگے بڑھا۔

فراہ سے ہرات گیا ہوگا جہاں سے تایباد اور شیخ زین الدین کے مقبرے کی زیارت کرنے کے بعد، موجودہ ایران کی حدود میں داخل ہوا۔ آج کل بھی یہی راستہ ہے اور مغلوں کے دور میں اور اس سے پہلے بھی یہی راستہ تھا۔

تربت جام:

ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد سندھ سے مایوس ہو کر جون سے سازو سامان لے کر جب ایران گیا اسی راستے سے تربت جام پہنچا اور وہاں اپنی غربت اور آوارگی کا یادگار کتبہ نصب کیا۔ جو آج تک حضرت احمد جام زندہ پیر کی درگاہ میں موجود ہے۔ ١٣ء میر بھی وہیں پہنچے اور انھوں نے بھی تربت کے کٹھرے کے مغربی کنارے پر یہ کتبہ نصب کیا جو ان کے کتبات اور شاعری میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرشد نامی شیخ گرامی　　احمد جامی عمر برّہ
سال و فاتش گر تو بجوئی　　احمد جامی قدس سرّہ

حررہ محمد معصوم بکری نامی ١٠١٢ء١٤ء

اندازہ ہے بلکہ قرین قیاس بھی یہی ہے کہ بحیثیت ادیب، شاعر اور نسبی سلسلے کے سبب، آگے چل کر راستے میں لنگر گاؤں میں شاہ قاسم انوار کے مزار کی زیارت بھی کی ہوگی۔ اُن کے اپنے تاریخی ذوق اور تسکین کے لیے ضرور سبزوار اور نیشاپور پہنچ کر عطار اور خیام کے مقبرے دیکھ کر مشہد مقدس پہنچے ہوں گے۔ امام رضاعلیہ السلام کی زیارت

کے بعد امام غزالی اور فردوسی طوسی کے مقبروں پر بھی ضرور گئے ہوں گے۔ ہر راہ رو کے لیے یہ مقامات جاذبیت اور کشش کا سبب ہیں۔ امام رضاعلیہ السلام کے سلسلے میں ان کا مندرجہ ذیل قصیدہ اسی موقعے پر لکھا گیا۔ جس کے لیے تقی کاشی نے لکھا ہے:

"قصیدہ ایست کہ درین سفر خیر اثر بہ شرف زیارت، حضرت امام الجن و الانس، سلطان الاولیا وبرھان الاصفیا، شفیع المذنبین یوم الجزا علی بن موسیٰ الرضا (علیه افضل التحیة والثنا) رسیدہ، درسلك نظم مرتب نمودہ اند۔[۱۵]

قصیدہ

خواھم سری بہ گنبدِ مینا برآورم
زین دامگہ سری بہ تماشا بر آورم

از آہ، دمبدم بہ فلك، نرد بان نھم
خود را ازبن نشیب بہ بالا بر آورم

آراستند از پیِ ما، باغ خلد را
خواھم سری بہ دیدن آنجا بر آورم

خواھم بسانِ روح، مجرد شوم زخود
تا خویش راَ بہ مسکن علیا بر آورم

پرواز کردہ دل بہ سوی قاف قرب دوست
ھر دم زشوق، شھپرِ عنقا برآورم

زین نقش پای ناقہ، کہ ھر روز گم شود
پی گیر کنم، پَیِ این پا برآورم

خواھم چوگرد باد کنم دھر، گردمی
پرکار وش سر از خط دنیا برآورم

دنیاست کم زیك سرمویی، کجاست چشم
کاین موی را ز دیدۂ بینا برآروم

هر شب درین رواق بلند، از شگاف صبح
خورشید وار سر به تماشا بر آورم

زاهن دلیِ دوست، اگر ناله میکنم
آتش چو برق از دلِ خارا بر آورم

تا دامنش کشم به سوی خویش، دمبدم
دست هوس، ز جیب تمنا برآورم

از شوق ماهروی تو، برهرسرِ نگاه
چشمی دگر، زبهر تماشا برآورم

در آرزوی روی تو، هر شام تا سحر
دست از پیِ دعا به تقاضا بر آورم

دردِ ترا، به قیمت صد جان، خریده ام
مشکل دگر که، دل به مداوا بر آورم

بندم زبان گفت و شنو، زاهل روز گار
حرفی زوصف خسروِ والا بر آورم

در مدحت علی رضا، شاهِ اولیا
هر دم زبان چو بلبل گویا بر آورم

از بهر طرف مرقد آن شاه جن و انس
خواهم ز دیده از مژه ها پابر آورم

اول قدم، به کرسی خورشید، پانهم
تا سر ازان حریم معلا بر آورم

بوسم چو آستان درش را به کام دل
کام دل هزار تمنا بر آورم

خواهم پیِ مشاهده چون خوشهٔ عنب
سر تا به پای، دیده ز اعضا بر آورم

بینم که سجود درش عرش زیرپا
شد فرض ازان که سجده مثنیٰ بر آورم

از بس که بیکنار بود ابر بخششت
من دامنِ امید چو دریا بر آورم

کلکِ مراست معجزۂ عیسوی ازان
از نوک خارش، اینهمه خرما بر آورم
گردد قلم عطارد و خورشید محبره
از آستین چو دست به املا بر آورم
هر گاه مشکبار شود دوده ام ز کلک
دود از دماغ عنبرسا را بر آورم
در روز گار، مایۂ کان دگر شود
هر نکته، کان ز کلک گهرزا بر آورم
هنگام فیض بخشی و وقت اجابتست
نامی بیاکه، دست دعارا بر آورم
یارب! به حق قبلۂ هشتم شهید طوس
کاندم که جان زقالب سودا بر آورم
جسم مرا به مشهد آن مقتدا، سپار
تا آنکه، سرز جنت اعلیٰ بر آ ورم

کاشان :

میر صاحب ۱۰۱۲ھ کے آغاز میں کاشان پہنچے۔ وہاں پر ان کا کچھ دن قیام رہا۔ ”خلاصۃ الاشعار“ کے مصنف تقی کاشی(۹۴۶۔۱۰۳۷ھ) سے ان کی یہاں ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں اسی تذکرہ نویس نے میر صاحب کی صورت و سیرت کی تصویر کشی نہایت محبت و احترام سے کی ہے۔ انھوں نے ان کے علم و فضل، شرافت اور انسانیت، شعرو سخن، دوستی اور دوست نوازی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

”اس نے (کاشی) انسانی شکل میں، گویا فرشتہ دیکھا۔ ان کی ذاتی صفات کی وجہ سے ایک دنیا مسخر تھی۔ ان کی گفتگو آب رواں کی مانند تھی، روح کو راحت پہنچاتی تھی۔ ان کی طبیعت کی لطافت، روح کے

جوہر کی مانند فرحت بخش اور غم غلط کرنے والی
تھی۔ حلم، شفقت، مرحمت، وقار، تمکنت، جلال اور
کمال سب ان میں یکجا تھے۔" ١٦۔

یہ محض لفاظی اور خیالی تعریف نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر میر صاحب کی ساری زندگی یا ان کے کتبات کی عبارات یا آثار کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ایک لفظ صحیح اور سچا معلوم ہوتا ہے۔

جود و سخا میں شہرت:

میر صاحب جہاں جہاں سے گذرتے وہاں امراء اور سرکاری منصب دار ان کا استقبال کرتے تھے۔ شایان شان استقبال کے ساتھ شاندار دعوتوں کا اہتمام بھی ہوتا ان میں سے ہر ایک انھیں تحفہ تحائف دینے کی کوشش کرتا لیکن اس شاہانہ مزاج کا حامل امیر اور سیر چشم سید زادہ شہزادہ نہایت نرمی اور سلیقہ سے انکار کرتا۔ تقی کاشی نے لکھا ہے کہ: "ان کے برعکس وہ ہر ایک کو تحفے تحائف دیتے رہے، جو ان سے ملا، جو ان کے پاس گیا، یا ان سے شناسائی ہوئی ان سب کو حیثیت کے مطابق تحفہ تحائف دیتا۔ اس طرح سب کو احسان مند اور گرویدہ بناتا گیا۔ ١٧۔ انھوں نے ہر قسم ہر درجہ اور ہر طبقے کے ملاقاتی کو زیر بارمنت کیا۔ عالم، ادیب، شاعر، حتیٰ کہ مجلسی (ظرفا) لوگوں تک کسی کو بھی اپنے یہاں سے خالی ہاتھ جانے نہ دیا۔

یہ طریقہ نہ صرف کاشان میں اختیار کیا بلکہ سارا سفر ایسی ہی شان و شوکت سے طے کرتے، میر صاحب اپنے سفر کو داستان اور ضرب المثل بناتے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے رہے، کیوں کہ اکبر کے ایلچی تھے۔ اس لیے ان کے پیش نظر اپنے بادشاہ کی شان بھی تھی۔ اس کے علاوہ سید کی اپنی افتاد طبع بھی شاہانہ تھی۔ جو کرتے تھے وہ نہ صرف ان کا شیوہ تھا بلکہ یہ انھیں زیب بھی دیتا تھا۔

تبریز:

تقی کاشی کا قول ہے کہ میر کاشان سے تبریز گئے یہاں خوشگوار آب و ہوا کے سبب ٹھہرے اور راستے کی تھکن دور کی۔[18] اپنے ہم رکاب لوگوں کو بھی سانس لینے کا موقع دیا۔ وہاں قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شاہ عباس ایروان میں عثمانیوں سے جنگ میں مصروف تھا۔ آگے کے پروگرام کے لیے بادشاہ کی اجازت اور حکم کی ضرورت تھی۔

خیال ہے کہ میر صاحب مشہد کے بعد ری (موجودہ تہران) آئے جہاں سے قم، قزوین، کاشان، زنجان، سلطانیہ، بروجرد، ہمدان، سنندج، مراغہ کے راستے سے تبریز پہنچے۔

آذر بائیجان:

صفوی بادشاہوں کا خاندان اصل میں آذر بائیجان کا تھا۔ اوردبیل ان کے بزرگوں کا آبائی وطن اور آخر میں مدفن بھی رہا، تبریز کچھ عرصہ دارالخلافہ کا مرکز بھی رہا۔ تیس برس سے عثمانی ترکوں کا تبریز، نخجوان اور ایروان کے حصے پر قبضہ تھا۔ شاہ عباس نے اپنے اس آبائی ملک کو واپس لینے کے لیے لشکر کشی کی تھی۔

شاہ عباس 7 ربیع الثانی ۱۰۱۴ھ اصفہان سے روانہ ہوئے تبریز تک پہنچنے میں انھیں بارہ دن لگے۔ اصفہان، دولت آباد، کاشان، قزوین، میانج، تبریز[19] انھوں نے یہی راستہ اختیار کیا۔ ممکن ہے کہ میر معصوم نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہو۔ بہر حال اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ربیع الثانی ۱۰۱۴ھ کے بعد جمادی الاول یا جمادی الثانی میں میر صاحب کاشان پہنچے، جب کہ بادشاہ آذر بائیجان گیا۔

عالم آرائے عباسی کے مطابق تبریز کے باشندے ترکوں سے تنگ آچکے تھے۔ اسی لیے تبریز فوراً ہی فتح ہو گیا۔ اور شاہ عباس

نخجوان اور ایروان ۲۰۔ کی طرف بڑھا۔ جس وقت میر تبریز پہنچا اس وقت ایروان کا محاصرہ جاری تھا۔ ترکوں نے مکمل طور پر قلعہ بندی کی ہوئی تھی۔ شریف پاشا وہاں پر عثمانی حکومت کی طرف سے حاکم تھا۔تبریز کا حاکم علی پاشا قتل ہوچکاتھا۔ تبریز کا سارا شہر تقریباً تباہ و برباد ہوچکاتھا۔ شہر میں مشکل ہی سے کوئی جگہ باقی رہ گئی تھی ورنہ سارا شہر زلزلہ کا منظر پیش کررہا تھا۔ وقوعی نے تبریز کی اس تباہی پر کہا ہے۔

وقوعی کربلا تسکین در دم میدھد، ورنہ
دلم از حسرت تبریز ویران ترز تبریز است ۲۱۔

اس صورتحال میں میر صاحب جیسے مجلسی امیر کے لیے تبریز کی ویرانی میں کیا تسکین ہوتی سوائے اس کے کہ راستے کی تھکن دور کرنے کے لیے آرام کیا ہوگا۔ اور مزید یہ کہ جب تک شاہی حکم نہ ملے تب تک وہیں ٹھہرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

ایروان میں آمد:

ایروان کے تین قلعے تھے، محاصرہ اور مقابلہ جاری تھا فیصلہ کن صورت نظر نہیں آرہی تھی طویل مدت کو مد نظر رکھتے ہوئے میر معصوم کو ایروان بلوالیا گیا۔ چناں چہ میر قلعے کے دامن کے قریب اپنے اسباب کے ساتھ منوچہر بیگ کے ہم راہ لشکر گاہ پہنچے۔

بادشاہت کے اٹھارویں سال جلوس میں جس کی ابتداء اتوار کے دن ۱۹ شوال ۱۰۱۲ھ کو ہوئی۔ میر معصوم اس سے پہلے ایروان پہنچے جس کا ذکر عالم آرائے عباسی کے مؤلف نے اس طرح کیا ہے:

"محاصرے کے دوران میر معصوم خان بکھری، جو جلال الدین اکبر بادشاہ ہند کے معتبر امراء میں سے اور بکھر کی ولایت کے حاکم تھے۔اپنے بادشاہ

کی طرف سے منوچہر ایشک آغاسی کے ساتھ جو
سات سال پہلے ہند کے سفیر بن کر گئے تھے اور
سارا عرصہ وہیں مقیم تھے، بحیثیت ایلچی تحفے
تحائف لے کر پہنچے"۔ ۲۲

مصنف لکھتے ہیں کہ اس وقت بادشاہ محاصرہ کے اہتمام میں مصروف اور منہمک تھے اس لیے شاہی تحفے تحائف کی طرف متوجہ نہیں ہوسکے۔ میر صاحب نے سارے اسباب کو سلیقے سے شاہی "دولت خانہ" کے سامنے سجا رکھا تھا۔ تاکہ فرصت ملنے پر بادشاہ جب چاہے آسانی سے دیکھ سکے۔ ۲۳

شاہ عباس نے شگون کے طور پر ایک تلوار اور سونے کی زرہ ملاحظہ کی جس کو فتح و نصرت کا نشان سمجھا گیا۔ باقی چیزوں کی حفاظت اور دیکھ بھال سخت سردی کے باوجود میر معصوم اور ان کے ایک ہزار ساتھی چار مہینے تک کرتے رہے۔

گورگانی خاندان:

تاریخ عالم آرائے عباسی کے مولف نے لکھا ہے کہ اکبر کی طرف سے تلوار کا بھیجنا "دور بینان عالم معانی" کی نگاہ میں فتح و ظفر کا پیغام اور نشان سمجھا گیا کیوں کہ گورگانی خاندان کے اس بادشاہ کی قہری تلوار ہمیشہ افغانوں اور ہندو دشمنوں کا صفایا کرتی رہی ہے۔ کابل، قندھار اور یوسف زئی کی سر کوبی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ہندوستان میں ہندوؤں والی خوش فہمی حقیقت سے دور ہے۔ ہندوستان کی مسلم ریاستوں کی سر کوبی تو گورگانی خاندان سے ہوتی رہتی تھی، جس طرح کہ نو مسلم کی آزاد ریاستیں اکبری "تیغ قہر ش" کا لقمہ بن چکی تھی۔

۱) گجرات
۲) سندھ

۳) خاندیش
۴) کشمیر
۵) دکن کی ریاستیں

ایران کے مورخ کو، یا تو خواہ مخواہ خوش فہمی تھی یا آرائش سخن کے لیے انھوں نے ہندوؤں کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال تاریخ نویسی کا جو انداز اور رجحان تھا سکندر بیگ ترکمان نے کی تھی۔

شاہ کی کدورت:

"زندگانی شاہ عباس اول" کے مصنف نصر اللہ فلسفی کے سامنے عالم آرائے عباس کے علاوہ اور بھی مآخذ ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہ نے ایرانی سفیر کو سات برس تک اپنے ہاں روکے رکھا تھا۔ یہ بات شاہ کو بہت ناگوار گزری تھی اس لیے ان کے دل میں بغض تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ہندی ایلچی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی مہربانی کا سلوک کیا گیا۔ تحائف میں سے بھی صرف ایک تلوار انھوں نے لی۔ باقی تحائف دوسرے لوگوں میں تقسیم کردیے ۔[۲۴]

سفارت کی کامیابی:

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ میر معصوم چار مہینے ایروان کے شاہی کیمپ میں مقیم رہے۔ شدید سردی میں شاہی تحائف کی حفاظت کرتے رہے۔ اور نیتجے کے منتظر رہے۔

ایروان کے قلعے پر جمعے کے دن ۲۸ ذی الحج ۱۰۱۲ھ محاصرہ تنگ کیا گیا[۲۵] تو قلعہ کے محصورین مجبور ہو گئے

آخر عاشورہ کی رات یعنی ۱۰۱۳ھ قلعے کا حاکم شریف پاشا صلح کا ملتجی ہوا اور امان مانگی۔ جان و مال کے تحفظ کی یقین دہانی کے بعد اطاعت قبول کی تبریز اور نخجوان کے بعدایروان بھی فتح ہو گیا۔

گمان غالب ہے کہ میر معصوم جمادی الاوّل یا جمادی الثانی کے بعد نخجوان اور ایروان روانہ ہوچکا تھا۔ میر معصوم شعبان ۱۰۱۲ھ میں تبریز سے روانہ ہو کر ایروان پہنچے۔ قلعے کی فتح (۹ محرم ۱۰۱۳ھ) تک اس انتظار میں رہے کہ کب بادشاہ کو فرصت ملتی ہے اور کب وہ تحائف کو شرف ملاحظہ قبولیت بخشتا ہے۔

عالم آرائے عباسی کے مؤلف کا قول ہے کہ اس عرصہ میں میر صاحب منوچہر بیگ کی ہم راہی میں " شرف مجالست مجلس بہشت آئین" حاصل کرتے رہے فلسفی کے مطابق: میر معصوم شاعر اور خوش کلام اور خوش صحبت امیر تھے۔ انھوں نے اپنی صفات کی بدولت بادشاہ کی کدورت ختم کر کے تحفہ تحائف قبول کرنے پر آمادہ کیا۔۲۶۔ گویا اکبر کی شاہی سفارت کی اہمیت بلکہ میر کی اپنی شیریں کلامی اور دانائی کام آئی یہ الجھا ہوا مسئلہ اس طرح سے حل کردیا گیا۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ شاہ عباس کا دل مختلف وجوہات کی بناء پر صاف نہیں تھا۔ قندھار کا مسئلہ اکبری دربار میں ایرانی بادشاہ کے سلسلے میں سرد مہری، ایلچیوں کو کسی معقول سبب کے بغیر برسوں تک رو کے رکھنا، اسی طرح کے اور کئی دوسرے معاملات تھے۔ جنھوں نے ایرانی شہنشاہ کے دل کو رنجیدہ رکھا تھا جس کا علاج میر معصوم جیسے فاضل شخص نے چار مہینے کی ملاقات اور مجالست کے ذریعے کیا اور اس طرح شاہ کی رنجیدگی ختم کی۔

تحفہ تحائف کی پیشکش:

تاریخ ۹ محرم ۱۰۱۳ھ / جون ۱۶۵۴ء میں اہل ایروان نے صلح کی درخواست کی جس کے بعد اطاعت کرنے اور قلعے حوالے کرنے کی رسم پوری ہوئی۔ غالباً جلد ہی محرم کی ہی کسی تاریخ میں جبکہ فتح ایروان کے بعد شریف پاشا اور عثمانی امراء اور رومی لشکر اور کرد سردار موجود تھے۔ ۲۷ اسی وقت میر معصوم کو اکبری تحفہ تحائف پیش کرنے کا حکم ملا۔ بادشاہ نے پہلے صرف ایک تلوار لی تھی اب سب تحائف پر نظر ڈال کر قبول کرنے کے بعد تمام تحفہ تحائف اسی وقت دربار میں موجود امراء منصب داروں اشراف اور سپاہیوں میں حسب مراتب تقسیم کردیے۔

ہندوستانی دربار میں اطلاع:

میر معصوم کو سفارتی فرائض کی ادائگی میں جو مشکلات پیش آئیں اسے انھوں نے اپنی ذاتی قابلیت، صلاحیت، تدبر اور دانش مندی سے اس طرح حل کیا کہ نہ صرف ایران کے شاہی دربار کی تلخی ختم ہوئی بلکہ ان کی سفارت اور بادشاہ کی عزت بھی بر قرار رہی۔ ان حقائق کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے سفارت کی کامیابی کا دارو مدار جلال الدین اکبر کے جاہ و جلال اور ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کی بناء پر نہ تھا۔ اگر میر معصوم جیسے فاضل شخص نہ ہوتے تو شاید اس سفارت کو مایوس واپس لوٹنا پڑتا۔ ایران کے شہنشاہ کو اب اکبر کی امداد کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اور نہ ان کے ساتھ یک طرفہ راہ و رسم کی ضرورت تھی۔ شیبانیوں کا اثر خراسان سے تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ ایرانی بادشاہ کے لیے ہندوستانی دربار کی بے

رخی کچھ زیادہ قابل توجہ نہ تھی۔

بہر حال اس سفارت کے سلسلے میں یہاں اکبری دربار کے سرکاری مورخ نے اکبر نامہ میں سفارت کی کامیابی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو ایران میں ہوچکا تھا۔ اننچاسویں سال جلوس کے واقعات کے سلسلے میں یہ عبارت درج ہے:

"عرض پیش ہوئی کہ میر معصوم بکھری جنھیں اس سال کے ۲۷ آذر ماہ کو ایران کی سفارت پر اس درگاہ عالیہ سے بھیجا گیا تھا۔ وہ شاہ عباس فرمانروائے ایران کے سامنے ایروان کے قلعے کے محاصرے کے وقت حاضر ہوا۔ بادشاہ ان کی پذیرائی کے لیے والہانہ انداز سے آگے بڑھا۔ حضرت شہنشاہ کا خط ادب سے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر پر رکھا۔ اور پوچھا کہ حضرت شاہ بابا کیسے تھے، ان کی طبیعت اور حال کیسا تھا؟ تحائف جو اس درگاہ کی طرف سے بھیجے گئے تھے ان کو وسیع ایوان میں سجا کر ترتیب سے رکھا گیا، جنھیں نہ صرف بادشاہ نے خود ملاحظہ کیا بلکہ دو تین دن تک گرجستان کے ایلچیوں اور ترکستان کے سرداروں اور دوسرے معزز لوگوں کو بھیجتے رہے تاکہ وہ بھی نادر چیزیں دیکھیں اور وہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔"[۲۸]

یہ رپورٹ یقیناً میر معصوم نے سرکاری انداز و بیان میں اپنی حکومت کو بھیجی ہوگی جسے مخصوص لہجے اور الفاظ میں درج کیا گیا ہے۔ حال آں کہ بکھر کے اس سید زادہ نے ایروان کی شدید سردی میں چار مہینوں تک جس مصیبت سے ان نوادرات پر پہرہ دیا اور جن مشکلات سے انھیں سنبھالا یا جن

تراکیب اور تدابیر سے شاہ عباس کے دل سے کدورت ختم کی اس کا قصہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ نہ توشاہ نے ادب سے ''خط مبارک ''دونوں ہاتھوں میں لے کر سرپر رکھا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ شاہ بابا کیسے تھے؟ اور اُن کا مزاج مبارک کیسا تھا؟ نہ نمائش ہوئی اور نہ ایرانی، تورانی اور ترکستانی امراء اور ایلچیوں کو تین چار دن تک تحائف کی زیارت کے لیے بھیجتے رہے۔ بادشاہ نے تو معلوم نہیں کہ ایک ایک تحفے کو دیکھا بھی یا نہیں انھیں تو پیش ہوتے ہی دربار میں موجود افراد میں تقسیم کردینے کا حکم ہوا۔ شاہ نے جو تلوار اٹھائی تھی۔ وہ محض شگون کے لیے، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی غیر معمولی چیز تھی۔

بہر حال سفارت کے سلسلے میں دونوں حکومتوں کی رپورٹیں خوش قسمتی سے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس لیے اندازہ کرنا آسان ہے:۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

واپسی ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء:

میر معصوم نے سردی کا زمانہ شاہی لشکر گاہ میں بسر کیا۔ ایروان کے آس پاس کا علاقہ فتح کرنے کے بعد شاہ عباس کو کنج تنگیز کے علاقے میں ٹھہرے۔ یہاں کی آب و ہوا، سبزہ، سایہ دار درخت، چشمے اور شادابی بقول صاحب عالم آرئے عباسی ''رشک گلزارِ جناں'' تھی۔ بہار آگئی تھی۔ اس لیے بادشاہ جنگ کے زمانے کی تھکاوٹ اور تلخی کو سیر و شکار کے ذریعے دور کررہا تھا۔

اسی اطمینان اور خوشی کے موقعے پر میر معصوم کو ہندوستان واپس جانے کی اجازت ملی شاہ عباس کا جوابی خط

موجود ہے جو ذیل میں درج ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ واپسی پر ایران کے شاہ نے تحفہ تحائف بھیجنے میں کس کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ عالم آرائے عباس کے مصنف نے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے:

"محمد معصوم خان بکری ایلچی پادشاه عالی جاه فرمانفرمای ممالك هند را که به خدمت اشرف آمده، رخصت ارزانی داشته روانه دیار هند فرمودند.[۲۹]

واپسی کا راستہ:

میر معصوم کی واپسی کے سلسلے میں ان کے تین کتبے ملے ہیں جن سے ان کی واپسی کے راستے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب دوبارہ کاشان آئے اور وہاں سے اصفہان پہنچے مورچۂ خورت کی کارواں سرا دونوں شہروں کے مابین جوراستہ ہے اسی پر ہے کا رواں سرا پر میر صاحب کا کتبہ تھا جواب موجود نہیں ہے۔[۳۰] میر صاحب اسی راستے سے شاید وہاں چند دن ٹھہرے روضۂ ہارون ولایت کے مقابل سلطان سنجرسلجوقی کے دور کی "مسجد علی" موجود ہے۔ مسجد کے مشرقی محراب والی دیوار پر میر صاحب کا کتبہ موجود ہے جس پر نثر کی مندرجہ ذیل عبارت موجود ہے:

در حینی که از هند به رسالت نزد شاه عالم پناه فلك بارگاه شاه عباس آمده بود از ایروان در ۱۰۱۳ھ مرخص شده بود به اینجا رسید ......"[۳۱]

اسی دور میں اصفہان کا یہ حصہ آباد تھا امام زادہ ہارون ولایت کا روضہ اسی کے برابر میں کارواں سرائے اور سامنے

مسجد علی ، جسکے کونے میں بہت خوبصورت مینارہ سلجوقی دور کی یاد گار اور ایران کے بہترین میناروں میں سے ایک ہے قرین قیاس ہے کہ میر صاحب نے شہر کے اسی حصے میں قیام کیا ہوگا کاروان سرائے سے لوگوں کے رہنے سہنے میں سہولت اور آرام امام زادہ کی زیارت اور اسی کے ساتھ جامع مسجد، کشادہ صحن اور چھت کے اوپر سے مینارے کا نظارہ جس سے یقیناً میر کو بکھر میں اپنے مینارے والی اسکیم تصور میں آئی ہو گی۔

اصفہان میں ادبی صحبتیں:

جیسا کہ تقی کاشی کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ میر صاحب جہاں پہنچ جاتے تھے وہاں کے سرکاری امراء، شہر کے معززین اور امراء ان کا والہانہ استقبال کرتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ خود بھی اپنی خوش صحبتی، شرافت اور فضیلت کے سبب جس سے ملتے اسے اپنا گرویدہ بنالیتے۔ یہاں تک کہ کسی کے احسان مند نہیں رہے۔ بلکہ اس کے برعکس ملاقاتیوں کو زیر احسان کرتے رہے ۔ ان کی فراست اور مزاج کی شگفتگی نے ایران کے بادشاہ کو رام کرلیا تھا۔ جیسا کہ مآثر الامراء میں ہے کہ:

> "به فرط فراست و کار دانی مورد الطاف شاه عباس صفوی گشت." ۳۲

تقی کاشی لکھتے ہیں:

> "در مجالس انس و محافل اختصاص جلیس و انیس گردید."

کاشی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "الحمد الله علی نعماته که این سید جلیل القدر، محرمیت و قربت این بارگاه عرش اشتباه را در یافته به

مراد خاطر و آرزوی باطن و ظاهر رسید وپرتو
خورشید عاطفت پادشاهانه درین بلادنیز به موجب
دلخواهِ دوستان و محبان بر ساحت کمال این سفارت
پناه ایالت در ستگاه رسید۔"

تقی کاشی بحیثیت دوست و بہی خواہ ان کی سفارت کی کامیابی پر نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود میر معصوم بھی اپنی غیر معمولی کامیابی پر، جو ان حالات کے مطابق بالکل غیر متوقع تھی نہایت مطمئن اور خوش تھے۔ اور یقیناً انھوں نے تقی کاشی یا اپنے دوسرے متعلقین سے اس کا اظہار کیا ہوگا۔ تقی کاشی کی مندرجہ بالا عبارت سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔

میر صاحب کیوں کہ بنیادی طور پر ادیب و شاعر تھے اس لیے فطرتاً وہ جہاں گئے۔ کوشش کرتے رہے کہ وہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے ملیں اور ان کی صحبت اختیار کریں اس وقت اصفہان کے گورنر مرزا محمد خان نیشاپوری تھے جنھوں نے آپ کے اعزاز میں اس دور کے اہم ترین شعراء کو مدعو کیا۔ حکیم شفائی اس دور کا مشہور شاعر اور درباری تھا محمد رضا فکری معروف شاعر اور شہر کے معززین میں سے تھے۔اس طرح تقی اوحدی نہ صرف شاعر بلکہ اہم ترین تذکرہ نگار بھی گزرے ہیں۔ یہ اور بعض دوسرے شعراء جمع ہوئے شعرو سخن کی محفل ہوئی ان لوگوں نے اپنا کلام سنایا اور میر صاحب نے کلام بھی سنا۔[۳۳]

عتابی تکلو، اسی سفر میں میر صاحب سے متعارف ہوئے اور میر انھیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے۔ عتابی تکلو دوسری بار ہندوستان آتے ہوئے قندھار میں مرزا غازی ترخان سے ملے اور ان کی مدح میں قصیدے کہے۔ اور کچھ عرصے مرزا کے دربار سے وابستہ رہے۔

ای خاتم جلال ترا آسمان نگین   در زیر آن نگین ورقی از زر آفتاب

قصیدہ کے اس شعر پر مرزا غازی نے انھیں بہت سے انعام[۳۴] و اکرام سے نوازا۔

کرمان اور بلوچستان:

معلوم ہوتا ہے کہ میر اصفہان کے بعد یزد سے ہوتے ہوئے کرمان پہنچے۔ کرمان کا نام تقی کاشی نے ذکر کیا ہے۔ وہاں پہنچ کر میر لازماً ماہان شاہ نعمت اللہ ولی کی زیارت پر گئے ہوں گے۔

کرمان کے بعد یا کرمان آتے ہوئے بلوچستان پہنچے۔ راستے کے دوسرے گاؤں میں ان کے کتبے ملے ہیں جو واپسی کے ہیں۔ایک کتبہ خاش اور سراوان[۳۵] کے درمیانی گاؤں گوشت میں ہے یہ گاؤں پہاڑ کے پہلو میں نہایت سر سبز نخلستان ہے۔ بہتی ہوئی پہاڑی ندی کے دہانے پر میر معصوم نے یہ کتبہ نصب کیا:

شہ دین و دنیا علی ولی وصی وفی جانشین نبی
قد مہاش بر بازو ای شد سوار کز وباز وِی شرع شد استوار

قایلہ نواب امیر محمد معصوم الحسینی النامی تخلصاً و البکری مسکناً۔

پتھر کے کنارے پر عبارت ہے:

''در وقتی کہ از ہند بہ رسالت ایران آمدہ بود،
اینجار سید ۱۰۱۳ھ ہزار و سیزدہ''۔

یاد رہے کہ یہ پہلا کتبہ ہے جس میں میرمعصوم کی زبانی حضرت خلیفہ چہارم کی افضلیت بیان کی گئی ہے۔

گوشت گاؤں کے باشندے اس پتھر کو متبرک سمجھ کر اس کی زیارت کرتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں، منتیں مانتے ہیں اور جانوروں کی قربانیاں کرتے ہیں۔

میر کا دوسرا کتبہ کوھک گاؤں کے قلعے میں ایک مقبرے میں نصب ہے اس مقبرے کو کوھک کے باشندے برکت، کرامت اور صاحب ولایت کا مدفن سمجھ کر ان کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔خاصے عرصے سے یہ کتبہ مقبرے سے غائب ہے۔ ۳۶ کتبے کی عبارت کو مجلہ "یادگار" میں "بلوچستان" کے جغرافیہ والے مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ عبارت اس طرح ہے:

ساقی از این باده که داری به جام

فیض رسان شو بسوی خاص وعام

قایله نواب میر محمد معصوم الحسینی البکری، در وقتیکه از هندوستان به رسالت ایران آمده بود اینجا رسید سنه ۱۰۱۳ھ۔" ۳۷

میر صاحب بلوچستان کے ذریعے زاہدان سے ہوتے ہوئے اس دور کے سندھ بلوچستان میں داخل ہوئے جو بکھر سرکار کے زیر اثر تھا آپ خود بھی وہیں کے مکیں اور جاگیردار تھے۔

ہندوستان کی تاریخ کی اطلاع:

ہندوستان کی تاریخ میں میر صاحب کی آمد کا اندراج سرکاری طور پر اکبر نامہ میں اس طرح ہے:

"میر معصوم بکری (که به سفارت ایران نزد شاه عباس رفته بود) آمده بدولت ملازمت رسید و نامهٔ والی ایران و مکتوبی (که عمهٔ شاه به حضرت مریم مکانی نگاشته بود) از نظر اقدس گذرانید۔" ۳۸

مریم مکانی بلقیس بیگم کی والدہ اور بہن ایران میں رہتی تھیں۔ جن سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی۔ میر صاحب شاہ ایران کی پھوپھی زینت بیگم (ہمشیرہ شاہ

طهماسپ) کا خط مریم مکانی کی طرف لائے تھے۔[39]

میر صاحب کے ہندوستان پہنچنے کا علم ان کے اس کتبے سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ شیخ حمید الدین ناگوری کے مقبرے پر میر بزرگ کے اس کتبے کی عبارت سے ظاہر ہے:

در حین مراجعت از ایران در ملازمت نواب امیر محمد معصوم نامی به اینجا رسید و این چند بیت از خمسۂ ایشان، که درین ولا به اتمام رسانیده بودند، تحریر نمود. درسنه ۱۰۱۳"۔[40]

خط کا متن:

میر صاحب شاہ عباس کے یہاں سے اکبر کے خط کا جو جواب لائے وہ اس طرح ہے اس میں لفاظی اور عبارت آرائی نمایاں ہے۔

"کتابت از جانب نواب اشرف اقدس ارفع همایون شاهی شاه عباس مرحوم مغفور به جلال الدین اکبر پادشاه هند مصحوب میر محمد معصوم بکری از ایروان فرستاده شد:

بهترین فضلی که طوطی ناطقه در بوستان بدایع آفرینش و شکر ستان مجامع دانش و بینش زبان به بیان آن آراید، اظهار حمد و سپاس درگاه احدیت و ذکر نعت و منقبت حضرت رسالت علیه و آله افضل الصلوة والتحیة است، اما طی آن بید ابر قصور الفاظ و عبارات و نقصان مجازات و استعارات اولی است، چه در معرض ادای چنین مدعایی در آمدن خود را مورد توبیخ و عرضۂ تشنیع ساختن است. لاجرم به حکم

"العجز عن درك الادراك ادراك" عنان بكران اندیشه از قطع این وادی حیرت افزا به جانب دعا که بهترین هدیهٔ دوستان بی ریاست، انصراف داده به مراسم تهنیت نصرتی که از اثر اخلاص محبان و منسوبان آن آستانهٔ ثریا مکان را رخ نموده ، شرح فتوحاتی که به یمن همت اکسیر خاصیت مخلص صافی طویت را روی داده و بنا بر مقدمه ای که در ملاطفه سامی مندرج بود، اظهار آن موجب ابتهاج خاطر خورشید انجلای بند گان سپهر اعتلا خواهد بود می پردازد. الحمدالله تعالیٰ و تقدس! که نهال آمال اولیاء دولت بی زوال به ثمرهٔ فتح و فیروزی بارور گشته، مذاق جان چاشنی گیر حلاوت آن شده، سجدات شکر از صمیم دل به تقدیم رسید . امید که همواره اسباب سلطنت و کامرانی و موجبات نصرت و کشور ستانی در تزاید و تضاعف باد و از میامن الطاف الاهی و حسن ارتباط و التفات صوری و معنوی رای و مکتسبی حضرت عالم پناهی از این جانب نیز شاهد هر مقصودی که در آئینهٔ ضمیر محبت تاثیر پر تو جمال می اندازد، باحسن وجوه آغوش مراد جلو گاه آن می شود.

مصداق این مقال، فتح ولایت آذر بایجان و قلاع آنست، تفصیل این اجمال آنکه بر ضمیر خورشید نظیر ظاهر خواهد بود که سلاطین روم بانواب علیسین آشیانی شاه بابا ام انارالله برهانه ارکان مصالحه و معاهده را به ایمان استحکام داده بودند که نسلاً بعد نسل فیمابین مخالفت نبوده باشد وسلطان بایزید را با اولاد که از والد خود سلطان سلیمان روی گردان گشته بدین دود مان ملتجی شده بود به جهت

ملاحظه نقض عهد و پیمان به فرستاده های ایشان سپردند.

باوجود این مقدمات، بعد از سنوح قضیه بندگان رضوان مکان به مجرد فی الجمله اختلال احوال طوایف جلیلهٔ قزلباش ایشان فرصت یافته متوجه تسخیر آذر بایجان و شیروان گشتند و بعضی محال را که در آن ایام به نواب جنت بارگاه باز گذاشته بودند، بادیگر محال متصرف شدند، و چون از بارگاهِ صمدیت رجوع امر خطیر سلطنت بدین صادق العقیده شد، به واسطهٔ رفاه حال خلایق و عباداللـه قواعد عهد و پیمان به دستور مؤکد و مشید گشت، وقلعه نهاوند که درمیان ممالك محروسه واقع است، در تصرف جماعت رومیه بود، بنا بر تشیید مبانی صلح و صلاح متعرض آن نشد، و هر چند بدیشان اعلام تخریب آن می نمود، اثری بجز احمال و اغفال مشعر بر عدم صداقت و انتهاز فرصت که شیمهٔ ذمیمه آن طایفه است، نمی شد. ناموس سلطنت متحمل این بار نشده ایالت پناه شوکت دستگاه حسن خان حاکم همدان رابه حکم:

کاری که به عقل بر نیاید
دیوانگی در آن بباید

به تسخیر و تخریب آن مامور فرموده در اندك فرصتی مسخر شد، و بعد ازان عنان فیروزی عیان از اصفهان به عزم تسخیر ممالك فتح المسالك آذربایجان و مابقی الکاءِ موروثی معطوف داشته چهل

روزه راه را در عرض نه روز ایلغار کرده دارالسلطنه تبریز مضرب سرادقات اقبال شد، و پاشای آنجا که با لشکر گران بر سر اکراد آن حوالی رفته بود، واقف گشته به ارادهٔ آنکه خود را به قلعهٔ دارالسلطنه مزبور تواند انداخت، به مقابل عساکر فیروزی مند در آمده اسیر و دستگیر شد، و قریب به ده هزار سوار از مخالفان طعمهٔ شمشیر غازیان شیر شکار گشت.

مومیایی همه دانند کرا خرج شود

هر کجا پشه به پهلو زدن آید با پیل

غازیان نصیری منش به محاصرهٔ قلعهٔ مزبور مامور شده در بیست روز آنچنان که قلعه را، مشحون به دو هزار توپ و پنجهزار تفنگ وصد هزار من باروط، وده ساله آذوقه از هر جنسی، و دیگر آلات قلعه داری بود، به تحت تصرف در آوردند، و از آنجا عازم قلعهٔ نخجوان و ایروان و سایر قلاع آذر بایجان که همگی مملو از مردان کاری و اسباب قلعه داری بود، گشته. حکام و مستحفظان قلاع تاب صدمت و صولت نیاورده، جمیع قلاع را انداخته در قلعهٔ ایروان - که محکمترین حصون آن دیار در حصانت و متانت مشهور روز گار و مشتمل بر چهار قلعه و حصارست - اجتماع نمودند. دیو غرور حصن دماغ پر شر و شور ایشان را مسخر ساخت و به محکمی حصار شان فریفته به وادی عصیان انداخت. و چون موضع مذکور در قدیم، سرحد ممالك محروسه بود، بعد از فتح آن تسخیر گنجه و شیروان با سهل وجوه میسر شد. رایات جلال به نصرت و اقبال در آنموضع

نزول اجلال فرموده به محاصره و تسخیر اشتغال نمود، و مدت هفتماه علی الاتصال استعمال آلات جنگ و صدمات توپ و تفنگ در کار بود.

درین اثنا سیادت و امارت پناه، معتمد الخاقانی میر محمد معصوم خان ورود عزت نموده صفوت نامهٔ گرامی - که مخبر از فتوحات گونا گون بود- رسانید، ابواب شادمانی بروجنات احوال مخلص کشوده. تیمنا این معنی را فتح الباب فتوحات دیگر دانست، آخر الامر:

چو دینم قوی بود و رایم درست
مدد بختم از غیر یزدان نجست

مستعیناً من الله، یورش نموده قلاع بیرون را جبراً قهراً مسخر گردانید، وجمع کثیر از مخالفان به قتل رسیده، ما بقی به قلعه اندرون پناه بردند، و در عرض ده روز باره و برج آن قلعه نیز به ضرب توپ و یران شد، اهل قلعه را چاره به جز طلب الامان نماند. از عالم مروت جبلی زلات ایشان به عفو مقرون گشته به جان و مال امان یافتند، و اکثر ایشان در سلک ملازمان خاصه منتظم شدند.

وبا آنکه قریب سی هزار کس و دوازده هزار اسب و هفتهزار شتر درین قلعه محصور بود، بعد از فتح هنوز آذوقه و ما یحتاج چند ساله داشتند، وسیادت پناه مشارالیه که قامت قابلیتش از آرایش تعریف و توصیف مستغنی است، به دیدهٔ حقیقت بین مشاهده نموده، در حین تقبیل بساط گردون مساط به

مسامع علیه خواهد رسانید، وچون از یمن توجه و ارتباط حضرت عالم پناهی محب نیکخواه را اینچنین فتح که هیچیك از سلاطین ایران را در هیچ قرن و زمان میسر نشده، که از جماعت رومیه قلعه ای به جنگ و جدال توانند گرفت . روی داده، سیادت پناه مومی الیه را به جهت تبلیغ این اخبار مرخص ساخته روانهٔ آستان عرش نشان نمود.

مترصد است که پیوسته گلشن التفات و اتحاد را به زلال الفت و داد شاداب داشته، به رجوع خدمات و اشارات محرك سلسهٔ یگانگی باشند.

حق سبحاله و تعالیٰ ظلال ربوبیت را از وصمت زوال و تطرق عین الکمال مصئون و محفوظ داراد.

انه رؤف بالعباد، تمت بالخیر!

اس خط میں میر موصوف کے لیے شاہ عباس نے جو تعریفی الفاظ استعمال کیے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میر معصوم نے اپنی دانش مندی سے بادشاہ کے دل میں کتنا وقار پیدا کیا اور یہی وقار سفارت کی کامیابی کا ضامن بنا۔

حوالہ جات

۱۔ عالم آرائے عباسی، ص: ۲۹۱؛ فلسفی ۱: ص ۲۱۸

۲۔ اکبر نامہ میں ہے کہ ۹۹۹ھ میں ایرانی سفیر لاہور پہنچا ۱۰۰۳ھ/اکتوبر ۱۵۹۴ء میں واپس ہوا (۳: ۵۸۸) عالم آرائے عباسی کے مصنف نے واپسی کا سال ۱۰۰۵ھ/ ۹۶۔۱۵۹۷ء لکھا ہے (ص: ۳۶۱) اور ریاض الاسلام ۶۱، ۶۲ سالوں سے متفق نہیں بقول ڈاکٹر ریاض الاسلام اس کی کئی مثالیں موجود ہیں سالوں کے صحیح اندراج کو اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

۳۔ اکبر کی طرف سے بھیجے ہوئے خط کا متن فلسفی (۱: ۲۲۲) نے درج کیا ہے اور شاہ عباس کا جواب بھی اس کی کتاب (۱: ۲۲۸) میں ہے۔

۴۔ اکبر نامہ ۳: ۶۵۶ ؛ ریاض الاسلام ۶۲

۵۔ فلسفی بحوالہ تاریخ جلال یزدی ۱: ۲۲۱

۶۔ ملکی لوگوں کو نظر انداز کرنے اور ان کو حقارت سے دیکھنے کا یہی حشر ہوتا ہے۔ ایرانی اور تورانی جال کا اندازہ مغل تاریخوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ مظہر شاہجہانی میں نورجہاں کے نسب نامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایران کے ایک عام اور عبرت زدہ خاندان نے یہاں پہنچ کر اپنے عزیز و اقارب کے ذریعے پوری مغل حکومت کو اپنے جال میں پھنسالیا تھا۔

۷۔ ایشک آقاسی باشی ایک عہدہ ہے۔ منوچہر شاہ طہماسپ کا معتمد مقرب نہایت زیرک انسان تھا (ریاض الاسلام ۶۳؛ اکبر نامہ ۳: ۳۴۵؛ فلسفی ۱: ۲۳۵۔ شاہ عباس کا خط اکبر کی طرف)

۸۔ یہ کتبہ جیسلمیر میں نصب ہے " بندگان حضرت اعلیٰ با ایلچی گیری عراق، نواب سیادت پناہ ابوی امیر محمد معصوم بکری را رخصت نمودند. ازین جا عازم بکر شد ند، ۱۰۱۰ھ، حررہ میر بزر گ." جس مسجد پر کتبہ نصب ہے وہ بھی میر صاحب نے تعمیر کرائی تھی۔ بنای دلپذیر سے ۱۰۰۹ھ تاریخ نکلتی ہے یہ مسجد میر صاحب کی آمد و رفت کے راستے پر تھی۔

۹۔ اکبر نامہ ۳: ۸۲۵

۱۰۔ ایشلک آقاسی کرمان اور مکران اور سندھ کے راستے سے ہندوستان پہنچا تھا۔ (فلسفی ۱: ۲۲۷ عالم آرائے عباسی: ۵۴۳)

۱۱۔ یہ خط مجھے دوست عزیزم احمد گلچین معانی نے مشہد سے بھیجا ہے اور "منشات میرزا سید ابو الحسن منشی الممالك" سے نقل کیا گیا ہے کتاب ۱۰۵۵ھ میں مرتب ہوئی اور کتب خانہ آستانہ قدس میں نمبر ۴۴۹۳ میں (ص ۷۷۲۔ ۷۹۵) موجود ہے۔ یہ خط دوسرے مندرجہ ذیل مجموعوں میں بھی موجود ہے؛

۱۔ ابو القاسم حیدر بیگ ایوا غلی "جامع المراسلات، برٹش میوزیم O.R. ۳۸۴۲ (۲۱۴B-۱۶a)

۲۔ "بیاض" بانکی پور، نمبر ۱۹۹۵

۳۔ "مجموعہ" تہران یونیورسٹی مرکزی کتبخانہ نمبر ۲۴۶۴(242a-45a)

۴۔ محمد صالح "مجموعہ مکاتیب مختلفہ، کتبخانہ مجلس تہران نمبر ۳۳۴۹، مندرجہ فہرست ۳: ۷۰-۱۱۵۲

۵۔ مہدی بیانی مرحوم، "مجموعہ مراسلات" ص ۸۸۔ ۸۵

۶۔ عباد اللہ فیاض "فیاض القوانین"، I.O. ۳۹۰۱

۱۲ـ حبیبی، تاریخ افغانستان، ص: ۳۰۱
۱۳ـ کتبہ کی تصویر ملاحظہ کیجیے: ریاض الاسلام ص: ۴۶
۱۴ـ یہ کتبہ محمد حسین آزاد نے اپنے سفر نامے میں (ص: ۱۶۹) شائع کیا اور تذکرہ میخانہ میں گلچین معانی نے عرفات العاشقین سے نقل کر کے درج کیا (ص: ۱۱۶) راقم الحروف مزار کی زیارت اور کتبہ دیکھنے کے لیے دو مرتبہ گئے اور تصویریں کھینچیں۔ شیخ احمد جام بڑے پائے کے بزرگ اور صوفی ہیں۔ متعدد کتابیں ان کے سلسلے کی ہیں حافظ شیرازی نے درج ذیل شعر ان کی شان میں کہا ہے۔

حافظ مرید جام جم است، ای صبا! برو
وز بندہ، بندگی برسان شیخ جام را

۱۵ـ مجلۂ پارس، ص: ۹
۱۶ـ "ملکی دیدم بہ صورت شخصی مصور، و عالمی در تحت ھمت ذاتی مسخر، محاورتی چون آب روان روح افزایی و لطف طبیعی چون جوھر روح غمزدائی ... لطف و حلم و شفقت و مرحمت باوقار و تمکین و جلال و کمال بریک بساط جادا دہ ..." پارس، ص: ۷
۱۷ـ ...درمدت عبور بربلاد پادشاہ جھانگیر ... ھر جا کہ اقامت می کرد، از ھیچ حاکمی و سرداری بہ رسم ساوری و علوفہ و تکلف پیشکش چیزی بلکہ پشیزی و تحفہ ای بل حبہ قبول نکرد ...و ھیچ کس از کبا ر امرای خراسان و عراق و کرمان و آذر بایجان وایروان و معارف اھل دولت و حکومت مشاھیر و فضلا و شعرا و ظرفا و ارباب استحقاق نماند کہ ازوی بقدر ھمت و مقدرت احسانی نرسید. و مشمول امتنان او بہ قدر یسور و استعداد، نگردید. وبی مبالغہ کسی بروی سلامی نکرد کہ بہ انعامی محظوظ نگشت و اکرامی ننمود کہ سوغات و لباس تشریفی ملبس نشد. پارس، ص: ۷

۱۸ـ تقی کاشی لکھتے ہیں:... آنجناب از بلدۂ کاشان با تنسوقات واموال پادشاه بحرو بر و فیول جبال پیکر و خیول و اسپان باد رفتار واقشمه و اجناس بیشمار، متوجه تبریز شد، و قبل از وصول جناب میر به ار دوی همایون پادشاه ملک ستان اعدا مال، آن بلاد رافتح کرده و مسخر ساخته متوجه ایروان گشته بود. لاجرم حضرت سفارت پناه روزی چند در تبریز به واسطۂ برودت هوا و آسایش ملازمان توقف نمود.

(پارس، ص : ۸)

۱۹ـ عالم آرائے عباسی ۶۳۸

۲۰ـ ایروان اس وقت روسی آذر بائجان میں ارمنستان کا دارالخلافه اور نہایت ہی خوب صورت شہر ہے۔ ماسکو سے ساڑھے تین گھنٹے ہوائی سفر کا راستہ اور تاشقند سے چار گھنٹے کا راستہ ہے۔

۲۱ـ عالم آرائے، ص:۶۳۹ھ

۲۲ـ ...از سوانح ایام محاصره آمدن میر معصوم خان بکری است که از امرای معتبر سلسلۂ پادشاه عالی جاه جلال الدین محمد اکبر پادشاه و حاکم ولایت بکر بود، که از جانب آن پادشاه فریدون بارگاه همراه منوچهر بیگ آقاسی غلام خاصه شریفه که هفت سال قبل ازین به رسم رسالت به جانب هند رفته بود، به جهت تجدید قواعد دوستی با ایلچگیری آمده وتحف و هدایای لایق آورد. (ص: ۶۴۷)

۲۳ـ ...به در دولت خانۂ همایون آورده بر زیر یکدیگر چید ند، که هر گاه رخصت یابند از نظر اقدس بگزر انند... از جملۂ هدایا یك قبضه شمشیر غلاف و آهن جامه سراسر طلا مرصع به الماس ریزه و جواهر ثمینی بود و دور بینان عالم معنی فرستادن شمشیر مذکور را در حینی که حضرت اعلیٰ کمر همت به کین اعدا بسته متوجه تسخیر ممالك موروثی شیروان و

آذربایجان و گرجستان بودند، از جانب صاحب دولت ذیجاه از خانوادهٔ صاحب قرانی ودود مانِ گورگانی که همیشه تیغ قهرش بر فراق اعادی افاغنه و هنود مظفر و منصور آمده به فال و شگون گرفتند به فتح و ظفر شهر یار کامگار امیدوار شدند. (ص: ٦۴٧)

۲۴ـ ...شاه عباس سبب آنکه امپرا طور هند سفیر ش را هفت سال معطل داشته بود، با ایلچی وی مهربانی وتوجه بسیار نکرد واز میان هدایای گران بهایِ اکبر، تنها یك قبضهٔ شمشیر مرصع بر داشت و باقی هدایا را نپذ یر فت. (۴: ۸۱)

۲۵ـ عالم آرائے عباسی: ٦۵۴

۲٦ـ میر معصوم بکری که مردی شاعر بود و نامی تخلص می کرد باشیرین سخنی و شاعری، دلِ آن بادشاه را به دست آورد و به قبول هدایا را ضیش کرد. (۴: ۸۱)

۲٧ـ ... تا آنکه بعد از فتح قلعه که شریف پاشا و اکثر عظما و معارف سپاه رومیه و اکراد در بارگاه معلیٰ حاضر بودند، تحف و هدایای پادشاهی رابا پیشکش ایلچی از نظر اقدس گذرا نیدند و حضرت اعلیٰ جمیع آنها را به امرای عظام و حکام ولایت و اشراف و اعیان هر طبقه و هر طایفه - که در اردوی همایون مجتمع شده بودند - علیٰ قدر مراتبهم قسمت فرمودند. (ص ٦۴٧ عالم آرا)

۲۸ـ معروض اقدس گردید که میر معصوم بکری که (بیست و هفتم آذر ماه این سال به سفارت ایران از بنگاه خلافت دستوری یافته بود) شاه عباس فرمانروای آن ملك را، هنگامیکه به محاصره قلعهٔ ایروان توجه داشت، ملازمت نمود. شاه در بزر گذاشت او، فراوان مبالغه فرمود. نامهٔ حضرت شاهنشاهی را بدو دست ادب گرفته بر سر نهاده و پرسید: حضرت شاه بابا ام چونند؟ وچه حال دارند؟ و اشیایی

کہ از درگاہ والا ارمغان شدہ بود ، در بارگاہ وسیع بر ترتیب و آئین شایستہ چیدہ تمامی را بہ نظر خود ملاحظہ نمودند وتا دو سہ روز ایلچیان گرجستان و سرداران ترکستان و سایر مردم بیگانہ را بہ تماشای آن نادرہ اشیامی فرستاد و بہ مشاھدہ آن اجناس والا کہ حیرت افزایی همگنان می شد، سرفرازی می اندوخت۔ (اکبر نامہ: ۳: ۸۲۵)

۲۹۔ عالم آرائے عباسی، ص: ۶۶۳۔

۳۰۔ دیکھیے گنجینہ آثار اصفہان (۱۳۵۰ھ) ڈاکٹر ہنر فر، ص: ۳۷۹ اسی کتبے کو دیکھنے اور ڈھونڈنے کے لیے میں دوبار کاشان گیا اور ایک مرتبہ اصفہان سے مورچۂ خورت پہنچا۔ سرائے موجود ہے لیکن نئے سرے سے اس کی مرمت کر کے اسے فوجی اڈا بنادیا گیا ہے ایک تو اندر دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی دوسرے مرمت کے سبب سرائے میں تبدیلی آچکی تھی پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کتبہ کہیں نہیں ہے۔ مورچۂ خورت کا زیر زمین قلعہ نہایت حیرت انگیز ہے۔

۳۱۔ سارا کتبہ کتبوں والے باب میں دیکھنا چاہیے اور دیکھیے میرا مضمون "اصفہان نصف جہان" اور میرا "سندھ" مطبوعہ ہلال پاکستان کراچی۔

۳۲۔ مآثر: ۳، ص: ۳۲۷

۳۳۔ شمع انجمن، ص: ۶۷۹، روز روشن، ص: ۲۶۶، ریاض الشعراء خطی، گل رعنا، خطی، ص: ۱۰۴۳ ، مجمع النفائس موزہ ملی پاکستان ، ۳۶۵ ب ، نشتر عشق خطی: ص ۶۲۹

۳۴۔ میخانہ گلچین معانی، ص: ۴۳۹، ص ۴۴۱، میرزا غازی اور اس کی بزم ادب، حسام الدین۔

۳۵۔ سراوان پاکستان کی حد سے ۱۱۰ کلو میٹر دور ہے۔

۳۶۔ ہنر و مردم شمارہ ۱۶۹ - ۱۷۰ سنگ نوشتھائے میر معصوم،

دکتر علی اکبر جعفری مضمون نگار متذکرہ گاؤں میں خود
گیا اور مضمون لکھا وہ میر معصوم کے کتبات کی تلاش میں
تربت جام اور کاشان میں راقم الحروف کے ساتھ
تھا۔ کوھك والے پتھر پر عبارت مجلہ یاد گار سال پنجم ،
شمار ۸-۹، ص ۹۸- ۹۹، میں شائع ہوئی ہے۔ جو ڈاکٹر
جعفری نے بھی نقل کی ہے۔

۳۷۔ مجلۂ یاد گار، شمارہ ۸-۹، ص ۹۸- ۹۹

۳۸۔ اکبر نامہ، ۳: ۸۳۶

۳۹۔ یہ خط موجود نہیں ہے۔

۴۰۔ شعر اور پورا کتبہ ، کتبوں کے باب میں دیکھنا چاہیے۔

باب ۔ ۱۹

ایران سے واپسی، اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی

گورگانی خاندان کی روایت اور رواج کے مطابق اکبر کی شہنشاہیت کے آخری سال مشکلات اور مسائل میں بسر ہوئے۔ تخت و تاج کی ہوس اور لالچ میں شہزادوں کی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں، درباری امراء کی پارٹی بازی، باہمی اختلاف اور عداوتیں، بغاوتیں، ایرانی اور تورانی دھڑے بازی، شاہی نسل سے وابستہ راجپوتوں کی سیاست ایسے بنیادی مسئلے تھے جو ہندوستان میں ہمایوں سے شروع ہوئے اور پھر خود سے معزور بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک ہر بادشاہ کے شروع اور آخری دورِ حیات میں دہرائے جاتے رہے۔

ہمایوں سے بھائیوں کا اختلاف اور بغاوت اور ان سے الگ ہوجانا، امراء کی بے وفائی، باہمی ضد اور عناد، جہانگیر کے خلاف ان کے بیٹے خسرو کی بغاوت، آخری دنوں میں کابل جاتے ہوئے جہانگیر کی اپنے امراء کے ہاتھوں گرفتاری، نور جہاں اور ان کے بھائی ابوالحسن خان کی تخت نشینی پر اختلاف، شہریار اور شاہ جہاں کے لیے علیحدہ علیحدہ کوششیں، شاہ جہاں کی اپنے باپ سے بغاوت والد کی وفات کی خبر لانے والے قاصد کو خوش خبر خان کا خطاب دیکر خسر ابوالحسن کی طرف سے تخت کے تمام وارثین کو مار ڈالنے کا

پیغام بھیجنا اور اس پر عمل اور آخری ایام میں شاہ جہاں کے بیٹوں میں خونی تصادم، بیٹیوں میں دشمنی اور امراء کا نفاق یہ سب مسائل عالم آشکار ہیں۔ عالمگیر کا باپ کو زندان میں ڈالنا، تخت پر قبضہ کر بیٹھنا، طویل عمری سے تنگ آکر شہزادوں کا ان کی موت کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بہ دعا رہنا یہ اور اس قسم کے ایسے کئی واقعات ہیں جن کا تواتر اور تسلسل گورگانی خاندان کے پورے دور میں برابر قائم رہا ہے۔ چناں چہ اکبر جیسا عظیم اور قوی بادشاہ بھی اپنے آخری دور حیات میں ان مشکلات اور مصیبتوں سے بچ نہ سکا۔

ان کی تکالیف کی ابتداء حسب دستور اپنے گھر سے ہی ہوئی ۔ شہزادہ سلیم کو خطرہ لاحق ہوا کہ باپ کا تخت اس کے بجائے ان کے بیٹے خسرو کو ملے گا جو خان اعظم کا داماد اور راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا۔ انھوں نے ۱۰۰۸ھ سے ہی بغاوت کا علم بلند کیا اور اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا شروع کیا۔ یہ درد سر اکبر کے لیے تا دم مرگ قائم رہا۔ اکبر کا دوسرا بیٹا سلطان مراد، کثرت شراب نوشی، عیاشی اور اخلاقی کمزوری کے سبب، جوانی میں (۱۵ شوال ۱۰۰۲ھ/ ۲ مئی ۱۵۹۹ء) دکن کی طرف جنگ کے دروان فوت ہوا اس روئداد کو بظاہر تو اکبر نے ظاہر نہ کیا تھا لیکن باپ کی حیثیت سے یہ درد اندر ہی اندر اسے گھلا تا رہا۔ دوسرا جوان شہزادہ سلطان دانیال، جس کے نام پر فاروقی سلطنت نے ''خاندیش کا نام مٹا کر '' داندیش'' رکھا تھا وہ عین جوانی میں (۲۰ ذی الحج ۱۰۱۲ھ/ ۲۰ اپریل ۱۶۰۴ھ) فوت ہو گیا گویا دو بیٹے مر گئے تیسرا بیٹا جو تخت کا وارث تھا اور پیروں فقیروں کی دعاؤں کی بدولت پیدا ہوا تھا وہ نہ صرف ان کا مد مقابل بلکہ جان کا دشمن تھا گھر کا یہ حال تھا جبکہ دربار

میں جو ان کے ساتھی، ہم نفس اور محرم راز تھے۔ جن کو نورتن کہا جاتا تھا اور جو درحقیقت اکبر کی سلطنت کی روح، جان اور عزت و آبرو تھے۔ انھوں نے بھی یکے بعد دیگرے اس جہان کو چھوڑنا شروع کیا راجہ بیربر (۹۹۴ھ) پہلے جدا ہوا۔ توڈرمل تقریباً چار سال بعد (۹۹۸ھ) فوت ہوا۔ اس کے بعد فیضی (۹ صفر ۱۰۰۴ھ / ۱۴ اکتوبر ۱۵۹۹ء) راہی ملک عدم ہوا یہ سب اکبر کے خاص الخاص مصاحبین میں سے تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اکبر کی عظمت ان ہی شخصیات کی موجودگی اور رفاقت سے وابستہ تھی۔ اکبر کو آخری صدمہ ابوالفضل کی جدائی سے ہوا۔ (۴ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ/ ۱۲ اگست ۱۶۰۲ء) جو شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی سازش اور اشارہ پر نرسنگ راؤ بندیلہ کے ہاتھوں قتل ہوگیا یہ خبر سنتے ہی بادشاہ نے اپنی دستار اتار کر نیچے پھینکی اور زارو قطار رونے لگا۔ اب اکبر بالکل تنہا رہ گیا تھا اتنے بڑے ملک اور اتنی وسیع شہنشاہیت میں ایسے مرتبہ اور مقام کا آدمی نہیں تھا جس کو وہ اپنے معیار کے مطابق محرم راز کہہ سکے یا جلیس و ہم نفس سمجھ سکے۔

ان پے در پے صدمات نے اکبر کو نڈھال کردیا تھا۔ یہ سلسلہ میر معصوم ہی کی موجودگی میں شروع ہوچکا تھا۔ شہزادہ سلیم کی بغاوت اس وقت عروج پر تھی جب میر معصوم بادشاہ کے ساتھ آسیر کے محاصرے میں شریک تھے، دانیال اور ابوالفضل کا حادثہ ان کی غیر موجودگی میں ہوا تھا۔ بہر حال جب میر معصوم واپس دارالسلطنت پہنچے تو اس وقت اکبر تقریباً بے بس اور لاچار ہوچکا تھا۔ اگرچہ بظاہر جلال الدین محمد اکبر کا جاہ و جلال قائم تھا لیکن اس جلال میں جان نہ تھی

اور نہ ہی وہ جمال موجود تھا جو اس کا خاصہ تھا۔ شہزادہ سلیم گرفتار ہوا۔ عزیز و اقارب نے باپ بیٹے کے درمیان صلح کروائی آخر میں بادشاہ نے اسی میں عافیت اور مصلحت سمجھی کہ اپنی زندگی میں ہی ان کی ولیعہدی کا سرکاری طور پر اعلان کر کے ان کے خدشات کو دور کردے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کیا تو سہی، لیکن شہنشاہ اور ان کی شہنشاہیت اور صحت کا سورج ڈھل چکا تھا۔ اور غروب آنکھوں سے دکھائی دے رہاتھا۔

میر کی آمد کا مرکز:

ہوسکتا ہے کہ اس کے اور بھی اسباب ہوں لیکن ایک سبب یہ بھی ہے کہ دربار اور دارالسلطنت کی اس صورت حال کے سبب جس کا سرسری جائزہ اوپر لیا جاچکا ہے میر کی سفارت کی واپسی کا ذکر معمولی انداز میں دو سطروں میں کیا گیا ہے۔ ۱۰۱۳ھ کے آخری مہینوں میں میر، ایران سے لوٹ کر آگرہ پہنچے تھے دربار میں اسی زمانے میں سندھ کا والی مرزا غازی ترخان، جس کے باغی ہونے کی رپورٹیں پہنچ چکی تھیں۔ ابوالقاسم نمکین اور سعید خان چغتائی کے ہم راہ پہنچا تھا۔ [۱] میر معصوم سندھ سے ہو کر آئے ہوں گے لیکن وطن کے تفصیلی احوال کے لیے مرزا غازی یا میر ابو القاسم نمکین سے ملے ہوں گے جو اس زمانے میں سیہون کے جاگیر دار تھے۔

میر صاحب کی آمد کا ذکر اکبر نامہ کے تکملہ نویس نے سال ۴۹ جلوس (۱۰۱۳ھ) میں کیا ہے جو ۲۷ شوال ۱۰۱۳ھ میں ختم ہوا ان سے ظاہر ہے کہ شوال کی مذکورہ تاریخ سے پہلے جب ابھی ۴۹ واں سال جلوس ختم نہیں ہوا تھا میر آگرہ پہنچ چکے تھے۔ اکبر کی سلطنت کا پچاسواں سال ۲۸ شوال ۱۰۱۳ھ (۱۱ مارچ ۱۶۰۵ء) سے شروع ہوا جس میں اکبر اچانک

پیچش اور اسہال کے سبب بیمار ہو گیا یہ بیماری آخر ان کی موت کا سبب بنی۔

آگرہ میں قیام:

اکبر کی زندگی کے آخری چھے سات مہینے میر معصوم نے آگرہ میں کس طرح گزارے ۔ بادشاہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا وہ آگرہ میں رہے یا کہیں باہر گئے اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں ۔ بہر حال اکبر اسی پچاسویں سال کے درمیانی عرصے میں ایک صدمے ۲؎ کے سبب اسہال کی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۴ جمادی الاول ۱۰۱۴ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء،۳؎ ۶۴ برس ۱۱ مہینے کی عمر میں رات کے وقت فوت ہوئے۔اس طرح جہانگیر کی ذہنی کشمکش اور بے اعتمادی کی کیفیت ختم ہوئی رسم کے مطابق ایک ہفتے تک باپ کا سرکاری پیمانے پر سوگ منانے کے بعد ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ / ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء ”نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی، کے نام سے ہندوستا ن کی مغل سلطنت کے چوتھے شہنشاہ کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا۔

میر معصوم کا قطعۂ تاریخ:

میر معصوم تخت نشینی کے وقت موجود تھے۔ انھوں نے حسب دستور اس نئے بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخ نکالی۔ جو آگرہ قلعے کے دہلی دروازہ پر کتبے کی صورت میں موجود ہے۔

شاہ جہان چون گرفت جای به تخت شرف
تخت زرفعت نهاد، بر زسر چرخ پا

دست دعا بر کشاد، پیر فلك از نشاط
گفت که : بادا مدام حکم تو فرمان روا

خواست کہ نامی کند سال جلوسش رقم
بود در آندم لبش پر زثنا (ودعا)

میل دو چشم حسود یك الفش کرد و گفت
باد جہان بادشاہ شاہ جہانگیر ما

قایله وراقمه محمد معصوم البکری ؒ

اس طرح میر معصوم ہمایوں کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ اکبر کا زمانہ سرکاری ملازمت میں گزار کر تیسرے چغتائی بادشاہ، جہانگیر کے دور میں داخل ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ اس مسئلے پر میری کتاب "مرزا غازی ترخان اور اسکی بزم ادب" دیکھیے۔

۲۔ دیکھیے بلا خمن، ص: ۵۲۰۔۵۲۱، تزک، نولکشور: ۱۶۔۱۷

۳۔ دیکھیے بلا خمن، ص : ۲۲۲، سمتھ ص: ۳۳۷

۴۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی نقل سے لیا گیا اور آرکیالاجیکل سروے آف انڈیا، ۷۲-۱۸۷۱ء، ص ۱۱۵-۱۱۲۔

باب ۔ ۲۰

بکھر کی طرف واپسی

جہانگیر نے باپ سے بغاوت کی جو روایت قائم کی تھی وہ تخت پر بیٹھتے ہی ان کے سامنے آئی۔ خسرو اپنے دادا کی زندگی ہی میں اپنے خسر خان اعظم کو اور اپنے ماموں راجہ مان سنگھ کی مرضی اور منشا کے مطابق اکبر کے بعد تخت نشین ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے باپ کو تخت نشین ہوتے دیکھ کر کھلم کھلا بغاوت شروع کردی۔

جہانگیر ۲۰ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ (۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء) میں تخت نشین ہوئے ابھی تخت نشینی کی روایتی رسوم ختم بھی نہیں ہوئی تھیں کہ ۸ ذی الحج ۱۰۱۴ھ (۶ اپریل ۱۶۰۶ء) خسرو آگرہ سے فرار ہو کر پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ اسی طرح جہانگیر کے گھر میں بھی انتشار پھیل گیا جس کی وجہ سے ان کی اور ان کے خاص مصاحبین کی ساری توجہ اس طرف ہو گئی۔ اور تاریخ کا قلم بھی اس سلسلے میں رواں دواں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جہانگیر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اگر میر معصوم کے سلسلے میں کوئی حکم صادر کیا تو اس کی نوعیت کا ذکر نہیں ملتا گو کہ "تزک" میں سندھ کے دو امراء کے متعلق انھوں نے جو احکام صادر کیے ان کا ذکر موجود ہے۔

میر ابو القاسم نمکین جو اکبر کی وفات سے پہلے حکم کے مطابق مرزا غازی خان کو ٹھٹھہ سے لے کر دربار میں پہنچا تھا یا مرزا غازی جو تخت نشینی کے وقت موجود تھا ان کے لیے جہانگیر نے جو احکامات صادر کیے ان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن میر معصوم جو یقیناً ان کی تخت نشینی کے وقت دارالسلطنت میں موجود تھا اس کے متعلق جہانگیر نے کچھ نہیں

لکھا ہے حالانکہ وہ ان کے والد کے ایک قدیم اور اہم امراء میں سے تھے اور تازہ ایران کی کامیاب سفارت سے واپس لوٹے تھے۔

اکبر نامہ کے تکملہ نویس نے امیر نمکین اور مرزا غازی کی شاہی حضور میں باریابی اور انعام ملنے کا تذکرہ کیا ہے۔ [ا] لیکن میر معصوم کے سلسلے میں صرف ایران سے پہنچنے کی اطلاع درج کر کے خاموش ہو گئے۔

امین الملکی:

میر معصوم کو امین الملک کے خطاب سے سب سے پہلے اکبر نے اپنے خط میں یاد کیا ہے۔ جہانگیر کے دور میں پہلی اطلاع جیسلمیر کے دو کتبوں سے ملتی ہے جس میں انھیں خطاب یا عہدے سے یاد کیا گیا ہے۔ جیسلمیر کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی عمارت پر درج ذیل کتبہ ہے:

این تازہ بنا چو میر معصوم نہاد
چرخ فلکش دید و برو تحسین گفت
ھنگام بنا چو خلق کردند دعا
از ھر طرفی خیل ملک آمین گفت
چون بود زسنگ، سال بنیادش عقل
بنیاد نمود زینۂ سنگین گفت

نواب سیادت پناہ ابوی ام امیر محمد معصوم البکری النامی المخاطب بہ امین الملک بہ جہت یادگار این عمارت بنا فرمودہ ۱۰۱۴ھ۔

اسی عمارت پر دوسرا کتبہ یہ ہے:

نواب سیادت و
نقابت پناہ ابوی ام
امیر محمد معصوم بکری
المتخلص بالنامی و
المخاطب بہ امین الملک

این سر منزل به جهت
آسایش خلایق بنا نمود
حرره العبد
میر بزر گ
۱۰۱۴ھ

ان ذرائع کے بعد پہلی تحریری معلومات "ذخیرة الخوانین" کے مصنف نے دی ہے جو بکھر کا باشندہ تھا اور اس گھرانے سے ان کے مراسم تھے لیکن بنیادی طور پر ان کی اطلاع غلط ہے۔ لکھتے ہیں:

"سال ۱۰۱۵ (؟) ہند سے وطن پہنچے......عمر کے آخری زمانے میں اپنے وطن میں امین الملک پر پہنچے۔[۲]

یہی کتاب کیوں کہ مآثر الامراء کا ماخذ ہے اس لیے اس کے مصنف نے بھی یہی بات دہرائی ہے۔

"در سن ۱۰۱۵ از درگاہ جنت مکانی به عنوان امین الملکی به بکر رفته بود"۔[۳] ان تحریروں میں نہ صرف سال غلط ہیں بلکہ امین الملک بننے کا زمانہ بھی غلط دیا گیا ہے۔

بکر واپسی رمضان ۱۰۱۴ھ

میر آگرے سے رخصت ہو کر ۱۰۱۴ھ میں وطن لوٹے واپسی میں انھوں نے راستے میں دو کتبے نصب کیے جن سے واپسی کا مسئلہ حل کردیا ایک کتبہ جے پور میں "نرانہ تلاء" کے بڑے تر پوطیہ دروازے پر نصب ہے جس کی عبارت اس طرح ہے:

چند بخسپی تو، درین خوابگاه
خیز که بسیار دراز است راه
قایله و راقمه محمد معصوم البکری نامی ۱۰۱۴ھ

خوش قسمتی سے دوسرے کتبے سے واپسی کا مہینہ بھی معلوم ہوتا ہے۔جو آگرہ اور فتح پور کے درمیان ملا کر گاؤں کی ایک

مسجد پر ہے جو سلیمہ سلطانہ کے باغ اور مدفن گاہ میں ہے۔ اسی مسجد پر دو متصل کتبے نصب کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں پہلا ایران جانے والے سال کا ہے۔

"بندگان حضرت ظل الهی بعد از فتح دکن بنده رااز
آگره به جانب عراق و خراسان سنه ۱۰۱۰ھ مرخص فرمودند.
حرره محمد معصوم بکری بن سید صفائی المتخلص به نامی".

یہ دوسرا کتبہ ہے جو مذکورہ بالا کتبے کے ساتھ نصب ہے۔

"من معدن الافکار
بختي عمر ست چنان راهوار کش نتوان باز کشیدن مهار
نامی از ین ره دلت آگاه به ساز به اندازه از ین راه به
قایله و کاتبه محمد معصوم النامی والبکری
تحریر فی شهر رمضان ۱۰۱٤ھ" [۲]

اس کتبے سے ظاہر ہوتا کہ میر معصوم جہانگیر کی تخت نشینی (جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ) کے دو مہینے بعد اپنے وطن لوٹے۔ تخت نشینی کے موقعے پر موجود تھے۔ لیکن کسی بھی انعام و اکرام منصب و تقرر کا جہانگیر یا دوسرے مورخ نے ذکر نہیں کیا ہے۔

میر صاحب کی عمر کم و بیش ستر، اکہتر برس کے قریب ہوچکی تھی اکبر بادشاہ جس کے دور میں وہ امیر کے عہدے پر فائز ہوئے، اور جوانی گزاری۔ وہ فوت ہوچکا تھا اب نیا بادشاہ اور نیا زمانہ تھا۔ خود میر صاحب بھی اس عمر میں باہر رہ کر ملازمت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اسی لیے جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد تقریباً دو مہینے دارالسلطنت میں قیام کیا اس کے بعد رمضان میں روانہ ہوئے راستے میں یاد گاری کتبے نصب کرتے سوانح نگاروں کے لیے آسانی پیدا کرتے ہوئے بکھرپہنچے تاکہ زندگی کے بقیہ ایام آرام و آسائش کے ساتھ اپنے وطن میں، عزیز و اقارب اور دوستوں کے ساتھ گذاریں۔

حوالہ جات

۱۔ (سال ۵۰ اکبری ۱۰۱۳ھ) چھار دھم مھرماہ الھی سعید خان با پور خود و ابوالقاسم نمکین ملازمت نمود میرزا غازی پور میرزا جانی ترخان از تتہ آمدہ جبین بہ سجود آستان اقبال نورانی ساخت و گزیدہ پیشکش بہ نذرانہ گزرانید. ھیژدھم بہ میرزا غازی و ابو البقا اوزبك گوھر مرصع و بہ عابدی خواجہ جمدر مرحمت شد. (اکبر نامہ: ۳: ۸۳۹)

۲۔ در سال ۱۰۱۵ھ از ھند بہ وطن رسیدہ......در آخر عمر کہ امین الملك دیار وطن خود شدہ آمد ....(۱: ۲۰۴)

۳۔ ۳: ۳۲۷ ''جنت مکانی'' جہانگیر کے مرنے کے بعد کہا جاتا تھا اور ''عرش آشیانی' اکبر کے لیے مخصوص تھا۔

۴۔ آثار اکبری یعنی تاریخ فتح پور سیکری از محمد سعید مارھروی، ص ۴۱-۴۲، آگرہ ۱۳۲۴/ ۱۹۱۵ء۔ سلیمہ سلطان بیگم پہلے بیرم خان کے نکاح میں تھی۔ پھر اکبر کے حرم میں آئیں۔یہ انھی بیگم کا باغ تھا۔ وہ خود بھی اس باغ میں دفن ہوئیں۔ باغ اور مدفن دونوں نا بود ہو گئے ہیں وہ جگہ "باغ شاھی" کے نام سے معروف ہے آگرہ سے مدھا کر بارہ میل پر ہے مسجد جس پر کتبہ ہے اس کی پیمائش ۴۲ x ۲۳ انچ ہے۔ صحن سمیت اراضی ۵۹x۴۲ فٹ ہے اسی کے ستون پر یہ کتبہ ہے۔ جہانگیر کے دور میں بیگم کا انتقال ہوا۔ اور ان کے حکم کے مطابق وہیں دفن ہوئیں جس کا ذکر انھوں نے تزك میں کی ہے ۔ (تزك نولکشور: ص : ۱۴)

باب ۔ ۲۱

وفات

میر معصوم کی وفات کے بارے میں اولین مبہم تحریری اطلاع "ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف نے ان الفاظ میں دی ہے:

"در سال ۱۰۱۵ھ از هند به وطن رسیده داعیِ حق را لبیك اجابت کرد......"[۱]

اسی کی نقل مآثر الامراء کے مصنف نے تقریباً اِنھی الفاظ میں اس طرح کی ہے:

"درسنه یك هزار و پانزده از بارگاه جنت مکانی به عنوان امین الملکی به بکر رفته ودیعت حیات سپرد."[۲]

دوسرے تذکرہ نویسوں[۳] نے مآثر الامراء کی تقلید میں وفات کا سال ۱۰۱۵ لکھا ہے مثلاً نتائج الافکار، گل رعنا، انیس العاشقین، نشتر عشق اور شمع انجمن وغیرہ۔ یہ تذکرے ایک دوسرے سے نقل کرتے رہے ہیں صرف روز روشن کے مصنف نے غالباً آفتاب عالمتاب کی تقلید میں[۴] ان کی وفات کا سال ۱۰۱۹ھ لکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

"......و درسنه تسع عشرو الف (۱۰۱۹ھ) رخصت حاصل کرده به وطن رفت و همان سال در آنجا به جوار رحمت ایزدی پیوست."[۵]

اس عبارت کے بعد تاریخ کے لیے یہ مصرع دیا ہے

"بوده نامی صاحب ملك سخن"

(۱۰۱۹ھ)

اس تاریخی مصرعے کے غلط اندراج کی وجہ سے ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے قبر پر کندہ مصرعے کو غلط سمجھتے

ہوئے۔[6] میر کی وفات کا سال ۱۰۱۹ھ تسلیم کرلیا "بود" اور "بوده" کا قصہ چھیڑ کر یہ مفروضہ قائم کیا ہے سب سے پہلے مولانا شفیع لاہوری نے "روز روشن" کے مصرعہ کو صحیح سمجھ کر اپنے مقالے میں درج کیا[7] جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان کی تائید میں لکھا ہے ان دونون بڑے محققین سے یہ سہو، تعجب انگیز ہے دونوں نے قبر بھی دیکھی جن پر تاریخ کا مصرع بالکل صاف اور واضح موجود ہے۔ فنی لحاظ سے بھی مصرعے میں کوئی سقم نہیں ہے۔

وفات کی تاریخ اور سال:

جیسا کہ گذشتہ باب میں دکھایا گیا ہے میر صاحب آگرہ سے رمضان ۱۰۱۴ھ میں لوٹے اور اسی مہینے میں گاؤں پہنچے۔ یہ سفر نہ صرف آپ کا دارالسلطنت سے آخری سفر تھا بلکہ میر صاحب کی زندگی کا بھی آخری سفر ثابت ہوا گاؤں پہنچتے ہی کسی بیماری میں مبتلا ہوئے دو مہینے بعد رخت زندگی باندھا اور اگلے جہان کی طرف عازم سفر ہوئے۔

میر صاحب کی قبر کے پاؤں کی طرف سے قبر پر مندرجہ ذیل تاریخی اشعار اس قدر صاف اور خوش خط ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کل ہی کسی نے کندہ کیے ہیں۔

میر معصوم، آن مہ برج شرف
آفتاب شرع و دین، فخرِ زمن
روز جمعہ سادس ذی الحج گشت
عازم جنت بہ امرِ ذو المنن
سال فوتش از خرد جستم، بگفت:
بود نامی، صاحب ملك سخن

اس قطع کے مطابق، میر صاحب رمضان میں گاؤں پہنچے،

مشکل سے دو مہینے قیام کیا اور بروز جمعہ ۶، ذی الحج ۱۰۱۴ھ (۴اپریل ۱۶۰۶ء) کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ تاریخ آپ کے بیٹے میر بزرگ کی تصنیف کردہ ہے۔ جیسا کہ میرے مرحوم دوست احسن کربلائی نے حیدر آباد کے تالپوروں کے شاہی کتب خانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ (میں) خود میر معصوم کے دیوان کا ذاتی نسخہ دیکھا جس پر میر صاحب کے ہاتھ کی یہ عبارت لکھی ہے:

"این کتاب حق ملك میر معصوم ترمذی قنداری غرہ شوال ۱۰۱۲ھ- راقم معصوم بکری"۔

اس نسخے پر میر بزرگ کے ہاتھ کی یہ عبارت لکھی ہے:

تاریخ وفات حسرت آیات

مرحوم مغفور جناب مغفرت مآب حضرت قبلہ و کعبہ من میر معصوم ترمذی بکری علیہ رحمة والغفران تاریخ ششم ذی الحج ۱۰۱۴ ھجری یوم جمعہ وقت ھفت ساعت صبح از ین جھان فانی به عالم جاو دانی رحلت فرمودند."

اس عبارت کے بعد مذکورہ بالا قطعہ دیا گیا ہے اور آخر میں ہے۔

"راقم المصنف میر بزرگ به تاریخ پانزدھم ذوی الحج ۱۰۱٤ھ"

یہ عبارت مرحوم کربلائی نے اپنے مضمون میں نقل کی ہے۔ [۸] جسے یہاں من و عن بیان کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ عبارت کے املاء میں کچھ معمولی غلطی یا ردو بدل کی گئی ہو۔ بہر صورت اس عبارت کے بعد اس میں شك کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ:

الف) مزار پر درج شدہ کتبہ میں سال، مہینہ اور دن وہی ہے جو دیوان پر دیکھا گیا ہے۔

ب) کربلائی صاحب کی تحریر کے مطابق تاریخ میر بزرگ کی

تصنیف شدہ ہے جسے انھوں نے وفات کے دس دن بعد تصنیف کر کے اس دیوان پر درج ہے جو کہ میر معصوم کا اپنا اور ذاتی نسخہ تھا۔

ج) وفات جمعے کے دن صبح سات بجے ہوئی۔

عمر:

میر صاحب کی خاندانی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اگر ان کی ولادت ۹۴۴ھ میں فرض کرلی جائے تو وفات کے وقت ان کی عمر ستر برس ہوتی ہے۔ لیکن اگر تقی کاشی کے بیان کے مطابق ۱۰۱۲ھ میں میر صاحب کو ساٹھ برس کا سمجھ لیا جائے تو اس صورت میں انھوں نے باسٹھ تریسٹھ برس کی عمر میں یہ جہان چھوڑا بہر حال، ہندوستان سے لوٹنے کے فورا بعد یقیناً ناگہانی بیماری سے ان کا انتقال ہو گیا یہ بات اپنی جگہ پر واقعی تعجب خیز ہے اسی لیے مولوی شفیع اور ڈاکٹر داود پوتہ نے ۱۰۱۴ھ کے سال پر اعتبار نہ کرتے ہوئے، ۱۰۱۹ھ کے سال کو ترجیح دی ہے۔

میر معصوم کا آبائی قبرستان پہلے ہی سکھر میں نہایت پُر فضا مقام پر موجود تھا جہاں وہ اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

میر صاحب کی وفات پر، سندھ کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کا ایك بھرپور باب ختم ہوا۔ یہ ساٹھ ستر برس کا (۹۴۴-۱۰۱۴ھ) طویل عرصہ ہر لحاظ سے سندھ، ہند، ایران اور ماوراء النہر کی سیاسی تاریخ کے لیے اہم اور افراتفری کا دور تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں سوری (۹۴۷ھ- ۹۶۲ھ) اور مغلوں کی کشمکش رہی۔ ہمایون، ایران کی طرف فرار ہو گیا۔ کچھ سالوں کے بعد (۹۶۲ھ) واپس آیا۔ اکبر سندھ میں پیدا ہوا (۹۴۹ھ) تخت نشین ہوا۔

افغانستان کے اندر مختلف علاقوں پر علیحدہ علیحدہ قبضے ہوتے رہے۔ قابضین بدلتے رہے۔ طہماسپ اول (۳۰-۹۸۴ھ) جس نے ہمایون کو پناہ دی اور شاہ عباس اول (۹۹۶-۱۰۳۸ھ) جنھوں نے ایران میں غیروں کا قبضۃ ختم کر کے ملك کو متحد کیا۔ ہند کی مغل حکومت اور ان کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے۔ جسے میر معصوم نے جاکر درست کیا ماوراء النہر میں ۹۴۰ھ سے ۱۰۰۷ تك شیبانی خاندان کے نو(۹) خان تخت نشین ہوئے جن میں سے عبداللہ خان ثانی (۹۹۱-۱۰۰۶) اہم بادشاہ تھا۔ جنھوں نے خراسان، افغانستان اور مغل سرحدوں کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا او ر اکبر اور شاہ عباس کے درمیان تعلقات پر اثر انداز ہوا۔ ہندوستان میں اکبر نے اپنی سلطنت کی حدود میں توسیع کی جس میں میر معصوم شریك رہے۔ مثلاً بنگال، گجرات، خاندیش وغیرہ کی فتح میں میر معصوم شریك تھے۔ الغرض میر صاحب اس ستر سالہ تاریخ کا ایك اہم کردار تھے جس کو تاریخ کسی طرح بھی فراموش نہیں کرسکتی۔

حوالہ جات

۱۔ ذخیرہ: ۱، ص ۲۰۴

۲۔ مآثر ۳: ص، ۳۲۷

۳۔ ان تذکروں کی عبارتیں اس طرح ہیں:

گل رعنا:در سنہ خمس عشر والف از بارگاہ جہانگیر رخصت گرفتہ بہ عنوان امین الملکی بہ وطن خود بکر رفت و در ہمان سال آنجا و دیعت حیات سپرد." (خطی)

انیس العاشقین: وفات میر درسنہ ۱۰۱۵ھ یك ہزار پانزدہ اتفاق افتادہ ..." (خطی)

نشتر عشق:آخر سنی در سنہ یك ہزار پانزدہ از درگاہ جہانگیری رخصت حاصل کردہ در وطن خود بہ بکر آمد و بہ ہمان سال در گذشت...(خطی)

نتایج الافکار: ... درسنہ ۱۰۱۵ھ خمس و عشر و الف از پیشگاہ جہانگیری بہ تقرب امین الملکی دستوری یافتہ بہ وطن خود شتافت و درہمان سال بہ سفر آخرت پرداخت...". (مطبوعہ)

شمع انجمن: ... درسنہ ۱۰۱۵ھ در بکر بمرد ..." (مطبوعہ، ص ۴۶۶)

۴۔ مضمون شمس اللہ قادری رسالہ تاریخ جنوری ۱۹۲۹ع

۵۔ ص، ۶۷۹

۶۔ دیکھیے مقدمہ معصومی (یز) ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ دال ساکن ہونا چاہیے، اسی لیے قبر پر کندہ مصرعہ غلط ہے؟

۷۔ اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۷ھ

۸۔ نئی زندگی، فروری ۱۹۵۴ع، ص، ۳۳

باب ۔ ۲۲

ذاتی زندگی، سیرت اور کردار

میر معصوم کے رہن سہن طور طریقے اور مشاغل یا جس طرح سے انھوں نے وقت گزارا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت اعلی کردار کے حامل تھے۔ ہمدردی، خوش خلقی، خوش وضعی، خدا ترسی، زہد، عبادت گزاری، پرہیز گاری، علم دوستی اور خوش صحبتی ان کے کردار کے خاصے تھے۔ تمام سوانح نگاروں نے آپ کے ان اوصاف کی تعریف کی ہے۔ تقی کاشی نے انھیں "انسانی صورت میں ملائک" کہا ہے۔

معاصر اور مقامی مؤرخین کی رائے:

نظام الدین احمد جو ان کی ابتدائی زندگی کے ساتھی اور سرپرست تھے انھوں نے آپ کی پرہیز گاری اور متقی ہونے کی تعریف کی ہے اور لکھتے ہیں کہ سالہا سال تک ان کے ساتھ صحبت رہی۔ [1] جہانگیر بادشاہ نے مطربی سمرقندی کو اپنا تذکرہ بطور تبرک اپنے تذکرے مں شامل کرنے کے لیے دیا۔ اس میں بھی انھوں نے وہی نظام الدین کی عبارت کا اعادہ کیا ہے۔ [2] ملا عبدالقادر بدایونی اپنے دور کے متعصب اور کٹر ملا سخت گیر اور تنگدل مورخ ہیں اکبر اور اکثر تمام امیروں اور قابل ذکر لوگوں سے ناراض اور نالاں ہیں یہ میر معصوم کی سلیم طبیعت اور پسندیدہ اطوار کا انتہائی کمال ہے کہ ایسے مزاج اور تنگ دل شخص سے آپ کے دوستانہ، نہایت خوشگوار اور استوار مراسم تھے۔ مثلا آپ کے اخلاق، درویشانہ صفات، انسانی فضیلت، دیانتداری، سخاوت،

،شجاعت تقویٰ اور پرہیز گاری سے مطمئن ان کی صفات کے معترف اور ان کی خوبیوں کے بارے میں رطب السان ہیں ۳۔ ایسے مورخ کی سند کو میر معصوم کے انتہائی انسانی کمال کی دلیل سمجھنا چاہیے۔

تقی کاشی کاقول:

ان مقامی مصنفین کے علاوہ جنھوں نے میر معصوم کو دیکھا۔ جن کے ساتھ ان کی مجلس اور صحبت رہی ان میں سے چوتھا تذکرہ نویس ایک غیر ہندی یعنی تقی کاشی ہیں جو کاشان میں آپ سے ملنے کے بعد آپ کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں سے اگر متاثر لفظوں کی اور عبارت کی رنگینی چھوڑ کر نفسِ مطلب کو دیکھا جائے تو میر صاحب کی شخصیت اِس طرح سامنے آتی ہے۔

-- میر معصوم بکھر کے عظیم اور اشرف سادات میں سے تھے۔

-- پورے ہندوستان کے اکابر فضلاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

-- ایران اور توران میں آپ جیسے بلند اخلاق ، شاندار طبیعت، بلند مرتبہ ، امیر کی مثال نہیں ملتی۔

-- ہر خاص و عام میں ان کی خوش اخلاقی، فضیلت، شفقت اور رحم دلی کی شہرت تھی۔

-- صفائی، پاکیز گی، تقویٰ، پرہیز گاری، کثرت طاعت و عبادت گزاری میں شاید کوئی ثانی ہو۔

-- فرائض اور رسموں کی پابندی ، نماز باجماعت ادا کرنے کی عادت ابتداء سے آخر کے تک رہی۔ کاشان پہنچتے وقت آپ کی عمر ساٹھ برس تھی پھر بھی رات دن کے

نوافل اور تہجد کبھی قضا نہیں کیے۔ بکھر کی جامع مسجد (جو انھوں نے بڑی شان و شوکت سے تعمیر کرائی تھی) میں پانچ وقت نماز با جماعت ادا کرتے اسی لیے آپ کے سب متعلقین اور احباب لازمی طور پر مسجد میں حاضر ہوتے۔

-- بہادری، شہسواری، تیراکی اور تیر اندازی میں ان کا کوئی ثانی اور شریک مشکل ہی سے ملے گا۔

-- فہم و فراست، عقل، سلیقہ اور معاملہ فہمی میں یگانہ روز گار تھے۔

-- شعرو سخن یا ذوق کے لحاظ سے انھیں تمام شعراء کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ خراسان اور عراق تک آپ کے فن اور کمال کے معترف موجود ہیں۔

-- پانچ مثنویاں کہیں جن میں "رای و صورت" لیلیٰ و مجنوں کے بحر میں اور "حسن و ناز" یوسف و زلیخا کے وزن پر ہے۔ ان دونوں میں خیال کی لطافت اور معنی آفرینی کی بلندی ہے۔

-- ہندوستان کے سخن شناس اور خراسان کے نکتہ سنج اسی رائے سے متفق ہیں کہ ان دونوں کتابوں کے اکثر حصوں میں وہ مولانا جامی پر سبقت لے گئے ہیں۔

میر معصوم نے ایران کا جو سفر کیا اس کی روداد یا اس کے متعلق پیدا شدہ عام احساسات انہوں نے لکھے ہیں جن سے میر صاحب کی زمانہ شناسی، شان و شوکت اور ان کی غیر معمولی ذہانت، معاملہ فہمی اور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

-- جس شہر میں پہنچتے وہاں کے سرکاری امراء اور افسر غیر سرکاری بزرگ اور دوسرے اہم افراد آپ کا نہایت شاندار استقبال کرتے تھے۔ سفر کی صعوبتوں اور کلفتوں

کو بالائے طاق رکھ کر سب سے نہایت وقار، تمکنت، تحمل اور خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔

-- دستور کے مطابق ہر شہر کے معززین آپ کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کرتے تھے۔ لیکن آپ انھیں قبول نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے قافلے کے اخراجات بہت زیادہ تھے وہ خود اسے ذاتی طور پر برداشت کررہے تھے۔

-- دوسروں کے تحفے تحائف قبول کرنے کے بجائے اپنی طرف سے ہر ملاقاتی کو ان کی حیثیت اور منصب کے مطابق تحائف دے کر اور ہر ایک کے ساتھ مختلف قسم کے احسانات کرکے اپنا گرویدہ بناتے تھے۔ مختصراً یہ کہ جو ملاقاتی ان کے پاس آتا خالی ہاتھ نہ جاتا۔

تقی کاشی نے اپنی ذاتی ملاقات کا تأثر درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''چون به دار المومنین کا شان رسید، مسود این اوراق را شرف ملاقات آنحضرت دست داد، و صحبت کیمیا اثر آن مهبط فیوضات ربانی افتاد. ملکی دیدم بصورت شخصی مصور و عالمی در تحت همت ذاتی مسخر.''

آپ نے میر کی بات چیت، گفتگو اور انداز صحبت کی جو منظر کشی کی ہے اس کا تأثر ترجمے کے ذریعے قائم رکھنا مشکل ہے۔ اصل روح در اصل ان ہی الفاظ میں موجود ہے جو مصنف نے لکھے ہیں لکھتے ہیں:

> '' محاورتی چون آب روان روح افزای، ولطف طبعی چون جوهر روح غمزدای. فصاحت شاعری و صنعت نکته وری باهم جمع کرده، و لطف و حلم و شفقت و مرحمت باوقار و تمکین و جلال و کمال بریک بساط جای داده. نظمش

عذب تر از ماء معین، و نثرش لطیف تر از گل
نسرین، طلاقت وجه و حلاوت لسان از آبای
کرام عظام واولیای ذوی الاحترام میراث یافته ،
وحسن محاورت و اظهار مصادقت و طیب
مشاعرت و لطف معاشرت به واسطۂ قرب
سلاطین و آداب خدمت ایشان به واجبی
دانسته......"

آخر میں لکھتے ہیں کہ:- القاصر السنه الاقلام عن تعداد اوصافه- کے مطابق زبان و قلم دونوں اس بزرگ شخصیت کے اوصاف مکمل طور سے بیان سے قاصر ہیں اس لیے مجبوراً قلم کو دوسرے مسائل اور معاملات کی طرف موڑا جاتا ہے جو ایران کے سفر کے دوران پیش آیا۔

میرک یوسف کا تاثر:

مندرجہ بالا چار مصنفین جن کے تاثرات پیش کیے گئے انھوں نے میر کو دیکھا۔ ان کے بعد ان کے قریب العہد سوانح نگار میں پہلے میر ابو القاسم نمکین کے بیٹے اور "مظہر شاہجہانی" کے مصنف ، میرک یوسف جنھوں نے اپنی کتاب میر کی وفات کے تیس سال بعد (۱۰۴۴ھ) لکھی جبکہ وہ لوگ ابھی زندہ تھے جنھوں نے میر کو دیکھا اور مصنف کا اپنا بھائی ابوالبقا امیر خان یا خاندان کے دوسرے افراد جن کا ہم شہری ہونے کے سبب میر کے خاندان سے تعلق تھا وہ ابھی موجود تھے اس کے علاوہ میر کی شخصیت اور سلوک سے متعلق بھی لوگوں میں چرچا موجود تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنے موضوع پر بحث کرتے ہوئے میر کے لیے جو تھوڑا بہت لکھا ہے وہ ان کی شخصیت کی پوری عکاسی کرتا ہے زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور کسانوں اور دوسرے لوگوں سے ان کے حسن سلوک کو

بیان کرتے ہوئے اور میر کی جاگیر کا ذکر کرتے ہوئے میرک نے لکھا ہے۔

"و این ہر دو پرگنہ (کاکری و دربیلا) رادر آبادانی و معموری بہ مرتبہ رسانیدہ بود. و بیان خوش سلوکی وی بہ مردم رعیت ودینداری او گنجایش این رسالہ ندارد، بنا بر آن اقتصار در اظہار عمل او کرد"۔ ۴ے

شیخ فرید بکھری کا قول:

یہ دوسرا سوانح نگار میر معصوم کا ہم وطن ہے اس کے ساتھ ان کے خاندانی مراسم تھے۔ اپنے تذکرہ "ذخیرۃ الخوانین" جو انھوں نے میر کی وفات کے سینتالیس سال بعد (۱۰۶۱ھ) میں لکھا، میں میر کا احوال، خاندانی رابطے، چشم دید روایات، اور معتبر لوگوں کی سنائی ہوئی باتوں کی روشنی میں درج ہے اس میں آپ نے میر کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان کا محاصل اس طرح ہے:

-- ہم شہریوں کی خوشی اور غم میں وہ خود اور ان کے اہل خانہ پا پیادہ جاکر شریک ہوتے تھے۔
-- پیدل چلنے یا غریبوں اور مسکینوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے میں عار نہیں سمجھتے ہیں۔
-- عزیز و اقارب اور غریبوں اور مسکینوں کے لیے تحفے تحائف اور خطوط بھیجتے تھے جو شکار میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔
-- شہر میں تمام چھوٹے بڑوں، غریبوں، بیواؤں، عزیزوں اور ضرورتمندوں کو سالانہ، ماہانہ، روزانہ، جو کچھ مقرر تھا، پہنچتا رہتا تھا۔
-- نماز، روزہ اور تہجد کبھی قضا نہیں کیے، انتہائی

پرہیز گاری اور وقت کی پابندی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی۔

-- سخاوت میں بے مثل تھے (سخاوت به افراط مینمود). ۵ ے

دوسرے تذکرہ نگار:

صاحب ذخیرۃ الخوانین کا تتبع کرتے ہوئے مآثر الامرا کے مصنف شاہنواز نے میر کا احوال شیخ فرید بکھری سے لے کر الفاظ کے الٹ پھیر سے بیان کیا ہے مفہوم وہی ہے لیکن عبارت کے الفاظ میں رد و بدل کردیا گیا ہے جو یوں ہے:

"زهد و تقویٰ به کمال داشت و همت و سخاوت را به جائی رسانید که به مردم اجلاف بکر سوغات از هندوستان می فرستاد، به اکابر و اصاغر سالیانه مشاهره و ماهیانه و فصلانه و جمعگی مقرر کرده بود." ٦ ے

مغلوں کے دور میں ان کے اپنے سماجی رواج کے مطابق ذاتی امیر یا عزیز تو قابل ذکر تھے لیکن غریبوں ، مسکینوں، کسانوں یا دوسرے لوگوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا یا غم و خوشی میں آنا جانا تعجب انگیز تھا۔ میرنے مغل سوسائٹی اور اپنے معاصر امراء کے غریب طبقے سے انس اور محبت کا مظاہرہ کیا تو سب کے لیے حیرت کا سبب بن گیا اور تاریخ نے اس واقعے کو عجوبہ کے طور پر تحریر کیا ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں کے ماخذ کیوں کہ یہی کتابیں ہیں، اسی لیے سب نے الفاظ کے الٹ پھیر سے ہُو بہو اسی بات کو دھرایا ہے۔

میر کی خامیاں:

مذکورہ بالا اوصاف اور مزاج کے اس شاہانہ طور طریقے

کے ساتھ ساتھ آخر وہ انسان تھے کچھ کمزوریاں ضرور ہونی چاہئیں، جو ان میں موجود تھیں جن کا ذکر آپ کے ہم شہر تذکرہ نگار شیخ فرید بکھری نے کیا ہے۔ مثلاً لکھا ہے جب میر اپنے گاؤں لوٹ آیا تو اس نے نے اپنے پڑوسیوں کی جگہوں پر قبضہ کر کے اپنی جگہوں کو وسیع کیا اور پڑوسیوں کو رنجیدہ کیا۔"[۷]

میر امین الملک بن کر جب وطن لوٹے تو مشکل سے دو مہینے زندہ رہا۔ یقین نہیں آتا کہ ان دو مہینوں میں انھیں اتنی فرصت کہاں سے مل گئی کہ اپنے کام کاج سمیٹ کر آرام سے بیٹھتے اور پڑوسیوں کی جگہوں پر قبضہ کر کے اپنی حویلی کو وسیع کر کے آزار کا سبب بنے۔ میر نے بیس بیگھا زمین پر اپنی حویلی کے قریب باغ لگوایا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ۹۹۹ھ سے ۱۰۰۳ھ کا ہونا چاہیے میر کی تو ساری زندگی سفر میں اور وطن سے باہر گذری مجموعی طور پر درمیانی آمد و رفت میں انھیں مشکل سے دو تین سال بکھر میں رہنا نصیب ہوا ہو گا۔

ہوسکتا ہے کہ میر نے اپنی ضرورت کے مطابق پڑوسیوں سے زمین لی ہو اور پڑوسی اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر تیار نہ ہوں لیکن میر کی شخصیت اور مرتبے سے مرعوب ہو کر مجبور ہو گیا ہو لیکن یہ ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ میر نے بغیر معاوضہ کسی کی زمین لے کر ان کو ناراض کیا ہو گا۔

ذخیرہ کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر کا اپنے گاؤں والوں سے جو حسن سلوک تھا وہ آخری عمر میں قائم نہ رہ سکا ان کے سلوک میں فتور آگیا اور انکا مزاج بدل گیا۔[۸]

ذخیرۃ الخوانین نے میر کی دوسری دو تین کمزوریاں بیان کی ہیں مثلاً:

-- چغل دوست اور کان کا کچا تھا۔ چغل خوروں کو پسند کرتا تھا اور ا ن کے کہنے پر عمل کرتا تھا۔

-- دشمنی میں سخت تھا، گویا جس سے عداوت ہوئی اس کے ساتھ انتہا کی۔۹۔

ممکن ہے کہ کسی خاص وجوہ کی بناء پر یہ واقعات رونما ہوتے ہوں یا فرید بکھری نے یہ باتیں ان لوگوں سے سنی ہوں جو کسی خاص واقعے سے متاثر ہوئے ہوں۔ بہر حال میر آخر انسان تھے فرشتہ نہیں کہ ہمہ صفت موصوف ہو اور ہمہ وقت ایک جیسا ہو۔ انسان ایک برج پر نہیں ٹھہر سکتا آخر انسان میں کچھ کمزوریاں ہونی چاہئیں۔

دوستی اور دشمنی میں انتہا پسندی سندھی معاشرے کی خاص صفت ہے۔ اس لیے میر اگر "شدید العداوت" تھے تو اسی کے ساتھ دوستی اورفروتنی میں بھی بے مثل تھے چغل خوروں کا وجود امارت کا لازمی جزو ہوتا ہے امیرانہ معاشرے میں ایک دوسرے کے خلاف چغلی اور سازش کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے میر بھی اسی حلقے کا ایک فرد تھے اس لیے ان کا سو فیصد درست ہونا غیر طبعی ہے بہر صورت یہ دونوں کوتاہیاں ان میں نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ لیکن یہ ایسی نہیں ہیں جو ان کے اخلاق پر دھبہ ہوں۔

شکار کا شوق:

اگرچہ میر طبعاً فقیر منش درویش صفت انسان تھے لیکن ملازمت اور عہدے کی بناپر بود وباش امیرانہ اور شاہانہ تھا، یادگار قائم کرنا، عمارات تعمیر کروانا، خیرات ، سخاوت اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا ان کی فطرت تھی جبکہ شکار ان کی کمزوری تھی۔ ابتدائی زندگی میں بھی کئی کئی میل شکار کے لیے جاتے اور سرکاری ملازمت کے دوران بھی شکار کا شوق برقرار رہا۔

انھوں نے اپنی جاگیر کے اندر خاص شکار گاہیں تعمیر وائی تھیں۔ جن کی حفاظت کے لئے اپنے کسانوں اور چوکیداروں کو خاص ہدایت کی تھی لیکن آپ کا حکم تھا کہ جنگل کے کچھ حصے شکار کے لیے چھوڑے جائیں۔ ۱۰ شکار کے موقع پر جو لوگ ان کے ہم راہ ہوتے تھے ان کا بہت خیال رکھتے تھے ہندوستان میں قیام کے دوران بھی ہر ایک کا حال معلوم کرتے رہتے اور ان کو تحفے تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ ۱۱

مآثرالامراء کا مأخذ ذخیرة الخوانین ہے۔ لیکن لفظوں کی تبدیلی اس طرح کی گئی ہے، : " ... چون به شکار نهایت مولع بود اکثر اوقاتش به تصید سی گذشت ..." ۱۲ مظہر شاہجہانی کے مصنف میرک یوسف نے کاکڑی اور دربیلا کی جاگیروں کا ذکر کرتے ہوئے میر کے شکار کو بیان کیا یہ لکھتے ہیں: "میر معصوم تیر و کمان سے شکار کرتے تھے ان دونوں پرگنوں میں آپ کی شکار گاہیں موجود تھیں لیکن آبادی کے سبب یہاں شکار ختم ہو گیا تو انھیں شکار کے لیے اپنے علاقے سے باہر جانا پڑتا تھا۔ ۱۳

کھیتی باڑی اور زرعی اصلاحات:

میر صاحب کی زندگی اول تا آخر منظم اور بامقصد رہی۔ ان کا ہر کام سلیقے سے ہوتا تھا۔ وہ عمل کے قائل تھے زندگی کی ہر گھڑی با مقصد گزاری جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ شرافت، ایمانداری، دیانت اور حق داروں کے حقوق کو پہچاننا ان کی زندگی کے اصول تھے۔ امیرانہ ٹھاٹھ رکھتے لیکن امیرانہ فضول شوق سے دور رہتے۔ آخری دم تک فعال رہے۔ رفاہی کام کیے، اپنے خرچ سے مساجد، مسافر خانے، کنوئیں اور پل تعمیر کروائے۔ عالموں ادیبوں اور نیک لوگوں کی سرپرستی کرتے، سکھر اور بکھر کے لواحقین

کا خیال اور تدارک کرتے، خیرات کرنا ان کا شعار تھا، پڑھنے سے شوق، شعر و سخن کا ذوق، طب کا علم، کتبات مع تاریخ اور تاریخی عبارت، عبرت انگیز اشعار سے مزین کر کے ضروری جگہوں اور شاہراہوں پر لگانا تاریخ کا ذوق سندھ کی تاریخ پر ایک اہم کتاب لکھنا، غرض اتنا جامع الصفات اور صاحب کمالات مغل امیر کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔

آپ کی عملی اور انتظامی صلاحیت اور انصاف پسندی کا اندازہ ان کے کھیتی باڑی کے کام اور کسانوں سے حسنِ سلوک سے ہوتا ہے۔ مغلیہ دور میں کسی کو مستقل جاگیر نہیں ملتی تھی۔ جہاں عہدہ دار مقرر ہوئے وہاں انھیں اخراجات کے لیے جاگیر دی جاتی تھی۔ جب تبادلہ ہوتا تو وہ جاگیران سے واپس لے لی جاتی اور انھیں دوسری جگہ دے دی جاتی تھی نتیجتاً اس عارضی قبضے کے سبب کوئی بھی جاگیر دارنہ تو زمین سے دل چسپی لیتا تھا اور نہ کسانوں سے کوئی مروت یا کوئی انسانی لین دین کا انسانی برتاؤ کرتا تھا۔ جتنا وقت وہ رہتا وہ ادھر اُدھر سے پیسہ لے کر کسی نہ کسی طریقے سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ زمینیں ویران، رعایا دل شکستہ اور کسان پریشان حال۔ آج یہاں تو کل وہاں خانہ بدوشی میں وقت گزارتے تھے سندھ میں تو اس طور پر عدل و انصاف کا نام و نشان نہ تھا۔ مظہر شاہجہانی میں جاگیر داروں کے برتاؤ، رقوم کی وصولی اور زمینوں کی حالت کے متعلق جو مثالیں دی گئی ہیں۔ اسے مُشتی از خروار سمجھنا چاہیے۔ سندھ میں مغلیہ دور کتنا تاریک اور کتنا غیر انسانی تھا اس کا اندازہ میرک یوسف کے اس فقرے سے کیا جاسکتا ہے۔

"کار این ملک به جائی رسیده که ملک نا پرسان
و ملک بیدادان و ملک بیکسان شده"۔ ۱۴۰؎

میر معصوم جب گجرات میں تھے تو انھیں کوئی جاگیر نہیں ملی تھی بلکہ نظام الدین احمد بخشی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ممکن ہے سرکاری طور پر انھیں بطور تنخواہ کچھ ملتا ہو لیکن وہ اس حد تک ناقابل بیان تھا کہ کسی مؤرخ نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ میر کو سب سے پہلے بکھر سرکار میں دو پرگنوں کے اندر اس وقت جاگیر ملی جب وہ ۹۹۹ھ میں لاہور سے خان خاناں کے ساتھ سندھ رخصت پر آئے۔ کاکڑی اور دربیلا دونوں پرگنے انھیں دیے گئے لیکن جاگیر داروں کے ظالمانہ سلوک کے سبب لوگ اپنے مکانات چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تھے کیوں کہ جاگیر دار اپنے حساب کتاب میں ان کے مویشی اور گھر کا سامان بھی نیلام کردیتا تھا کسان مقررہ شرح سے زیادہ وصولی ادا نہیں کرسکتاتھا۔ اس لئے اپنا سازو سامان نیلام کروا کر راتوں رات بھاگ جاتے اور اس طرح اپنی جان چھڑواتے یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں علاقے ویران ہو گئے۔ مظہر شاہجہانی کا مصنف مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ بکھر کا علاقہ سلطان محمود کی وفات کے بعد جب اکبر کے قبضے میں آیا اور عدل امروہی وہاں کا حاکم ہوا تو اس وقت ان کے دستور العمل کو پس پشت ڈال کر ان پرگنوں کے کسانوں سے پانچ من بطور محصول زیادہ وصول کرنا شروع کیا اور اس وصولی میں انھوں نے اتنی سختی کی کہ مگنیجا قبیلہ جو اس پرگنے میں زیادہ تعداد میں آباد تھے، بغاوت پر مجبور ہو گئے نوبت خون خرابے تک آئی اور علاقہ ویران نابود اور رعایا سے خالی ہو گیا۔ میرمعصوم کو جب یہ علاقے جاگیر میں ملے تو اس وقت پانچ سو بیگہ میں داخل تھا۔

"ذخیرة الخوانین" اور "مظہر شاہ جہانی" کے مصنفین نے میر کی زمینداری کے طور طریقے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، اصلاحات اور زراعت کو بام عروج پر پہنچانے کی تعریف خاص الفاظ میں کی ہے۔ مظہر شاہجہانی کے مصنف لکھتے ہیں۔

"...این هر دو پرگنه را در آبادانی و معموری به مرتبۂ کمال رسانیده بود و بیان خوش سلوکی وی به مردم رعیت ... گنجایش این رساله ندارد..."[۱۵]

مصنف لکھتے ہیں کہ میر نے اپنی جاگیر کو اتنا سر سبز و شاداب کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایسا اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اپنی جاگیر میں مروجہ دستور ترک کیا اور ضروری اصلاحات کیں۔ کسانوں کو ان کے حقوق دے کر خوش کیا۔ زمین کے کام کے علاوہ رعایا سے جو گردن توڑ بیگار لی جاتی تھی وہ معاف کردی۔اپنے خرچ سے پورے علاقے میں کینال water course کھدوا کر پانی کا انتظام کیا اگر پیداوار کم ہوتی تو کسانوں کے ساتھ رعایت کرتے یہاں تک کہ زمین کی پیداوار معاف کردیتے تھے۔(یعنی اپنا حصہ نہیں لیتے تھے)۔ کامگاروں کو حکم تھا کہ خراب فصل کی پیمائش نہ کریں اور نہ ہی وہ حصے خسرے میں داخل کریں۔

ایسا سلوک اور رعایت سندھ کے لوگوں نے پہلی بار دیکھی۔ ان کی معیشت سدھرنے لگی - کھیتی باڑی سے ان کا گذر بسر بہتر طریقے سے ہونے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی زمینوں سے دلچسپی بڑھی اور وہ دل و جان سے رات دن کام کرتے۔[۱۶] چنانچہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی غیر آباد نہ رہا۔ آبادی اس حد تک بڑھ گئی کہ شکار کے لیے جنگل کے کچھ حصے غیر آباد چھوڑنے کے لیے میر کو منتیں کرنی پڑیں۔ سارا علاقہ سر سبز و شاداب ہوگیا۔ مصنف نے دربیلا کے لوگوں سے خود سن کر لکھا ہے کہ میر کے قبضے میں آنے سے پہلے اس علاقے کی کیا حالت تھی۔ اور پھر کیا تبدیلی آئی۔ یا تو ۵۰۰ جریب زمین آباد ہوگئی۔ جو فصل خراب ہوئی غیر آباد رہی جو زمین معافی میں گئی وہ الگ تھی۔ یہ اسی زمین کا ذکر ہے جو میر صاحب کے نئے قانون کے مطابق خسرہ میں داخل ہوئی تھی۔

مغلیہ دور میں شرمناک حد تک سندھ میں کئے گئے مظالم کی داستان بیان کرتے ہوئے مصنف نے میر صاحب کے اس عمل اور اصلاحات کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے شاہ جہاں کے علم میں لانا چاہا کہ سندھ میں ان کے حاکم میر کے قائم کردہ طریقوں پر عمل پیرا ہوں تو حکومت چل سکے گی۔ ورنہ ممکن نہیں کہ سندھ آباد رہے یا پُر سکون طریقے سے ملک چل سکے۔ در حقیقت میر کا یہ طریقہ اس تاریک دور میں ایک کرامت معلوم ہوتا ہے۔ جابر اور ظالم حکم رانوں کی روش سے ہٹ کر اس دور میں زرعی اصلاحات کرنا، کسانوں کے بنیادی اور انسانی حقوق تسلیم کرنا، انھیں بیگار کے غلامانہ طریقے سے نجات دلوانا، حساب کتاب، بود نابود کا لحاظ رکھنا میر صاحب کا جرأتمندانہ قدم تھا۔ بلکہ سارا انتظام دستور العمل اور حکمرانی کے لیے ایک کھلا چیلنج تھا اور عوام کے لیے انقلابی قدم تھا۔

ان اسباب کو سامنے رکھتے ہوئے میر معصوم بکھری کو سندھ کا پہلا " هاری حقدار" (زمین کا مالک کسان) کہا جائے تو بیجانہ ہوگا۔

باغات کا شوق :

میر چوں کہ نہایت ہی لطیف ذوق کے مالک تھے اس لیے انھیں ہر اچھی چیز کا شغف تھا اور وہ ہر حسین چیز کے شوقین تھے۔ زراعت کے سلسلے میں باغبانی کا بھی انھیں ذوق تھا۔ پھلدار درخت، پھولوں کی کیاریاں اور سبزہ پسند کرتے تھے۔ بکھر، سکھر، روہڑی اور ببرلو، پہلے ہی سے باغات اور پھل کے لیے مشہور تھے۔ اروڑ کی زمین خربوزہ اور تربوز کی پیدوار کے لیے دور دراز ممالک میں مشہور تھی، میر ابو القاسم نمکین کی تربوزوں کی پیداوار اور وزن تاریخ میں معروف ہے وہ شاہی دربار

میں بطورتحفہ بھیجے جاتے تھے۔ ببرلو اور روہڑی کے باغات، چار باغ اور درختوں کے جھنڈ دلکش تھے کہ ہمایوں جب ہندوستان سے فرار ہوا تو یہیں آکر مقیم ہوا۔

میر معصوم کو باغات کا شوق تھا۔ ملازمت کی مصروفیت اور ہمہ وقت سفر میں مشغول ہونے کے سبب اگرچہ انھیں وقت نہ ملا کہ دل جمعی سے چند سال مسلسل بکھر میں رہ کر اپنی دلی خواہشات کو عملی جامہ پہنا سکیں پھر بھی مجموعی طور پر اپنی چار پانچ سال کی اقامت میں انھوں نے چند باغات بکھر اور سکھر میں خریدے اور لگوائے۔ مثلاً

-- اپنی حویلی کے قریب ایک خوبصورت مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ نہایت شاندار باغ لگوایا۔ جس کی اراضی بیس بیگھ تھی جس میں پھولوں اور پودوں کے علاوہ پھلدار درخت بھی تھے۔ باغ اتنا خوبصورت تھا کہ لوگوں کی تفریح گاہ بن گیا۔

-- اروڑ کی طرف اپنی زمین میں خربوزے اور تربوز کاشت کرواتے، اپنے استعمال اور بیچنے کے لیے۔ نیز تحفے تحائف کے لیے وہاں کے تربوز مشہور تھے۔

-- منزل گاہ والی اراضی میں مسجد اور نشست گاہ کے ساتھ ایک خوبصورت باغ لگوایا۔ باغ اس دور کا لازمہ تھا۔ دریا کی دوسری طرف روہڑی کے باغات، اور درختوں کے جھنڈ تھے اور اس طرف میر کا باغ اور دوسروں کے باغات تھے۔

-- قندھار میں جب تعینات ۱۷ ہوئے تو وہاں بھی انگوروں کا باغ خریدا۔

بالائی سندھ کے اس علاقے میں آم اور کھجور بہت مشہور

تھے۔ آج تک وہیں باغات ہیں۔ میر نے ظاہر ہے اپنے باغات میں بہترین قسم کے درخت لگائے ہوں گے، لیمو، انگور، انجیر، شہتوت، فالسے اور مختلف اقسام کے بیر۔ کوئٹہ اور قندھار یا ہندوستان سے اپنی پسند کے دوسرے پھل بھی جو اس علاقے میں ہو سکتے تھے، وہ لگوائے ہوں گے۔ اس زمانے میں سندھ کے انار مشہور تھے۔ پھولوں میں گلاب کی مختلف قسم، موتیا، سنبل، ریحان، سورج مکھی، چمپا، اور رات کی رانی عام تھے۔ قانع نے ٹھٹھے کے باغات کا ذکر کرتے ہوئے مکلی نامے میں پھولوں کے نام گنوائے ہیں، [۱۸] ظاہر ہے کہ مغلیہ دور میں سندھ کے باغات میں یہ پھول اور پودے تھے تو بکھر میں، میر نے کیوں نہیں لگوائے ہونگے۔

میر نے نقدی، عمارات اور باغات کی صورت میں اتنا اثاثہ چھوڑا تھا۔ ساری دولت لٹانے کے باوجود امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے کتنے باغ ہوں گے اور ان کی کتنی پیداوار ہو گی۔

ثروت اور دولتمندی:

مذکورہ بالا صورتحال کے سبب میر کی مالی حالت غیر معمولی طور پر بہتر تھی ،مال و دولت کے لحاظ سے اکبری دور کے چوٹی کے امراء میں سے تھے۔ شاہانہ طور طریقے ، رہن سہن ، سخاوت، سفر و حضر کے اخراجات، اپنوں اور بیگانوں کو پالنا اورانھیں وظیفے دینا، رفاہی کام اور یاد گار تعمیر کروانا، کتبے کندہ کروانا اور اس کام کے کاریگروں کو سفر اور حضر میں اپنے ساتھ رکھنے کے اخراجات ، عالموں اور ادیبوں کی سرپرستی کرنے اور انھیں معاش فراہم کرنے کے باوجود میر کے پاس کافی نقدی تھی۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف نے لکھا ہے کہ

انہوں نے تیس، چالیس لاکھ روپے چھوڑے۔ ۱۹۔ اس دور کے تیس چالیس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ وہ بھی ایسی سخاوت اور شاہ خرچی کے بعد بڑی بات ہے۔

یہ تو تھی نقدی کی حالت، میر نے مختلف قسم کی جائیداد چھوڑی یا ملکیت بنائی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میر بزرگ نے لاکھوں روپے لٹا دیے پھر بھی ملکیت ختم نہ ہوئی۔ اور آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان خاندان کے کثیرالعیال سادات معیشت کے لحاظ سے نہایت آبرو مندانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حواله جات

۱ـ طبقات: ... جوانیست به صلاح و تقویٰ آراسته...
(۲: ۵۰۰)

۲ـ تذکرة الشعراء، ص: ۱۵

۳ـ ...با اخلاق درویشانه متخلف و به فضائل و کمالات انسانی متصف و به دیانت و امانت و شجاعت و سخاوت مشهور ...به صلاح و تقویٰ و ورد و نماز و تلاوت مقید است...'' (بدایونی ۳: ۳٦۴)

۴ـ مظهر، ص: ۱۱ـ۱۲

۵ـ ...اوصاف حمیده و اخلاق ستوده آن برگزیدۂ درگاه الاهی تا کجا نویسد. مجملاً در چنین دولت عظمیٰ مردم محل ایشان... درخانۂ هم شهریان درشادی و غمی می رفتند. الحال هم قدم خودرا دریغ نمی داشتند. میر خود هم می رفت وعیب و عارنمی کرد.

وچون به هند تشریف می برد از آنجا مواهبات (مکاتبات) و سوغات فراخور حالت هر کدامی می فرستاد، حتی مردم اجلاف، که درشکار همراه میر در آن وقت می رفتند، اسامی آنها در کاغذ مثل جدا نوشته، در متن احوال را می نوشت، وسوغات بسیار می فرستاد.

وچون به شهر خود تشریف می آوردند سالیانه و فصلانه و ماهیانه و جمعگی وروزمره با اکابر واصاغر شهر مقرر کرده بود وجویای نام نیك بود. ودر پرستش حق بی همتا، نماز تهجد از ایشان قضا نشده، وسخاوت به افراط می نمود.
(۱: ۲۰۲- ۲۰۳)

۶۔ ماثر، ۳: ۳۲۸

۷۔ در آخر عمر که امین الملك دیار خود شده آمده خانه های همسایه را گرفته بدین سبب رنجانیده. (۱: ۲۰۴)

۸۔ "...آن حسن سلوك که با خلق خصوصاً با همشهریان خود داشت فتوری دران راه یافت پاره در مزاج شریف ایشان انحراف روی داد..." (۱:۲۰۵)

۹۔ با این همه صفات حسنه صفت ذمیمه داشت، اولاً چغل دوست بود، دوم شدید العداوت. (۱: ۲۰۵)

۱۰۔ "... و آباد ان کار به نوعی بوده که به رعایامنت می کرد که تمام جنگل جاگیر مارا پاك نسازند برای زراعتی. به جهت شکار چیزی بگذا رند..." (۱:۲۰۵) "... به غاویت شکار دوست بود، و پیاده چند کروه به شکار می رفت..." (۱:۲۰۱)

۱۱۔ "...حتیٰ مردم اجلاف که در شکار همراه میر در آن وقت می رفتند، اسامی آنها در کاغذ مثل چند نوشته درمتن احوال را می نوشت و سوغات بسیار می فرستاد ..."(۱:۲۰۳)

۱۲۔ مآثر، ۳: ۳۲۱ مولع۔ حریص، یعنی انہیں شکار کی حرص تھی۔

۱۳۔ "... جنگل درمیان این پرگنه ها نمی رسید و همان زمینها مزروع و آبادان شده بود، چنانکه جای شکار نداشت، و میر معصوم را ذوق شکار گرزو تیر بسیار بود، به واسطه شکار از پرگنه های خود بیرون می رفت تاشکار می یافت..."(۱۳)

۱۴۔ ۱ ص: ۱۷۳

۱۵۔ ص: ۱۲

۱۶۔ "...آن عمل بدین طریق بود که عاملان خودرا قدغن کرده بود که هر دو سرطناب را وقت ضبط کردن درست بدهند و در سرقطعه، بود نابود و تخم زده راملاحظه نمایند و بودرا داخل

خسرہ کنند و نابود را ہر گز داخل نکنند . مثلا: ایك قریہ ھزار جریب زراعت داشت و بہ قضای الاھی نہ صد و نودو نہ جریب نابود شدویك جریب بود- ھمان یك جریب را داخل خسرہ می کردند- وآن نھصد و نو دو نہ جریب نا بود را مطلقاً داخل نمی کردند...“ (ص: ۱۲- ۱۳)

۱۷۔ یعنی فوجی خدمت پر مقرر۔

۱۸۔ مکلی نامہ میں مختلف نام لیے گئے ہیں اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مواد بھی سندھ کے باغات کے سلسلے میں دیکھنا چاہیے:

۱۹۔ مجمع جہانگیر شاھی: جہانگیر کے دور میں ٹھٹھے کے باغوں کا ذکر موجود ہے۔

۲۰۔ بحر الاسرار: از محمودبن امیر ولی بخاری: اس میں بکھر کے باغات اور پھلوں کا ذکر ہے۔ مصنف کا تعلق شاہجہاں کے دور سے ہے۔

I۔ The Evolution of Gardens in Iran and Sindh the Charbagh, By Dr. Ansar Zahid Khan.

II۔ The Gardens of Mughal India By Sylvia Crowe, London 1972.

III۔ Ain-e-Akbari, By H. Blochmann

اس میں بکھر اور ٹھٹھہ کے پھل دار پودوں کی فہرست ہے۔

IV۔ نامۂ نعز: باغ علی خائف نے اس میں کلھوڑوں کے دور کے پھول اور پھل کا ذکر کیا ہے۔

V۔ میر در زمانہ دولت خود صاحب سی و چھل لك روپیہ گردید. (۱: ۲۰۲)

باب ۔۲۳

علم و فضل اور تصانیف

میر معصوم کی ہمہ گیر شخصیت، شوق، مختلف مصروفیات اور علم و فضل میں آپ کے مرتبے کے تمام مؤرخ، تذکرہ نگار اور سوانح نگار معترف ہیں۔ میر معصوم بیك وقت مؤرخ، شاعر، نثر نگار، خطاط، طبیب، سیاست دان اور مغل دور کے طرز حکمرانی کے ماہر اور اپنے وقت کے کامیاب ترین امیر تھے۔ اس قدر مختلف النوع شخصیت کا حامل کوئی اور امیر نہ تھا۔نہ اس طرح کی جامع کمالات شخصیت کسی اور امیر میں دیکھی گئی۔ اس باب میں آ پ کی مختلف صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن سے ہم ان کی رنگارنگ شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔

تاریخی ذوق اور طبقات اکبری:

طبقات اکبری، مغل دور میں لکھی جانے والی پہلی تاریخ ہے جس میں پورے ہندوستان کی مسلم حکومتوں اور ان کے ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بعد کے مؤرخین اسے مستند سمجھتے ہوئے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

تمام مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سلسلے میں، خواجہ نظام الدین احمد، میر معصوم بکھری کے بڑے معاون اور مدد گار رہے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد کو ان پر بہت اعتبار و اعتماد تھا۔ یہ تاریخ، گجرات والے زمانے میں لکھی گئی جب کہ خواجہ بخشی اور میر معصوم آپ کے مصاحب تھے یہ کتاب

اس قدر مستند اور جامع ہے کہ بعد کے مصنفوں نے نہ صرف آنکھیں بند کر کے اسے اپنا ماخذ بنایا ہے۔ بلکہ اپنی کتابوں کی ترتیب بھی اس طرح قائم رکھی ہے جیسی کہ "طبقات اکبری" کی ہے۔ [۱]

ان کی تاریخ دانی اور اصابت رائے کا اندازہ ماثر الامراء کے مصنف کے درج ذیل بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ :

"مصنف (خواجہ) نے واقعات کی صحت، باریک بینی، جزئیات اور معلومات کو یکجا کر کے جمع کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ میر معصوم جیسے اہل کمال اس تالیف میں ان کے شریک تھے اسی لیے کتاب کا اعتبار اور معیار بڑھ گیا"۔ [۲]

مآثر الامرا کا مأخذ شیخ فرید بکھری کی کتاب ہے۔ اس میں بھی ایسی ہی باتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

"طبقات اکبری لکھتے وقت میر معصوم ۔ جنھیں تاریخ دانی میں بڑا عبور تھا۔ مسلسل ان کی صحبت میں تھے۔" [۳]

خواجہ نظام الدین نے اگرچہ کوئی اعتراف تو نہیں کیا ہے لیکن سالوں تک میر کے "ھم دم اور مصاحب رہنے کو قبول کیا ہے۔" [۴]

درحقیقت گجرات میں نظام الدین کے ساتھ ان کے رہنے کی بڑی وجہ یہی دیکھنے میں آتی ہے کہ خواجہ صاحب طبقات لکھنے میں ان سے مدد لے رہے تھے میر صاحب سندھ کی تاریخ کے چشم دید گواہ بھی تھے۔

ادبی ذوق اور شعر گوئی:

میر صاحب کے ادبی ذوق و شوق اور شعرو سخن سے دلچسپی اور علمی شغف کی بھی ہر تذکرہ نویس نے تعریف کی ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی جیسا سخت مزاج شخص نہ صرف

آپ کا دوست تھا بلکہ آپ کی علمی صلاحیتوں اور ادبی خوبیوں کا معترف بھی تھا۔ میر صاحب کا احوال لکھتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"میر در طالب علمی خیلی کو شید و سلیقہ درست
در شعرو معما و طبعی بلند وفطرتی عالی دارد۔"

بلند طبعی اور عالی فطرتی کا پروانہ ملا عبدالقادر سے ملنا، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ جو شخص فیضی جیسے شاعروں اور ملا احمد ٹھٹھوی جیسے مؤرخ یا اسی قسم کے اپنے دوسرے معاصرین کی طرح طرح کی عیب جوئی کرتا ہے۔وہ میر کے علم، طلب علم، شعر گوئی، طبیعت کی بلندی اور اعلیٰ فطرت کو اس طرح بلا چون و چرا قبول کرلے، یہ میر کے عظیم انسان ہونے کا بڑا ثبوت ہے۔

فرید بکھری نے میر کی خوش نویسی،ذوق عمارت سازی اور آپ کی شاعرانہ متانت کی تعریف کی ہے۔[۵]

تقی اوحدی جو مشہور شاعر اور تذکرہ نویس ہے۔ اس کی اصفہان میں میر صاحب کے ساتھ صحبتیں/ مجلسیں رہیں۔ اس نے ان کے بارے میں اپنے اس تاثر کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"میرزا احمد نیشاپوری (وزیر شاہ عباس) کے حکم پر میری میر صاحب سے شعر کی صحبت رہی واقعی انھیں شعر میں بڑی قدرت اور عظیم دسترس حاصل تھی"۔[٦]

بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کی ان صفات کی تعریف معاصر تحریروں کے تتبع میں کی ہیں۔ گل رعنا کے مصنف نے تقی اوحدی کے حوالے میں سے اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کے کلام میں رطب و یابس بھی بہت زیادہ ہے۔[۷] خان آرزو نے یہی عبارت دہرائی ہے۔[۸]

شعرو سخن کے سلسلے میں میر صاحب کی ہر کتاب کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، اسے ذیل میں علیحدہ

علیحدہ بیان کیا جاتا ہے سب سے پہلے ان کی مثنویات جن کے متعلق یہ معلومات مہیا ہوسکی ہیں۔

(۱-۵) پنج گنج:

شیخ نظامی گنجوی کی پنج گنج کے تتبع میں کتنے ہی شاعروں نے پانچ مثنویاں لکھیں ان شاعروں کا علیحدہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ ۹۔ ان تتبع کرنے والے شعراء کی صف میں میر معصوم کا نام بھی شامل ہے۔ آپ نے پانچ مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں: لیکن افسوس کہ آج تک وہ دستیاب نہ ہوسکی ہیں۔ مثنویوں کے نام اور ان کے کچھ شعر تذکروں میں اور خود میر کے مختلف کتبوں میں ملتے ہیں۔

سب سے پہلے طبقات اکبری میں جو ۱۰۰۱ھ میں تالیف ہوئی، اس میں دیوان اور ان کی ایک مثنوی کا حوالہ ہے، اس کے بعد بدایونی میں بھی ایک دیوان اور ایک مثنوی کا ذکر ملتا ہے۔ مثنوی کے متعلق صرف اتنا اضافہ کیا گیا ہے کہ "یوسف زلیخا" کے بحر میں کہی ہے۔

ذخیرۃ الخوانین (۱۰۶۰ھ):

ذخیرۃ الخوانین میں خمسہ کی ساری مثنویوں کے نام نہیں دیے گئے ہیں، صرف ایک مثنوی " معدن الافکار" کا نام موجود ہے ۔ جو مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی گئی۔ مقالات الشعراء میں طب نامی، "تاریخ سند"، اور ایک مثنوی" نازو نیاز" (سسی پُنہوں کی داستان) کا حوالہ ہے۔تحفۃ الکرام میں میر قانع نے دیوان کا اضافہ کیا ہے۔ گویا ۱۱۶۹ھ تک دیوان کا علم نہیں تھا اور ۱۱۸۰ھ میں تحفۃ الکرام لکھتے وقت انھیں دیوان کے بارے میں معلوم ہوا۔ مآثر الامراء جس میں بھی ان ہی ساری کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، آخری تذکرہ ہے۔

"دیوان نامی، مثنوی معدن الافکار درجواب مخزن

الاسرار، تاریخ سند و مختصری در طب کہ بہ مفردات معصومی موسوم است، تالیف اوست۔"[۱۰]

ان سب مصنفین نے خمسہ کی مکمل تفصیل نہیں دی ہے انھیں صرف دو مثنویوں "ناز و نیاز" اور "معدن الافکار" کے نام کا علم تھا۔

سب سے پہلے خمسہ کی مذکورہ تفصیل تقی کاشی نے دی ہے اور ان کے شعروں کی مجموعی تعداد کا اندازہ بھی تقریباً بارہ ہزار لگایا "معدن الافکار"، "رای و صورت" اور "حسن و ناز"۔[۱۱] کا نام لکھتے ہوئے انھوں نے وضاحت کی ہے کہ "رای و صورت"، لیلیٰ مجنوں کے بحر میں ہے اور "حسن و ناز" کا بحر یوسف و زلیخا ہے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"درین دو کتاب معانی دقیقہ و خیالات لطیفہ انگیختہ اند، چنانچہ سخن شناسان ممالک ہندوستان و نکتہ سنجان دیار خراسان متفق اند کہ اکثر مباحث این دو کتاب را بھتر و بلند تر از مولانا جامی گفتہ۔"

دونوں مثنویوں میں گویا میر معصوم ہر لحاظ سے مولانا جامی سے سبقت لے گئے ہیں۔[۱۲] تقی کاشی نے یہ تعریف محض دوست نوازی اور میر معصوم کے اس حسن سلوک سے کاشان میں دوران قیام انھوں نے ان کے ساتھ روا رکھنے کی وجہ سے نہیں کی یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ میر معصوم کا مثنوی میں کس قدر بلند مقام تھا۔

والہ داغستانی نے خمسہ کا ذکر کیا ہے لیکن ایک ہی جملے میں بات ختم کردی ہے کہتے ہیں: "ولی اشعار بسیار گفتہ و تتبع خمسہ نیز کردہ است۔" خمسہ کی ساری مثنویوں کا نام کے ساتھ ذکر سب سے پہلے اصفہان کے مسجد علی والے (۱۰۱۳ھ) کتبے میں آیا ہے۔ پھر ناگور میں شیخ حمیدالدین کی درگاہ پرلگے ہوئے کتبے (۱۰۱۳ھ) میں اس کا ذکر ہے۔ پہلا کتبہ میر صاحب کا اپنا نصب کیا ہوا ہے جبکہ دوسرا کتبہ ان

کے بیٹے میر بزرگ کا نصب کردہ ہے۔ ان میں مثنویوں کے نام کے ساتھ یہ عبارت بھی ہے جو نہایت اہم ہے۔

"......واین چند بیت از خمسۂ ایشان کہ درین ولا بہ اتمام رسانیدہ بودند تحریر نمودہ شد سن ۱۰۱۳ھ۔"

ان ہی کتبوں میں مثنویوں کے نام اس طرح آئے ہیں:

۱) معدن الافکار

۲) حسن و ناز

۳) اکبر نامہ

۴) رای و صورت

۵) خمسہ متحیرہ

مسجد علی والے کتبے میں میر نے واضح طور پر لکھا ہے کہ: اس طرف آتے ہوئے یہ راستے میں مثنویاں مکمل ہوئیں'۔[۱۳]

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنویاں ۱۰۱۳ھ تک مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ ایران کے سفر میں آپ نے انھیں مکمل کرکے ان کے نام کتبے میں رقم کردیے اس سے پہلے کی تاریخی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبقات (۱۰۰۱ھ) اور بدایونی (۱۰۰۴ھ) کی تصنیف تک ایک مثنوی تصنیف ہوئی تھی جو یوسف و زلیخا کے بحر میں تھی۔ جس کا نام حسن و ناز تھا۔ اس کے بعد ۱۰۱۳ھ تک، یعنی نو سالوں میں باقی چار مثنویاں مکمل ہوئیں میر صاحب نے ایران کے طویل سفر کی فرصت کو غنیمت جان کر خود کو اس کام میں صرف کیا اور واقعی سفر کی کوفت کو ختم کرنے کے لیے اس سے زیادہ دلچسپ اور کون سا مشغلہ ہوسکتا تھا۔

مثنویوں کی ترتیب اس طرح بتلائی گئی ہے۔

۱) معدن الافکار	بجواب	مخزن الاسرار
۲) حسن و ناز[۱۴]	بجواب	یوسف وزلیخا
۳) رای و صورت[۱۵]	بجواب	لیلی و مجنون

۴) خمسہ متحیرہ بجواب ہفت پیکر
۵) اکبر نامہ بجواب اسکندر نامہ ۱۶ؔ

افسوس کہ یہ خمسہ یا ان میں سے کوئی مثنوی کسی بھی کتب خانے میں موجود نہیں ہے "حیات معصوم میں پیر علی محمد راشدی نے لکھا ہے کہ انھوں نے "حسن و ناز" کا ایک نسخہ پرانے سکھر میں محمد علی شاہ کے پاس دیکھا ہے۔ پروفیسر عبدالحی حبیبی افغانی نے راقم کو اس مثنوی کے چند شعر دیے جو مقالات میں شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے صاحب مثنوی کا ایک ناقص نسخہ مرحوم ہاشم شایق آفندی کے ہاں کابل میں دیکھا تھا۔ جس میں بقول ان کے چار ہزار بیت تھے۔ ۴ؔ حبیبی صاحب کے دیئے ہوئے بیت ذیل میں درج کیے جاتے ہیں تاکہ موضوع کی مناسبت سے اس کتاب میں محفوظ ہوجائیں:

خدا وندا دلی ده شعله افروز
درو جانی، زبرق عشق در سوز
بدل ده شعلۂ آتش گدازم
بریزان از مژه اشلکِ نیازم
به خاشاکی تنم در آتش انداز
که دوزخ گردد از وی شعله پرواز
درونم را چنان کن آتش افروز
که دوزخ را ازان آتش فتد سوز
چنان کن موج زن اشکم سوی اوج
که گردون چون خسی باشد بران موج
چنان ده در درون سینه سوزم
که در وی خرمن هستی بسوزم
چنان زان آتشم دل زنده گردان
که از غیرت بسوزد آب حیوان
دلی ده سر بسر شایستۂ درد
درونم چون جراحت خستۂ درد

دلی کا و زخم از مرهم نداند
متاع خوشدلی از غم نداند
دلی خواهم زدرد آزرده و ریش
که از دردش بدرد آید سرنیش
بت فکرم که رخ بنمود از غیب
مبرا داریش از تهمت عیب
جمالش را بهار تازگی ده
چوحسن او بلند آوازگی ده
ازین نامه که نامش جاو دان باد
مرا زو نام و نامم رانشان باد
لباس نیکنامی در برش کن
چونامی درجهان نام آورش کن

رسید اینك بهار عالم افروز
ز گلها شد چمن، روشن تراز روز
هوا شسته ز شبنم روی گلزار
چمن راغازه کرده رنگ و رخسار

نسیم صبحدم از جنبشِ خاص
زسرتا پای گلبن کرده رقاص
زفیضِ صبحدم کا فلاك می ریخت
همه لؤلؤ به زیر خاك می ریخت
نسیم صبحدم شد فیض گستر
هوا افشاند هر سولؤلویِ تر
بر آمد بر هوا ابر طربناك
زطنازی کشیده سر برافلاك
(الخ......)

٦) طب یا مفردات نامی:

ایسا معلوم ہوتا ہے میر معصوم کوئی مشہور طبیب، پیشہ ور حکیم یا اس فن میں کوئی مہارت یا مقام نہیں رکھتے تھے۔ قدیم دستور کے مطابق، طب نصاب کا ایک مضمون تھا جسے تقریباً ہر طالب علم پڑھتا تھا وہ اسے بطور پیشہ اختیار نہیں کرتا تھا لیکن کم از کم اتنا علم ضرور رکھتا تھا کہ اپنے گھر یا حلقے کے اندر تھوڑا بہت علاج معالجہ کرسکے۔ مشرق میں آخری دور تک یہ دستور رہا کہ ہر وہ عالم جس کو "ھمہ دانی" کا دعوی ہوتا وہ معاصرین میں سُرخ رو ہونے کے لیے ہر فن میں کچھ نہ کچھ لازماً لکھ کر اپنی شہرت بڑھانے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ خاص طور پر طب میں جو کتب یا بیاض دیکھنے میں آتے ہیں وہ عام طور پر اسی بیان کردہ زمرے میں آتے ہیں۔ پردہ داری اور خاندانی روایات کے مد نظر ہر پڑھا لکھا طب سے تھوڑا بہت ضرور واقف ہوتا تھا تاکہ گھریلو پردہ داری بر قرار رہے۔ خاندانی طور پر بھی پشت در پشت کچھ مجرب نسخے وراثت میں آتے رہتے تھے جو عموماً بیاض کی صورت میں ضبط تحریر میں لائے جاتے۔میر معصوم خاندانی آدمی تھے اور پردہ کا رواج تھا نیز آپ کا خاندان خراسان سے آیا تھا۔ جو مختلف اسلامی فنون کا مرکز سمجھا جاتا تھا اسی لیے خاندان کے افراد کو دوسرے علوم کے ساتھ طب میں بھی درک ہوتا تھا اور اسی بنا پر اپنے خاندانی نسخوں کو مفردات یا مجربات کے نام سے قلمبند کیا۔ یہ مختصر کتاب جس کو راقم الحروف نے کسی زمانے میں دیکھی تھی مفردات معصومی کے نام سے معروف ہے۔ جیسا کہ مآثر الامراء کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔[۱۸] کچھ مصنفین نے غلط فہمی کی بناء پر ایک ہی کتاب کو دو مختلف کتابیں سمجھ کر علیحدہ علیحدہ نام دیے ہیں۔ جس طرح کہ برٹش میوزیم کے فہرست نگار اور ڈاکٹر داؤد پوتہ

مرحوم نے طب نامی اور مفردات معصومی علیحدہ نام دیے ہیں-۱۹ا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ۱۰۰۴ھ کے بعد کا مرتب کردہ ہے۔ کیوں کہ طبقات کے مصنف یا ملا بدایونی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

کتاب میں امراض کے تحت ان مفرد ادویات کے نام دیے گئے ہیں جو اس بیماری کے لیے مفید اور مجرب تھیں نیز ان کے استعمال کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے نسخے نجی اور قومی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مثلاً

۱) کتب خانہ آصفیہ: دو نسخے "رسالہ مفردات میر معصوم" کے نام سے نمبر ۳۹۲ اور ۳۶۹۔

۲) خدا بخش لائبریری پٹنہ: ایک نسخہ ۲۴ اوراق، ہر ورق میں ۲۳ سطریں، سن کتابت ۱۱۱۰ھ، خط نستعلیق

۳) بنگال ایشیاٹک سوسائٹی: ایک نسخہ نمبر ۱۵۵۰ (G. ۲۶) ۲۵ ابواب کتابت ۱۱۸۲ھ

۴) سندھ میں متعدد نجی کتب خانوں میں اس کے نسخے ملتے ہیں۔ ہم نے ۱۹۳۰ھ میں معصومی خاندان اور روہڑی کے قدیم گھرانوں میں یہ نسخے دیکھے۔سننے میں آیا ہے کہ یہاں نور محمد بھٹی (حیدر آباد) کے یہاں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔

۷) تاریخ سندھ:

تاریخ سندھ جو کہ عام طور پر "تاریخ معصومی" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ میر معصوم کے تاریخی ذوق کے پہلے گواہ خواجہ نظام الدین احمد اور ان کی تصنیف طبقات اکبری ہے۔ تاریخ معصومی، سندھ کی تاریخ پر ان کا اہم شاہکار ہے چچ نامہ کے بعد یہ سندھ کی دوسری تاریخ ہے۔ ان دونوں کتابوں

کے درمیان صدیوں کا وقفہ ہے۔ جس میں دوسری کوئی کتاب نہیں لکھی گئی چنانچہ تاریخی کڑیاں گم اور ناپید ہیں۔ میر معصوم نے اسے محسوس کیا اور ہمارا خیال ہے کہ کتاب لکھنے کی ضرورت کا احساس انھیں گجرات میں ہوا۔ جس وقت طبقات لکھی جارہی تھی اور سندھ کی تاریخ پر مواد کا فقدان نظر آیا۔ میر نے یقیناً اسی زمانے سے اپنی تاریخ مرتب کرنا شروع کی۔

جو ماخذ خواجہ نظام الدین نے استعمال کیے، میر نے بھی ان ہی میں سے حسبِ ضرورت مواد لیا۔ جیسا کہ انھوں نے سندھ کے سومروں کا احوال "تاریخ بہادر شاہی" سے کیا۔ انھوں نے تین کتابوں کے نام لیے ہیں۔

۱) تاریخ مراۃ الجنان، ص ۵
۲) تاریخ گزیدہ، ص ۵
۳) تاریخ چچ نامہ، ص ۴۔۴

"حبیب السیر" ان کے پیش نظر رہی ہے جس کا انھوں نے حوالہ نہیں دیا۔ لیکن کئی عبارتیں لفظ بہ لفظ نقل شدہ ہیں کچھ واقعات کے وہ خود چشم دید گواہ تھے اس لیے وہ حصہ اہم ہے۔ اگر چہ آپ نے نہایت اختصار سے کام لے کر اپنی تحریر کو سرسری کردیا ہے اور اس لیے پڑھنے والے کو تسلی نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کا خیال ہے کہ تاریخ معصومی کے ذریعے میر صاحب کی تاریخ دانی کا قائل نہیں ہوا جاسکتا۔ ڈاکٹر مرحوم نے چند مثالیں دیکر بتایا ہے کہ میر صاحب نے کسی طرح بھی تحقیق سے کام نہیں لیا۔ ان کا خیال ہے کہ عمر رسیدہ ہوچکے تھے ان کی قوتیں مضمحل، حافظہ کمزور ہو گیا تھا اس لیے تحقیق کے لیے میر صاحب سے ضروری محنت اور مشقت نہیں ہوسکی ہے۔ ۲۰

یہ حقیقت ہے کہ مصنف نے مطلوبہ ضروریات کو پورا نہیں کیا ہے لیکن یہ خیال پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ تحقیق

کا معیار جو آج سمجھا جاتا ہے وہ گذشتہ دور میں نہیں تھا۔ اس زمانے کا انداز زیادہ تر نقل نویسی تھا۔اور جو کچھ چشم دید احوال دیا جاتا تھا اس میں تاریخوں میں فرو گذاشت اور غلطی کی جاتی تھی یہ انداز تقریباً ہر ایک تاریخی کتاب میں نظر آئے گا، اسی لیے آج کے دور میں محققین کے لیے واقعات کی چھان بین ایک مشکل کام بن گیا ہے اور تاریخی مسائل کی گتھیاں سلجھ نہیں سکی ہیں۔

اس مروجہ کمزوری کے باوجود میر معصوم نے تاریخ لکھ کر سندھ پر عظیم احسان کیا ہے۔ ورنہ کئی صدیاں اندھیرے میں رہ جاتیں۔

ارغونوں اور ترخانوں یا ان کے اپنے زمانے کے مشہور لوگوں کے تذکرے، یہ ایسے ابواب ہیں جن کے بارے میں میر اگر نہ لکھتے تو ہم کس طرح ان تک پہنچتے۔

حقیقت میں سندھ کی تاریخ کے بانی تین بزرگ ہیں جن کی اہمیت باوجود تاریخی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے اپنی جگہ پر مسلّم اور اٹل ہے۔

۱) علی بن حامد کوفی، چچ نامہ کے مصنف
۲) میر معصوم بکھری، صاحب تاریخ معصومی
۳) میر علی شیر قانع تتوی، تحفۃ الکرام اور مقالات الشعراء کے مؤلف

یہ بنیادی کتابیں ہیں باقی کتابیں جو سندھ پر لکھی گئیں وہ سب ذیلی ہیں۔ ''تاریخ معصومی'' در حقیقت ایک خاص نقطہ نگاہ اور سبب کی بناء پر لکھی گئی۔ یعنی میر صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے میر بزرگ کی ذہنی تربیت کی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی۔ مقدمے میں لکھتے ہیں:

''......از مطالعه احوال تربیت یا فتگان مهدا مکان و
گذشتگان بنی نوع انسان به لوازم خیرو شر و مواد

نفع و ضرر وقوف و حاصل نموده، به حسن سیرت
هوشمندان آگاه و نیکو صفتان بارگاه اهتدا یا بد، وبه
سنن سنیۂ و اخلاق رضیۂ آن زمرۂ علیه اقتدا کرده از
شیوۂ نا پسندیده اهل نخوت و غفلت و خصائل
ایشان و شیمۂ ردیۂ ارباب بطالت عطلت اجتناب و
احتراز نماید." ۲۱

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ تاریخ لکھنے کا ارادہ یا ابتداء میر صاحب نے گجرات کے قیام کے دوران کیا۔ اس قسم کی علمی اور تاریخی ذوق کی فضا جو انھیں گجرات میں ملی انھیں کہیں نصیب نہ ہوئی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد میر صاحب کو سکون سے مسلسل رہنے کا موقع فراہم نہیں ہوسکا۔ ابتداء گجرات میں ہوئی۔ کچھ بکھر میں لکھی گئی۔ قندھار کے قیام کے دوران بھی لکھنے میں مصروف رہے۔ اور آخر ۱۰۰۹ھ میں کتاب مکمل ہوئی۔ اس سال کا ذکر دو مرتبہ آیا ہے ایک جگہ بکھر کے قلعے کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب لکھتے ہیں کہ: "...... تا این زمان کہ سنۂ تسع والف است همان قلع موجود است ."۲۲ اور دوسری جگہ کتاب کا اختتام میرزا جانی کے ذکر پر کیا ہے یعنی ۲۷ رجب ۱۰۰۹ھ۔ ۲۳

کتاب کی عبارت نہایت رواں اور سادہ ہے لفظی آرائش اور واقعاتی سنگھار جو کئی مورخوں کا خاصہ رہا ہے میر صاحب کے یہاں نظر نہیں آتا یہ کتاب در حقیقت فارسی نثرنگاری کا شاندار نمونہ ہے۔ بعد کے کئی مورخوں کا مأخذ رہی ہے۔ مآثر رحیمی کے مصنف نے ارغونوں اور ترخانوں کے دور سے متعلق تمام انحصار تاریخ معصومی پر ہی کیا ہے بلکہ لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے۔

تاریخ معصومی کے خطی نسخے دنیا کے بہت سے

کتب خانوں میں موجود ہیں چند خاص نسخوں کا ذکر درج ذیل ہے:

۱) پنجاب یونیورسٹی: یہاں ۱۵۶ نمبر پر تاریخ کا قدیم ترین نسخہ ہے۔ حبیب اللہ کؤریجہ ڈیپارجا والے نے ۲۶ جمادی الاول ۱۰۱۷ھ میں لکھ کر مکمل کیا ۱۰۹۶ھ میں یہ نسخہ میر اسد اللہ شاہ معصومی کی ملکیت میں تھا۔ مصنف کی وفات کے دوسال بعد دوبارہ سال تالیف کے ۸ برس بعد لکھا گیا۔

دوسرا نسخہ ۱۹ شعبان ۱۱۵۹ھ کا کتابت شدہ بھی وہاں موجودہے۔ جس کا نمبر ۱۵۷ ہے۔

۲) ڈاکٹر داؤد پوتہ: دوسرا قدیم نسخہ ڈاکٹر مرحوم نے کیمبرج سے خریدا تھا۔ جو محمد رضا بن عبدالواسع بن داروغہ کہر کا کتابت شدہ ہے۔ کتابت کاسال ۱۰۴۰ھ ہے اسی نسخے کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مطبوعہ متن کی بنیاد بنایا ہے۔ کاتب سندھ کے مشہور علمی لوگوں میں سے تھا۔

۳) بنگال ایشیاٹک کلکتہ: یہاں ایک نسخہ ہے یہ بھی ۱۰۴۰ھ کا کتابت شدہ ہے نمبر ۱۸۵ پر موجود ہے۔

۴) ملافیروز لائبریری بمبئی: یہاں ایک نسخہ ہے جس کا سن کتاب ۲۵ شوال ۱۰۸۵ھ ہے۔

۵-۶) کتبخانۂ آصفیہ: یہاں دو نسخے ہیں نمبر ۲۹۲ اور ۶۷۴ – پہلے کی کتابت ۱۲۲۷ھ اور دوسری کی ۱۱۹۷ھ میں ہوئی۔

یہ خاص نسخے ہیں، دوسرے متعدد غیر اہم نسخے موجود ہیں، جن کا ذکر غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز کیا گیا ہے۔ تاریخ معصومی کے تراجم اس طرح ہیں:[۲۴]۔

انگریزی ترجمہ: ۱۸۴۶ھ میں G.G. Melet نے کیا، ان

کے سامنے تین نسخے تھے- پہلا پیر سائیں علی گوہر شاہ، دوسرا سید غلام علی شاہ اور تیسرا میر علی مراد خان تالپور والی ریاست خیر پور کا تھا-

سندھی تراجم: سندھی زبان میں اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں- ایك ترجمہ نندی رام نے ۱۸۶۱ء میں کیا جبکہ دوسرا ترجمہ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر داؤد پوتہ والے متن سے مخدوم امیر احمد نے کیا اس ترجمہ کو سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے سندھ میں زیادہ تر یہی نسخہ معروف ہے-

اردو ترجمہ: پہلا اردو ترجمہ بھاولپور میں ۱۳۲۴/۱۹۰۶ھ میں ہوا مترجم آغا سلطان مرزا تھے- ترجمہ کے اختتام کی تاریخ ۱۱ جولائی ۱۹۰۶ء چہارشنبہ درج ہے- یہ نسخہ سالار جنگ کے کتب خانے میں نمبر ۵۲۶ پر ہے -(فہرست اردو ۸۶۲) سائز ۱/۲ ۶، ۱۰ - ص ۲۶۱، سطریں ۲۱، مترجم کا اپنا نسخہ ہے-

ترجمے میں کہا گیا ہے کہ ان کے سامنے تاریخ معصومی کا وہ نسخہ رہا جس کی کتابت ۱۰۱۷ھ میں ہوئی تھی- معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر یہی نسخہ تھا جو پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے-

دوسرا اردو ترجمہ مخدوم امیر احمد کے سندھی ترجمے سے سندھی ادبی بورڈ نے شائع کرایا اور یہی معروف ہے-

فارسی متن: فارسی متن مرحوم ڈاکٹر داود پوتہ نے ۱۹۳۸ء میں بمبئی سے شائع کیا ہے جو ہر لحاظ سے بہترین نمونہ ہے-

۸-۹) دواوین:

تقی کاشی کا قول ہے کہ میر معصوم نے غزلیات کے دو

دواوین (۱۰۱۳ھ تلک) مرتب کیے تھے جن میں پانچ ہزار ابیات تھے۔ ان کی غزلیں خوبصورت، پُر شور، پُر معانی اور جدت ادا کی حامل تھیں۔۲۵

۱۰) دیوان رباعیات:

رباعیات کا مجموعہ میر مرحوم نے علیحدہ مرتب اور مکمل کیا تھا۔ جس کے سلسلے میں تقی کاشی عبارت آرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا وہ دیوان لطافت سے بھر پور اور ''ھررباعی ازان تیر چھار پری است کہ از شست کماندار قادر انداز بیرون آمدہ و بہ ھدف مقصود درسیدہ۔''

اس عبارت میں گو کہ رباعی کی تعریف کی گئی لیکن لطیف اشارہ میر صاحب کے تیر کمان سے شکار کرنے والے شوق کی طرف بھی ہے۔

در حقیقت میر صاحب رباعیات کے حقیقی بادشاہ تھے ان کی کتبوں والی رباعیاں اس کی گواہ ہیں۔

۱۱) ساقی نامہ:

تقی کاشی نے انہیں دو ساقی ناموں مصنفین کا بیان کیا ہے۔ اگرچہ ساقی نامے دیوان کے جزو ہیں لیکن چونکہ تقی کاشی نے انکا ذکر علیحدہ اور خاص طور پر کیا ہے اس لیے یہاں بھی الگ عنوان قائم کیا گیا ہے۔ میر صاحب کا ایک ساقی نامہ حسن اتفاق سے ہمیں ایک بیاض سے ملا ہے جو شاعری والے باب میں دیا جائیگا۔

۱۲) معما:

شعری پہیلیاں بھی دیوان کا حصہ ہیں۔لیکن تقی نے ان کا ذکر بھی علیحدہ اور خاص طور سے کیا۔ یہ اس لیے اہم بھی ہے کہ انہیں الگ عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔

خراسان تیموری دور میں شعر و ادب کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ میر معصوم نہ صرف خاندانی طور پر خراسانی تھے بلکہ شعر میں بھی انھوں نے خراسانی انداز کی پیروی کی۔ تیموری دور میں معما کہنے کا رواج اور لہراتے شاعروں نے اسی صنف میں بہت کچھ کہا۔ مولانا جامی اور علی شیر نوائی خاص نمائندے تھے۔ جنھوں نے "معما" کے صنف کی شاعری کو تازگی بخشی اور رواج دیا۔ یہی سبب تھا کہ میر معصوم نے ہراتی انداز میں بڑی تعداد میں معمے کہے ہیں۔ جن کا تقی کاشی کو خاص طور پر ذکر کرنا پڑا۔ انھوں نے "چندین" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "معما" کی تعداد قابل ذکر ہے۔ ان کے معما کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ: "ناسخ افکار مدققان آن فن و مدرکان صاحب فطن است۔"

افسوس ہے کہ میر مرحوم کا یہ سارا شعری سرمایہ گردش ایام کے سبب محفوظ نہ رہ سکا اور آج ہمارے پاس مذکورہ بالا مجموعوں میں سے کوئی بھی ایک تصنیف موجود نہیں ہے۔ تذکروں میں منتشر اشعار ملتے ہیں سب سے زیادہ تقی کاشی نے میر صاحب کا انتخاب دیا ہے یا کچھ ملا بدایونی نے دیا ہے ان ہی سے مخزن الغرائب کے مؤلف نے اقتباس دیا ہے۔ باقی تذکرہ نگاروں نے چند شعروں پر اکتفا کیا ہے۔ آپ کے کچھ اشعار اور رباعیات مختلف عمارات کے یادگار کتبوں پر محفوظ رہ گئے ہیں ۔ خاص طور پر قبرستان کے پتھروں پر کافی تعداد میں کندہ ہیں۔

ہم، میر کے دستیاب منتشر کلام کے مواد کو یکجا کر کے علیحدہ ایک باب میں دے رہے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ اس لیے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کسی وقت ان کا دیوان یا زیادہ شعری سرمایہ ہاتھ آجائے۔ [1]

حوالہ جات

۱۔ مآثر الامراء (۱:۶۶۳) ...مثل میر معصوم بکری وغیرہ اھل کمال دمساز تالیف آن بودہ اند ." ...اتفاقاً در آن ایام تألیف "طبقات اکبری" درمیان بود .صحبت میر کہ در تاریخدانی یگانہ روزگار بود، در گرفت ..." (۳: ۲۶۔۳۲۷).

۲۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ اسی کتاب کی مدد سے تیار کی جس میں افغان بادشاہوں سے متعلق پورا حصہ لفظ بہ لفظ اسی سے نقل کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ہمایوں کا سارا احوال ہو بہو نقل ہے تاریخ فرشتہ کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ مآثر رحیمی کی ایک جلد اسی کی نقل ہے۔

۳۔ ...خواجہ نظام الدین احمد را ذوق تصنیف تاریخ طبقات اکبری بود، و میر در علم تاریخ بھرہ کامل داشت . صحبت ایشان برابر کرد. (ذخیرہ: ۱: ۲۰۲)

۴۔ طبقات (۲:۵۰۰)

۵۔ ...شعر متین می گفت ...ذوق عمارت بسیار داشت و خود کتبہ نویس و خوش خط بود...(۱:۲۰۳)

۶۔ بنا بر حکم میرزا احمد نیشا پوری کہ وزیر شاہ عباس صفوی بود، بہ امیر مزبور صحبت مشاعرہ داشتم، الحق اورا قوت و قدرت عظیم در شاعری بود... (رسالۂ تاریخ حیدر آباد دکن، جنوری ۱۹۲۹ھ بحوالہ عرفات العاشقین)

۷۔ تقی اوحدی گوید کہ بہ او صحبتھا داشت و مشاعرات واقع گشت . الحق او را قوت وقدرت درین فن بود، اگرچہ رطب و

یابس در کلامش فراوان است... (گل رعنا، پنجاب)

۸۔ مجمع النفائس، قومی عجائب گھر، کراچی ۳۶۵ ب

۹۔ هفت آسمان، احمد علی، کلکتہ۔

۱۰۔ ماثر ۳:۳۲۸

۱۱۔ ماثر نے ناز و نیاز غلط لکھا ہے۔

۱۲۔ پوری عبارت اس طرح ہے: پنج کتاب مثنوی است که ترتیب داده به دوازده هزاربیت، یکی در بحر هفت پیکر، ودیگری بروزن اسکندر نامه و سوم در جواب لیلیٰ و مجنون، چهارم در برابر یوسف و زلیخا، پنجم در مقابل مخزن الاسرار که به "معدن الافکار" اتسام یافته اما آنچه در بحر لیلیٰ و مجنون است مسما به "رای وصورت" وآنکه در بحر یوسف وزلیخاست موسوم است به "حسن و ناز". درین دو کتاب معانی دقیقه و خیالات لطیفه انگیخته اند. چنانچه سخن شناسان ممالك هندوستان و نکته سنجان دیار خراسان متفق اند که اکثر مباحث این دو کتاب را بهتر و بلند تر از مولانا جامی گفته..."

۱۳۔ ...این چند بیت از خمسه که در راه به اتمام رسیده بود ثبت نمود ..."

۱۴۔ بقول قانع سسی پنوں کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ (مقالات، ص: ۸۰۰)

۱۵۔ پری و صورت بھی نام آیا ہے (رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن، ص ۳۴۔ ۳۵)

۱۶۔ رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن

۱۷۔ مقالات الشعراء، ص: ۸۰۱۔

۱۸۔ مختصری در طب که به "مفردات معصومی" موسوم است.

۱۹۔ دیباچه تاریخ معصومی، ص (یط)

۲۰۔ مقدمه (کو۔کز)

۲۱۔ معصومی ص:۴

۲۲۔ معصومی: ۱۲۴

۲۳۔ مطبوعہ نسخے میں کتابت کی غلطی کے سبب سال ۱۰۰۸ھ لکھا ہوا ہے۔ در حقیقت مقبرے کے محراب پر کندہ کتبے پر سال ۱۰۰۹ھ ہے جو صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو مکلی نامہ، ص ۸۴۷، اور تصویر میر نمبر ۹۱۔

۲۴۔ برٹش میوزیم میں چھ نسخے موجود ہیں جن میں ایک مشہور انگریز مستشرق ولیم میور کی ملکیت میں تھا۔ کاتب کے مطابق یہ نسخہ اس نسخے سے نقل کیا گیا۔ جس پر مصنف کے دستخط تھے۔ کاتب کا نام محمد جعفر بن قاضی عبدالسلام ہے۔

۲۵۔ غزلیات پُرشور نمکین وابیات بلند متین بہ عبارات تازہ و معانی بی اندازہ۔ (پارس، ص : ۴)

۲۶۔ پیر علی محمد راشدی کو ایک دیوان ان کے خاندان سے ملا تھا۔ وہ انھوں نے نقل کیا تھا جو میرے پاس موجود ہے۔ وہ دیوان سید نور علی شاہ کے پاس موجود تھا جن سے لے کر پیر صاحب نے ۱۹۳۱ء میں سکھر میں نقل کیا۔ دیوان میں مدح اور منقبت ہیں۔ یہ میرمعصوم بکھری کا دیوان نہیں ہے۔ کیوں کہ شعر کا رنگ میر معصوم کا نہیں ہے۔ یہ کسی دوسرے شاعر کا ہے۔قطعے میں نامی تخلص دیکھ کر عزیزوں نے میرمعصوم کا سمجھ کر اتنے برس اپنے ہاں محفوظ رکھا۔

حیات معصوم میں پیر علی محمد شاہ راشدی نے لکھا ہے کہ خیر پور کے وزیر شیخ صادق علی دیوان نامی چھپوا رہے تھے کچھ چھپ چکا تھا لیکن بعد میں روک دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان بھی میر معصوم کا نہیں تھا اور یہ بات جب کسی نے شیخ صادق علی کو بتلائی تو انھوں نے طباعت روک دی۔

باب۔ ۲۴

یادگار اور آثار

میر معصوم کو یادگار قائم کرنے، رفاہی عمارتیں، آرام گاہیں اور مساجد تعمیر کرانے اور دوران سفر قابل دید مقامات اور پہاڑوں پر بطور یادگار کتبے نصب کرنے کا بے پناہ شوق تھا۔ عمارات کے سلسلے میں تو چند امراء کا نام لیا جاسکتا ہے لیکن کتبات نصب کرنے کا ہنر اور شوق میر صاحب کا خاصہ تھا۔ دوسرا کوئی معاصر اس سلسلے میں ان کا ثانی اور شریک نہ ہوسکا۔ کسی ایک شخص کے اتنے کتبات شاید تاریخ میں نہ مل سکیں گے جتنے کہ صرف میر نے نصب کرائے۔ دراصل میر دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی فنائیت سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے مختلف مقامات پر کتبے نصب کر کے اپنا نام زندہ رکھنا چاہا۔ کتبات پر جو اشعار کندہ کیے گئے ہیں ان میں یہی جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، درس عبرت، حیرت، بخشش، گناہ، جزا و سزا، مغفرت کے لیے دعا طلبی یہی مضامین میر کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہیں اور کتبات کا بھی۔ ان مضامین سے میرمرحوم کے ذہنی شعور، رجحانات اور کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً اس قسم کے اشعار کتبوں پہ نظر آئیں گے:

ترا گر آسمان منزل نشین است
هم آخر جای تو زیر زمین است

....

شادیِ زمانہ جز غمی بیش نبود
وین عمر گرانمایہ دمی بیش نبود
سودا ی بتان جز المی بیش نبود
خونـابۂ دیدہ جز نمی بیش نبود

....

رفتیم ازین میانہ، یاران! رحمی
برحال خراب دلفگاران رحمی
چون خاك شدیم و خاك ماگشت غبار
رحمی! رحمی!! به خا کساران رحمی

....

ما آمدہ بودیم درین باغ بگشت
چون ابر بروی سبزہ، چون باد بدشت
چون نرگس پرخمار ناگہ، از خواب
تاچشم کشادیم زہم، عمر گذشت

اس رنگ سے واضح ہوتا ہے کہ میر صاحب کو اس فانی دنیا اور ناپائیدار زندگی کی جھنجھٹ کا کتنا شدید احساس تھا۔ اس کے علاوہ اگر میر صاحب کے اشعار، کتبوں کی عبارت اور ان کی کثرت کا تجزیہ کیا جائے تو میر صاحب کی شخصیت مجسم صورت میں سامنے آجائے۔ یعنی ایك پروقار اور سنجیدہ چھرہ، نہایت حسین، متفکر اور ہمیشہ گہری سوچ اور خیال میں ڈوبا ہوا بزرگ صورت اور پر شوکت شخصیت۔

میر صاحب کی یادگار کہاں ہیں، کتنی ہیں، کتنی مٹ گئیں اس کی تفصیل یا محققانہ تعداد نہیں ہے۔ بہرحال ہندوستان میں جہاں جہاں گئے وہاں اپنے کتبوں کے نشان ضرور چھوڑے۔ بکھر اور سکھر تو ان کا وطن تھا۔ وہاں انھوں نے جو یادگار تعمیر کروائیں وہ نسبتاً پائیدار ہیں۔ نیز

خاندان کی موجودگی کے سبب ان کی نگہداشت بھی ہوتی رہی اسی لیے میر موصوف کے آثار آج زیادہ سے زیادہ یکجا حالت میں ملتے ہیں۔ "ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف اسی ذوق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انھیں عمارات بنانے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ خود بھی کتبہ نویس اور خوش خط تھے۔ ایروان، عجوان، تبریز، اصفہان، قندھار، کابل، کشمیر، ہندوستان، دکن، غرض کہ جہاں پہنچے وہاں اپنے شعروں سے مزین کتبے بنوا کر نصب کیے"۔ا

یہی مصنف عبارات اور شجر کاری کے شوق کے متعلق لکھتے ہیں:

> "کئی شہروں اور گلیوں پر مساجد، سرائے، پل، کنوئیں اور کارواں سرائیں تعمیر کرائے، سکھر شہر میں، جو ان کا وطن ہے وہاں خاص طور پر بہت خوبصورت اور عالی شان عمارات تعمیر کروائیں اور ان کے چاروں طرف برگد کے سایہ دار درخت لگوائے"۔

> عمارات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:
> "دریائے سندہ پر جو بکھر کے قلعے کے چار جانب بہتا ہے "ستیاسر" نامی عمارت تعمیر کروائی، اس کی مثال روئے زمین پر ملنی مشکل ہے۔"گنبد دریائی"سے تعمیر کی تاریخ (۱۰۵۷ھ) نکلتی ہے۔ اپنا قبرستان پہاڑ کے اوپر، جس کے سامنے باغات ہیں اور دریا ہیں اس طرح تیار کروائے کہ اس کی نظیر

ممکن نہیں۔ اس میں ایک مینار دلی کے مینار
کی طرح تعمیر کروایا جو بیس کوس سے
دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ خوب
صورت گنبد اینٹوں سے تعمیر کروایا۔ اسی
طرح ڈھلائی کی گئی اسی کے ساتھ پتھر
چوکنڈی (چار کونوں والی) بھی ہے۔ یہ ایسی
مضبوط ہے کہ قیامت تک قائم رہے گی۔ اپنے
والد، بھائی اور اپنی قبر اسی کے نیچے تیار
کروائی۔ مغفرت کے متعلق آیات اور احادیث
چھت پر کندہ کروائیں جو ان کی قبر کے اوپر
ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے ننانوے نام بھی اسی
پر کندہ ہیں۔ آج ساٹھ برس گزرنے کے بعد
بھی اس عمارت پر کوئی دراڑ نہیں پڑی۔[۲]

گھریلو عمارات کے متعلق یہ مصنف لکھتا ہے:

"حویلی کی عمارت کو خود ہاتھ بھی نہ
لگایا۔ یہ جیسی تھی ویسی ہی رہنے دی
گئی۔ دوسروں کی عمارات بھی اسی قسم کی
تھیں۔ فرماتے تھے کہ عمر پر اعتماد نہیں ہے۔
میرے بعد کہیں منہدم نہ ہوجائیں۔ مسجد کے
سامنے بیس بیگہ زمین لے کر اس میں نہایت
خوب صورت باغ لگوایا، طرح طرح کے پھول اور
پھل دار درخت لگوائے۔ لوگوں نے اس سے فائدہ
حاصل کیا اور وہ ان کے لیے تفریح گاہ بن گیا۔[۳]

باغ جس کا ذکر آیا ہے وہ میر صاحب نے رفاہ عام کے لیے لگوایا تھا۔ اسی ناپائیدار دنیا میں انھوں نے اپنے آرام کے لیے کوئی بھی ایسی عمارت تعمیر نہ کروائی جو ان کے شایان

شان ہو۔ ان کے تحت الشعور میں ہمیشہ بے ثباتی کا جذبہ کار فرما رہا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

مآثر الامراء کے مؤلف نے "ذخیرۃ الخوانین" کی مذکورہ بالا عبارت کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے میر کی عمارت سازی کے شوق اور یادگار تعمیر کرنے کے مشغلے کی تعریف کی ہے۔

زمانے کی گردش نے میر کی کئی یادگاروں کو مٹا دیا ہے جو کچھ بچ گئے ہیں ان کی بھی اصلی صورت قائم نہ رہی۔ پھر بھی شکر ہے کہ آج جو نشانیاں باقی ہیں اس سے دیکھنے والا میر کے فن عمارت سازی اور ذوق کا اندازہ کرسکتا ہے۔ یہاں ان میں سے ہر ایک یادگار کا ذکر سال تعمیر کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت کیا جاتا ہے۔

۱۔ عید گاہ روہڑی ۱۰۰۲ھ

تمام موجودہ مقامات میں سب سے پہلی عمارت روہڑی کی عید گاہ ہے جس کی بنیاد ۱۰۰۲ھ میں رکھی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر مرحوم نے وطن میں مقیم ہوتے ہی عوام کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق پہلے مذہبی عمارت کی بنیاد ڈالی۔ روہڑی شہر کے مغرب اور جنوبی کنارے پر محراب اور چار دیواری بنوا کر عید گاہ تعمیر کروائی۔ جو سکھر سے دریا کے کنارے پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مغربی دیوار میں محراب، مصلیٰ اور دیوار کے دونوں کونوں پر ستون ہیں جن کے اوپر چھوٹے گنبد ہیں اور نیچے محراب ہے جس کی پیشانی پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے:

سیادت پناہ امیر محمد معصوم نامی بن سید صفائی بنا نهاد.

میر معصوم ساخت برسرِ کوہ
عید گاھی بہ فیض ھمچو ارم
پیر فکرت برای تاریخش
عید گاہِ بفیض کرد رقم
۱۰۰۲ھ

راقم الحروف نے عید گاہ کو آخری مرتبہ ۱۹۶۲ء میں دیکھا تھا اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہر سال مرمت ہوتی رہی ہے۔ البتہ میدان پر فرش نہیں تھا۔ عید گاہ وسیع اراضی پر پھیلی ہوئی ہے جس پر چھ سات ہزار افراد بیك وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید گاہ اہالیان روہڑی کے لیے مخصوص تھی۔ سکھر کے لیے ضرور کوئی دوسرا انتظام موجود رہا ہو گا۔

۲۔ چوکنڈی قبرستان ۱۰۰۲ھ

میر کے قبرستان میں تین عمارات اہم ہیں چوکنڈی، جس کے نیچے بنیادی قبریں ہیں، منارہ اور آرام گاہ ہشت پہلو۔ میر صاحب سندھ کی جنگ سے فارغ ہو کر جب تعطیلات سکھر میں گزارنے آئے تو سب سے پہلے انھوں نے روہڑی کی عید گاہ اور والد اور بھائی کی قبروں کے اوپر پتھر کی چوکنڈی (چھتری) تعمیر کروائی۔ آپ کے والد اور بھائی ایك ہی سال میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ وہ جگہ کیوں کہ بلندی پر اور قابل نظارہ تھی اس لیے اسے خاندان کے قبرستان کے لیے منتخب کیا گیا۔ پہاڑی کے سامنے دریا تھا، ساتھ باغات بھی تھے۔ کچھ عرصے کے بعد نشیب میں موجود شہر آباد ہوا۔

اس اراضی میں جو وہاں سے شروع ہو کر ڈی سی آفس پر ختم ہوتی ہے کئی اہم قبرستان اور خاص لوگوں اور خاندانوں کے

مخصوص گورستان تھے جو بعد میں ویران ہوتے گئے۔ انگریزی دور میں نئی عمارات تعمیر ہوئیں اور باغات لگوائے گئے۔ ۱۹۳۰ء تک کئی بوسیدہ قبریں ادھر ادھر موجود تھیں، جو ہم نے دیکھیں۔ یہ نہایت خوب صورت اور کاشی کی اینٹوں سے مزین تھیں۔ شاہ محمد مکی اور پورانی سادات کے قبرستان کے علاوہ سب کچھ تباہ ہوچکا تھا۔ سلطان محمود بکھری کا مدفن بھی اسی طویل اراضی میں کسی جگہ پر تھا۔ اس نے بے گناہ انسانوں کے گھر برباد کیے، قدرت نے اس کا اور اس کے خاندان کا نام و نشان مٹا دیا۔ قبروں کی اینٹیں تک نیست و نابود ہو گئیں۔ آج سوائے چند نیک لوگوں کے کسی دوسرے حملہ آور کی قبر نظر نہیں آتی۔ سندھ آج بھی موجود ہے اور صحیح سلامت ہے۔

سکھر بھی ہے اور اہالیان سکھر بھی ہیں لیکن اگر کوئی فنا ہو کر مٹ گیا تو وہ خونی اور رہزن تھا جس نے دوسروں کو مٹا کر خود کو مسلط کرنے کی کوشش کی۔ آج نہ وہ خود رہا، نہ اس کے پس ماندگان اور نہ ہی ان کا کوئی نام لیوا موجود ہے۔ تاریخ کا چکر اسی طرح حق و ناحق کا بدلہ لیتا ہے۔

قبرستان کی بنیاد کیونکہ پہلے سے رکھ دی گئی تھی اس لیے کچھ سادات اس میں دفن تھے۔ میر معصوم نے آتے ہی اس اراضی پر چار دیواری بنوا کر اس میں قابل دید عمارات تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے والد اور بھائی کی قبروں پر ۱۰۰۲ھ میں پتھر کی چھتری تعمیر کروائی اور اس میں اتنی جگہ رکھی کہ انھیں اور ان کے خاندان کے چند اہم افراد کو اس کے زیر سایہ ابدی آرام نصیب ہوسکے۔

یہ چوکنڈی برآمدے کے ساتھ پتھر کے ستونوں پر قائم ہے اور چھت بھی پتھر کی ہے۔ تین چھوٹے گنبد اس کے

اوپر تعمیر کروائے گئے- ستونوں پر چھت کے شہتیروں کے اوپر اور گنبد کے اندر آیات اور اشعار کندہ ہیں جس کی تعریف ''ذخیرۃ الخوانین'' کی زبانی اوپر بیان کی جاچکی ہے- ''عمارت سرکوہ'' (۱۰۰۲ھ) سے اس کی تعمیر کا سال نکلتا ہے- چوکنڈی کا چبوترہ زمین سے دس، پندرہ فٹ اونچا ہے- سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھ کر قبروں تک پہنچا جاسکتا ہے- بنیادی چوکنڈی کے ساتھ بعد کے ادوار میں مشرق سے دوسری عمارت تعمیر کی گئی- میر معصوم والی عمارت وہ ہے جو پتھر کے ستونوں پر قائم ہے- اس عمارت کے بیس ستون ہیں جن میں آٹھ خالی ہیں باقی سب پر آیات کندہ ہیں- قبرستان کے نقشے میں شہتیروں پر نمبر دیئے گئے ہیں- ان ہی نمبروں کے سامنے، شہتیروں پر کندہ رباعیات دی گئی ہیں-

یاد رہے کہ یہی اشعار شمال اور جنوب کی طرف برآمدوں پر ہیں: ۴ے

در وادیِ عشق بی سپر باید شد
در گرم روی همچو شرر باید شد
گوی سر خود به جای پا باید ماند
این ره رہِ عشق است، بسر باید شد

....

نامی! تو که کام خواستی، کام کجاست؟
در گردش روزگار، آرام کجاست؟
صیاد قضا، نهاده دامی ز اجل!
مرغی که برون جهد، این دام کجاست؟

....

دیدم چغدی نشسته در صبح پگاه
بر کنگرۂ مقبرۂ شروانشاه ۵ے

فریاد کنان ز روی عبرت می گفت:
کو آن همه حشمت؟ و کجا آن همه جاه؟

....

آنانکه به دهر در تنعم بودند
هر لحظه به مال و جاه می افزودند
امروز از یشان اثری پیدا نیست
یك یك رفتند و زیر خاك آسودند

....

از غمزهٔ مستت همه خون می آید
و ز عشق توام بوی جنون می آید
نامی و دلی و صد غم، انصافی هست؟
از عهدهٔ این کار، برون می آید

....

پیوسته دو دیده لاله گون می باید
دل نیز چودیده، غرق خون می باید
وارستگی ای، گرت بعالم هوش است
دیوانگی ای به از جنون می باید

....

عشقت، نه متاع هر خریدار بود
اورا دو جهان، بهای یکتار بود
گل نیست، که در کوچه و بازار بود
یا مشك، که در دکان عطار بود

....

نامی به قضا رو به تمنا می رو
ره جانبِ آرزو چلیپا می رو

پشتی بہ امید دادہ پھلو بہ مراد
رو تافتہ از خود، بہ پسِ پا می رو

....

از دانش کار دھر، نادانی بہ
وز کردۂ او، ترا پشیمانی بہ
چون حاصل کار این جہان، معلوم است
میدانی بہ! و گر نمیدانی بہ

....

ای آنکہ تو بار بستہ بر راحلہ ای
در خواب شدہ غافل ازین مرحلہ ای
بیدار شو و پای طلب در رہ نہ
رفتند ہمہ، تو نیز ازین قافلہ ای

....

نامی! بہ جہان، نشاط کم می بینم
آمیختہ شادیش بہ غم می بینم
باید کہ تو اول بہ جہان پشت دھی
آخر چو ترا رو بہ عدم می بینم

....

دیوانۂ عشق را حسابی دگر است
گر محو شود بہ خود حجابی دگر است
گر خاك شود، بخا کساریش می بین
ھر ذرۂ خاکش آفتابی دگر است

درمیانی مرکزی حصے کی چھت پر تین گنبد ہیں اوپر گول اور اندر سے بیضوی شکل کے ہیں۔ ابوالقاسم، میرمعصوم اور سید صفائی کی قبریں ان ہی گنبدوں میں ہیں۔ درمیانی گنبد جس کے نیچے میر معصوم کا مزار ہے وہ بڑا ہے جب کہ دوسرے دو مقابلتاً چھوٹے ہیں۔ چھتری کی چھت اور گنبدوں کے اوپر چونے کا پختہ پلاستر کیا ہوا ہے۔

۱۔ میر بزرگ کا مزار:

خاندانی روایت کے مطابق چاروں طرف چھت کے نیچے چونے کی جو قبر، بغیر کتبے کی ہے میر بزرگ کی ہے۔ سیڑھی پر چڑھ کر مرکزی چبوترے پر سب سے پہلے اس قبر کے سرہانے پر پہنچتے ہیں۔ تاریخ کا کتبہ نہیں ہے۔ چھت کی اینٹوں کے نیچے، درج ذیل اشعار کندہ ہیں:

چون خاك همی شود ترا ملك وجود
عمر تو اگر هزار وز بیش، چه سود؟
منزل دور است، می باید ساخت
آماده برای مرگ می باید بود

....

پس روز که شب آید و مهتاب شود
پس شب گذرد که صبح نایاب شود
چون می گذرد روز و شب یاد آورد
زان روز که چون شبِ تو در خواب شود

پہلا شعر جنوب میں، دوسرا مشرق میں، تیسرا شمال میں اور چوتھا مغرب میں ہے۔ میر بزرگ کے مزار کے ایك ستون پر اسی طرح سے شعر کندہ ہیں:

۱۔ مرگ را در زیر بالین
۲۔ دار. چون بخسپ در
۳۔ پیش چشم در آر. چون
٤۔ برخیزی و
۵۔ درخردی گناه
٦۔ منگر، در بزرگی
۷۔ وی نگر، که درگه

۸۔ عاصی مشوی
۹۔ گفت: چگونه ؟
۱۰۔ باشد کسی که
۱۱۔ بامراد برخیزد
۱۲۔ و نداند که تا
۱۳۔ به همه شبانگاه
۱٤۔ خواهد زیست یا نه!

۲۔ سید صفائی کا مزار

تیسرے گنبد کے نیچے ہے۔ میر معصوم اور سید صفائی کی قبروں کے درمیان ایك چونے کی تعمیر شدہ قبر ہے۔ کتبات نہ ہونے کے سبب یہ معلوم نہیں کہ کس کی ہے۔ سید صفائی کی قبر بھی اسی طرح ہے جیسی کہ میرمعصوم کی ہے۔ آیات اور اشعار سے کُنندہ ہے۔ پائوں کی طرف، وفات کی تاریخ کا کتبہ کندہ ہے۔

ماه قرشی لقب صفایی
کافر اشت فلك ولای نورش
ناگاه ازین جهانگه سیر
افتاد به آن جهان عبورش
نامی زبرای سال تاریخ
گفتا: پر نور باد گورش

اس کی پائنتی کی طرف والی قبر پر تاریخ کے شعر کے چاروں طرف کناروں پر یہ اشعار کندہ ہیں:

ای آمده برسر مزارم
و از آمدنت امیدوارم
حسرت زده ام به خاک مانده
افتاده درین مغاك مانده

یك فاتحه بخوان به اخلاص
تا حق کندت به مغفرت خاص ۶ـ

قبر کی بنیاد کے کنارے پر چاروں طرف مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں ۷ـ:

ای آمده بر مزار نامی
وز آمدنت، شده گرامی
چون آمده ای! زیارتی کن
از فاتحه یك اشارتی کن
از مرحلۂ جهان غمناك
شد منزل ما سراچۂ خاك
رحمی! رحمی! که بس غریبم
از عیش زمان بی نصیبم

....

جان قاصدِ راه آن جهان است
این جا، دوسه روزه میهمان است
همپائیِ شعله کن، به رفتار
همگامیِ برق کن، شرر وار
سنگی که نهاده برمزار است
سر تا سرش از غمم فگار است
بشگافی اگر درون این سنگ
گر سنگ بود دلت شود تنگ

....

این راه بود دراز و تاریك
وین خانه گور، تنگ و تاریك

....

محتاج لطیفۂ دعایم
گو فاتحه ای که بی نوایم

میر صفائی کا گنبد جن شہتیروں پر قائم ہے اس کی چار دیواری پر یہ شعر اس طرح کندہ ہیں جس طرح میر معصوم کے گنبد والے شہتیروں پر ہیں:

چون دانستی ما حاصل دنیا را
امروز بگیر توشۂ فردا را
فردات چو امروز همی دست دهد
زنهار به فردا مفگن سودا را

....

از نیك و بد زمانه پرهیز و برو
زین کهنه رباط پر خطر خیز و بروا
چون کار زمانه سربه سر دردِ سر است
دستی! به سر خود نه و بگریز وبروا

پہلا شعر جنوب، دوسرا مشرق میں، تیسرا شمال میں اور چوتھا مغرب میں ہے:

بیا نامی! دمی از مرگ کن یاد
بکن در ماتم خود، نوحه بنیاد
بیا تا یك نفس بر خود بموییم
خدا رحمت کناد از خود بگوییم
قرین مغفرت باد آشنایی
که گوید بعد ما بر ما دعایی

پہلا شعر جنوب، دوسرا شمال، تیسرا مغرب اور چوتھا مشرق کی طرف ہے۔

۳۔ میر معصوم کا مزار:

میر معصوم کا مزار نہایت مضبوط پتھر اور خوب صورت نقاشی سے آراستہ ہے۔ قبر کے کنارے اور درمیان میں چاروں طرف آیات کندہ ہیں۔۸۔ قبر کی پاؤں کی طرف یہ تاریخی کتبہ ہے۔

میر معصوم آن مه برج شرف
آفتابِ شرع و دین، فخرِ زمن
روزہ جمعه سادس ذی الحج گشت
عازم جنت به امر ذوالمنن
سال فوتش از خرد جستم بگفت:
بود نامی صاحب ملك سخن

میر معصوم کے گنبد کے اندر پہلے آیتیں اور اقوال اور پھر اشعار کندہ ہیں۔ گنبد کے شہتیروں پر نہایت خوب صورت نستعلیق خط میں رباعیاں ہیں۔ رباعیاں یہ ہیں:

نی گل به رخ باد صبا می خندد
نی نی، نغمه بر غفلت ما می خندد
گویم! که چرا می خندد
بریك دم، عمرِ بی وفا می خندد

....

از تفرقۂ دهر اگر رستی، هیچ!
ورجای شدت بلند و پستی، هیچ!
چون آخر کار بایدت خاك شدن
دانستی هیچ، ور ندانستی هیچ!

....

جز غم دل، اهل درد خندان که کند
جز ناله، دوای مستمندان که کند
جز گریه نوازش غریبان که کند
جاروب مزار خاکساران که کند

....

نامی، که ز دست دهر در تاب شده
پژ مرده گلیست کز رخش آب شده

زود است کـه بنگری تـو آن غمزده را
آسـوده بـزیر خـاك و در خـواب شده

....

در دهـر اگـر گدا و گـر محتشم است
آخـر همـه را روی، به سوی عدم است
عـمر تـو اگـر بیـش بود، کم ز کم است
زیـرا کـه، چو نیك بنگری یك دو دم است

....

روزی کـه دلـم ز دهـر نـومید شود
جـان نیـز بسـر مـنزل جـاوید شود
ذرات وجـودم کـه بـه مهرش شده خـاك
کـمتـر ذرّه ازو چـو خـورشیـد شـود

....

مـا آمـده بودیـم دریـن بـاغ بـگشت
چـون ابـر بـروی سبـزه، چون باد بدشت
چـون نـرگس پـر خـمار، نـاگاه از خواب
تـا چشـم کشـادیـم ز هم، عمر گذشت

....

هـان نـامـی! هـان! بـخـویـش یکدم پرداز
مـردانـه بسـاز تـوشـهٔ رفتن سـاز
داری درپیـش بـس ره دور و دراز
ای کـاش! امیـد آمـدن بـودی بـاز

....

ایـن اهـل قبـور بیـن، بـه خـواب اند همـه
آسـوده ز دادن جـواب انـد هـمـه
از نشـأه جـام واپسیـن تـا دم حشـر
در زیـر زمـیـن مسـت خـراب انـد همـه

....

نامی من ازین دهر پشیمان رفتم
ناچیده گلی، ازین گلستان رفتم
بودم، دو هزار آرزو در دل بیش
نا کرده یکی از آن، بسامان رفتم

....

در موسم گل، چمن رخ آتش گون کرد
دل، دیده بیاد دوستان، پر خون کرد
سبزه نبود بخاك ما غمزدگان
غم سبز شد و زخاك سر بیرون کرد

....

زد شیشهٔ چرخ، سنگ بر ساغر ما
خون شد چو انار دانه، دل در بر ما
گردی ننشسته بود بر افسر ما
اکنون بنگر خاك سیه برسر ما

....

ای آنکه جهان گرفته ای خوش بکنار
دانی که ترا به وقت کار، آید کار
گر ملك حبش داری و ور ملك تتار
باخود نبری هیچ، بغیر از کردار

....

ماقصه نگفتیم و کلام آخر شد
حرفی ننوشتیم، پیام آخر شد
صبح طربم نا شده شام آخر شد
چون نوبتِ ما رسید، جام آخر شد

خاص گنبد کے اندر جو شہتیر ہیں اُن کے اوپر یہ اشعار کندہ ہیں:

نامی! گل این بی چمن چیدن نیست
زین باغ بر آ که رخصت دیدن نیست
زین گلشن غم، بهار شا دی مطلب
در غنچهٔ او، امید خندیدن نیست

....

گر نیك شماری سخنم و رزشت
در باغ جهان، کس گل جاوید نکشت
چون کرده و نا کرده ز تو می طلبند
خواهی تو به دوزخ روی خواهی به بهشت

....

از مال، اگر دهر کنی مالا مال
سودی نبود ترا ز افزونی مال
روزی اگر افزایی در مدت عمر
دایم که بمانی به جهان، سالها سال

....

نامی! ز فلك دوش، دلم کرد سوال
کز رفته و آینده بیان کن احوال
گفتا: چه خبر؟ ز رفتگان نیست اثر!
آینده چو رفته دان چه می پرسی حال

....

عمر یست که از جملهٔ خاموشانیم
از جام اجل فتاده مدهو شانیم
مائیم که کس بیاد نیارد مارا
یاد آر که از خیل فراموشانیم

....

بگذر بسوی قبور، اگر داری هوش
بنگر سوی خفتگان گویای خموش
کاینك اجل، از گوش تو، بیرون آرد
این پنبهٔ غفلتی که داری در گوش

....

نامی ز گنه، روی سیاه آورده
وز کردهٔ خود باتو، پناه آورده
گویند: به عاصیان بود مغفرتت
تو غفاری و من گناه آورده

....

نامی بکشا چشم بصیرت دریاب
بنیاد زمانه همچو نقشی است بر آب
باتو گویم که حاصلِ دنیا چیست
بیداریِ یك زمان و باقی همه خواب

....

جام از میِ عیش تلخکام افتاده
وین مجلس باده ناتمام افتاده
بنگرز حریفان می و جام افتاده
مستانه به خواب هر کدام افتاده

....

گویند: بود فاتحه را فایحه ای
زان فایحه بخش نکهت رایحه ای
بر روح گذشتگان فرست اخلاصی
محتاج دعاییم بخوان فاتحه ای

تاریخ بناء:

مندرجہ بالا شہتیروں میں سے شمالی شہتیر پر اسی چوکنڈی کی عمارت پر تاریخ کا شعر کندہ ہے، جو کہ میر معصوم کا اپنا نہیں بلکہ کسی اور شاعر کی تخلیق ہے۔

امیر سید فاضل محمد معصوم
بروی کوہ بنا کرد منزلی بشکوہ
عجب خجستہ مقامی کہ خلق می آیند
پی زیارتش از ہر طرف گروہ گروہ
چو از دبیر خرد سال این بنا جستم
قلم گرفت ورقم زد: عمارت سر کوہ
۱۰۰۲ھ

۴۔ چونے کی قبر؟

میر ابو القاسم اور میر معصوم کے دو پتھروں کی قبروں کے درمیان میں چونے سے بنی ہوئی ایک چھوٹی قبر ہے وہ کسی بچے کی معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ ابوالقاسم کا مزار:

چوتھے نمبر کی قبر میر معصوم کے بڑے بھائی میر ابوالقاسم کی ہے۔ آپ بہادر، ادیب اور شاعر تھے۔ عین جوانی میں فوت ہوئے۔ ایک بیٹا میر محمد شجاع بطور یادگار چھوڑا۔ قبر کی پائنتی کی طرف یہ کتبہ ہے:

چوشد میر بو القاسم نیک رای
سوی دار عقبیٰ ز دار فنا
چو نامی طلب کردہ تاریخ او
خرد گفت: رفتا بدار البقا
۹۹۱ھ

گنبد کے اندر کناروں پر یہ شعر ہیں:

رفتیم چو از میانہ، یاران رحمی
برحال خراب دلفگاران رحمی
چون خاک شدیم و خاک ما گشت غبار
رحمی رحمی! به خاکساران رحمی

....

چون خاک شود زغم وجود پاکت
وز حادثه برباد دهد افلاکت
جز سبزه، کسی سرنکشد بر گورت
جز بار، کسی پانه ننهد، برخاکت

سرہانے پر یہ اشعار ہیں:

شادیِ زمانه، جزغمی بیش نبود
وین عُمر گرانما یه دمی بیش نبود
سودای بتان، جزالمی بیش نبود
خونابۂ دیده، جزنمی بیش نبود

....

ترا گر آسمان منزل نشین است
هم آخر جای تو زیر زمین است

۶۔ چونے کی قبر:

مشرق سے مرکزی چھتری کے نیچے پہلی قبر کتبے کے بغیر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میر کے بھائی میر محمد فاضل کی ہو۔ گنبد کے کناروں پر اندر سے یہ اشعار کندہ ہیں:

ما چهره به خونِ جگر آراسته ایم
و ز ناله، جمالِ خَویش پیراسته ایم

چون غنچه ندیده خنده، به باد
ننهاده قدم، چوسرو برخاسته ایم

....

تنہا با خود، در انجمن باید بود
با خویش همیشہ درسخن باید بود

ہم بلبل و ہم گل چمن باید بود
دیوانۂ کار خویشتن باید بود

پہلی سطر مشرق کی طرف سے ہے۔ دوسری شمال، تیسری مغرب اور چوتھی جنوب کی طرف سے ہے۔ اسی چبوترے والی چوکنڈی کے ساتھ بعد کی بنی ہوئی دوسری عمارت ہے جس کی چھت میں دو پارہ پارہ شُدہ گنبد ہیں جن کے نیچے چونے کی قبریں بغیر کتبے کے موجود ہیں۔ ان دو عمارات کے بعد اسی چبوترے اور بلندی پر چھتیس قبریں ہیں (۱۹۶۲ء)، جو زیادہ تر چودھویں صدی کی ہیں۔ تین قبریں پتھر کی ہیں جن میں سے ایک پر صفائی کا وہی کتبہ ہے۔ غالباً وہ پڑا ہوا تھا جس کو اٹھا کر اس قبر پر نصب کر دیا گیا ہے۔

۷۔ میر معصوم کی اہلیہ کی قبر:

قبروں کے اس مجموعے میں، جس قبر پر یہ کتبہ ہے اس کے بارے میں گمان غالب ہے کہ میر صاحب کے حرم کی قبر ہوسکتی ہے۔ کتبے کا مطلب بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے جیسا کہ جلی حروف سے معلوم ہو گا۔

کتبے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی وفات کے بعد ہی اسی سال (۱۰۱۴ھ) ان کے حرم نے بھی وفات پا کر فراق اور فرصت سے نجات پائی۔ کتبہ کچھ اس طرح ہے:

مھد علیا سرشت اھل بھشت   روح پاکش به جنان بادا شاد
بی رخ حضرت نواب به دھر   یکزمان چشم جھان بین نکشاد
رفت و رست از الم فرقت آن   این بود صدق وفای میعاد
سال فوتش زخرد جستم، گفت   منزلش گلشن قدوسی باد

ان میں سے چند قبروں پر کاشی اور پتھر کے کتبے

ہیں۔ ان میں مدفون کچھ لوگوں کے نام یہ ہیں: سید میر غوث علی شاہ (۱۳۰۳ھ)، سید میر فیض علی شاہ، سید میر عظیم علی شاہ، میر محمد علی شاہ (۱۳۲۲ھ)، سید میر لعل شاہ (۱۳۹ھ)، میر جعفر علی شاہ، میر علی اکبر شاہ (۱۳۱۱ھ)، میر عنایت علی شاہ (۱۳۱۷ھ)، والدہ ارباب علی شاہ (۱۳۶۶ھ)، میر ارباب علی شاہ ولد میر حسین علی شاہ (۱۳۳۷ھ)۔

قبرستان کی موجودہ حالت:

میر کے اسی تاریخی قبرستان پر اس وقت تین فریقوں یعنی: میر معصوم کے خاندان، محکمہ آثار قدیمہ اور محکمہ اوقاف کا قبضہ ہے۔ فن سے نابلد ہاتھوں میں قائم رہا تو اس قبرستان کا بھی حشر ٹھٹھہ کی جامع مسجد جیسا ہوگا۔

۳۔ ”مینار“ یعنی میر معصوم کا منارہ

۱۰۰۲-۱۰۱۳ھ

قبرستان کے احاطے کے اندر چھتری کے مغرب میں میر معصوم کا مشہور مینار موجود ہے جس کو تقریباً چار صدیاں گذر چکی ہیں۔ یہ ابھی تک مضبوط اور سادگی سے سروقد کھڑا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سکھر کی پاسبانی کر رہا ہے۔

مینار کی تعمیر میں نیچے پتھر کی بنیاد ہے اور اوپر پختہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ مینار کا احاطہ چوراسی فٹ ہے اور اوپر چوٹی تک پہنچنے کے لیے اس کے اندر ہی اندر چوراسی سیڑھیاں ہیں۔ کزنس کا کہنا ہے کہ مینار کی بلندی بھی چوراسی فٹ ہے۔ اینٹیں چیرولی سے تعمیر کی گئی ہیں۔

زینے کے اوپر کتبہ ہے جس سے تعمیر کے آغاز کا سال

۱۰۰۲ھ اور اختتام کا سال ۱۰۱۳ھ ملتا ہے۔ گویا میر نے جنگ سے فارغ ہو کر مینار کی بنیاد ڈالی اور بقایا سال وہ مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے۔ مثلاً سیوی، قندھار، آسیر، ایران اور آگرہ وغیرہ اور مینار اُن کی غیر موجودگی میں تعمیر ہوتا رہا۔ وہ ایران سے ۱۰۱۳ھ میں واپس آئے۔ اسی سال مینار بھی مکمل ہو گیا۔ مینار کے سلسلے میں تحفہ الکرام کے مؤلف نے ایک بے بنیاد روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے ایک بڑی رقم بطور نذرانہ حرمین روانہ کی تھی جو واپس آئی۔ پھر حکم کے مطابق میر معصوم نے وہ رقم مینار اور دوسرے یادگار تعمیر کروانے میں خرچ کی۔[۹]

میر معصوم کے مینار کے سلسلے میں مقامی طور پر کئی اور روایات مشہور ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اصل میں اپنی افتاد طبع کی بناء پر یہ مینار نہایت خوبصورت اور موزون جگہ پر بطور یادگار تعمیر کروایا۔ ان کے ذہن میں دلی کا قطب مینار اور اس کی عظمت موجود تھی۔ غزنی کی طرف گیا تو وہاں غزنویوں کے یادگار مینار دیکھے۔ یقیناً افغانستان کا مینار (جام) بھی آپ کی نظروں سے گذرا ہو گا۔ اسی طرح وہ جب اصفہان گئے تو وہاں بھی انھیں سلجوقیوں کا یادگار مسجد علی کا مشہور مینار نظر آیا۔ انھوں نے اس کے برابر میں کتبہ نصب کیا۔

مینار کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ذرا اوپر ایک طرف سے تھوڑا سا جھکا ہوا ہے۔ یہ تعمیر کے وقت اسی طرح سے بنایا گیا تھا۔

مینار کی تعمیر یا کسی خاص سبب کے تفصیل کہیں بیان نہیں ہوئی۔ صرف دیکھنے والوں نے اس کی

تعریف کی ہے۔ اسی طرح انگریز اہل قلم بھی اس کے مداح رہے ہیں۔ مثلاً برٹن کے ہیوز، کزنس وغیرہ نے تعریف کی ہے[۱۰]:

اوپر جانے کے لیے جو سیڑھی ہے، اس کے نیچے، بنیاد پر دروازہ ہے، جس کے اوپر تعمیر کے سال کے کتبے، مندرجہ ذیل عبارت میں نوشتہ ہیں:-

۱۔ بناء هذا المناره فی زمان
۲۔ سلطان جلال الدین محمد اکبر بادشاه غازی
۳۔ بدر فلك علا محمد معصوم
۴۔ کزوی به زمانه صیت نیکونامی است
۵۔ افراشت چنین بناء عالی که ز قد
۶۔ افراخته سر به چرخ مینا فامی است
۷۔ تاریخ بناء او ملایك از عرش
۸۔ گفتند: جهان نما منار نامی است (۱۰۰۲ھ)
۹۔ میر معصوم آن رفیع القدر
که از و کار دین به آئین است
۱۰۔ کرد طرح منار تا گویند:
کین پی یادگار دیرین است
۱۱۔ پیر چرخ از برای تاریخش
طاق عرشی برین بگفت این است[۱۱]
۱۲۔ قایله میر بزرگ بن سیادت پناه میر محمد معصوم۔

یہ کتبہ جیسا کہ آخری سطر سے ظاہر ہے، میر بزرگ کا تیار کردہ ہے جو خود بھی ایران جاتے ہوئے اپنے والد کے ساتھ کم از کم افغانستان تک ساتھ تھے۔ جیسا کہ فراہ کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے۔

سکھر کے گزیٹیئر نے غلطی سے تیار ہونے کا عرصہ چودہ سال بیان کیا ہے۔[۱۲] ظاہر ہے کہ دو سال زیادہ لکھے

گئے ہیں۔ یعنی ۱۰۰۳ھ میں بنیاد رکھی گئی اور میر بزرگ نے والد کی وفات کے بعد مینار کی تکمیل ۱۰۲۶ھ میں کی۔۱۳۔

۴۔ آرام گاہ ۱۰۰۴ھ

مینار اور قبروں کی مرکزی چوکنڈی کے درمیان میں ہشت پہلو گنبد کی ایک عمارت ہے جو آرام گاہ کے لیے کام آسکتی ہے۔ اس کے چار دروازے ہیں اور چار بند پہلو ہیں۔ گنبد کے اندر یا باہر چھت پر نہایت خوب صورت کاشی کا کام کیا ہوا ہے اور اندر و باہر اوپر کے کنارے پر بھی کاشی کی ایک پٹی ہے۔ دو دروازوں کے اوپر نشیمن کی طرح اضافے ہیں۔ جن کی چھت پر اندر سے خوب صورت نستعلیق خط میں اشعار کندہ ہیں۔ اسی طرح اندر اوپر کے کنارے پر چاروں طرف مسلسل اشعار ہیں۔ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے یہ عمارت بڑی خوب صورت اور نفیس ہے۔

یہ عمارت ۱۰۰۴ھ میں تعمیر ہوئی جس کی تاریخ مکان بافیض سے نکلتی ہے۔ تاریخ کے شعر کے پہلے مصرعے میں "محل فیض" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ اسی لیے اس عمارت کو خاندان یا عوام میں "فیض محل" کہا جاتا ہے۔ عمارت چوڑائی میں ۱۷ فٹ اور لمبائی میں ۵۰ فٹ ہے۔ صورت حال نقشے میں دیکھنی چاہئے۔ اشعار کے شروع میں نمبر دیے گئے ہیں اور نقشے میں اشعار کی جگہ ان ہی نمبروں سے ظاہر کی گئی ہے:

ای بندہ نواز ذرہ پرور — از لطف تو ذرہ مہرانور
روزی کہ چوسبزہ سر بر آرم — ز ابر کرمت امید وارم
ہر چند کہ خار بوستانم — بخشا بہ طفیل گلستانم
نوری بہ دلم فگن خدایی — تا با تو رسم بہ روشنایی

من بیخود ورفته دل زدستم | دستی که به خاک مانده پستم
صد دیو گریزد ازبرونم | زین دیو که هست در درونم
کو دیده که هرچه اوست، بینم | بکشایم و روی دوست بینم
هر چند که چشم ملست ناپاک | یك رشحهٔ لطف بس برین خاک
چون سوبه تن ار گناه روید | عفو تو ز ابر لطف شوید
بخشش بود اربه نیك کاران | پس وای به ما تباه کاران

---- ----

هرچند گناه، رحمتت بیش | زان روی امید وارم از خویش
من خفتم و دشمنم نگهبان | از دشمنِ خانه چون برم جان
نامی که چوخاك آستان است | زان خاك سرش بر آسمان است
ای خاك بر آن که خاك نبود | برخاك درت هلاك نبود

---- ----

این گنبد باشکوه نامی | کز قدر شد آسمان بافیض
چون بود محل فیض، ازان رو | تاریخ شدش مکان بافیض
(۱۰۰۴ھ)

۵۔ قندھار کا باغ (۱۰۰۶ھ)

میر معصوم کی ایك دستاویز کا پیر علی محمد راشدی نے ذکر کیا ہے۔ جو قندھار میں ایك باغ کی خریداری سے متعلق ہے۔ اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲ محرم ۱۰۰۶ھ کو میر معصوم نے خواجہ محمد ہاشم ولد خواجہ حسین سے باغ خریدا۔ جس میں انگور کے درخت تھے اور ایك جریب کی اراضی پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میر معصوم خود قندھار کی فوجی خدمت پر مامور تھے۔

۶-۷۔ منزل گاہ (۱۰۰۶ھ-۱۰۰۷ھ)

سادہ بیلا کے سامنے، دریائے سکھر والے کنارے پر، ایك دیوار کے احاطے جس پر ہندو اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے

علیحدہ کرنے کے لیے خون خرابہ ہوا۔ سیاسی و سماجی تاریخ میں اس کے نتائج نہایت گہرے اور اندوہ ناک ثابت ہوئے۔ اسی احاطے میں دو عمارتیں ہیں جن میں سے ایک ۱۰۰۷ھ میں تعمیر ہوئی، پہلی عمارت پر یہ کتبہ ہے:

خوشا منزلی باغ رضوان رقم   کہ جان را دھد فیض باغ ارم
بہ تاریخ این جای عشرت سرشت   زھی جای عشرت رقم زد قلم
فی شھور ۱۰۰۶ھ

دوسری عمارت تھوڑے فاصلے پر پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہشت پہلو ہے۔ مغرب کی دیوار پر یہ کتبہ کندہ ہے:

۱۔ در زمان خلافت پادشاہ اعظم شہنشاہ معظم جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی خلداللہ ملکہ

۲۔ بنا نمود، این عمارت خیر امیر معصوم نامی بکری بن سید صفایی ترمذی از برای نفع

۳۔ عامہ مسلمانان. ھر کہ دراین بنا سازد لعنت خدا و پیغمبران و ملایکہ و مومنان برو باد. ۱۰۰۷ھ

یہ کتبہ میر معصوم کا اپنا نصب شدہ نہیں ہے۔ عبارت سے ظاہر ہے کہ کسی دوسرے صاحب نے ممکن ہے بہت دنوں بعد نصب کیا ہو۔ سندھ گزیٹر کے مؤلف اسمتھ (Smith) نے لکھا ہے کہ ۱۰۰۶ھ کی تعمیر شدہ یہ عمارت مسجد ہے۔ مسٹر کزنس (Cousens) نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔[۱۲] ان کا خیال ہے کہ یہ دونوں عمارتیں دراصل ایک باغ میں ہوں گی جو میر معصوم نے رفاہ عام اور تفریح کے لیے بنوائی تھیں۔ اسی میں ایک عمارت مسجد کے لیے اور دوسری آرام کے لیے بنوائی گئی تھی۔

پیر علی محمد راشدی نے تحقیق اور تلاش کے دوران معصومی خاندان کی ایک دستاویز دیکھی جس سے پتا چلتا

ہے کہ "۹ تاریخ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ میں میر سید معصوم اور ان کے صاحب زادے میر بزرگ نے ایک باغ سکھر کے قاضی فخر الدین مرحوم کے خلف سے ایک سو ٹنکہ میں خریدا جو کہِ سادہ بیلا کے سامنے ہے"۔

مشرق: باغ اور سرائے عشرت میر معصوم

مغرب: اراضی سعادت سلطان بیگم میر یار حسین جلایر

جنوب: عام راستہ

شمال: دریائے پنجاب

دستاویز پر قاضی علی بن اسماعیل وغیرہ کی مہریں ہیں۔

اس دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی اراضی میں قاضی فخر الدین کے باغ کے ساتھ میر معصوم کی "سرائے عشرت" اور ایک باغ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر نے اپنی اراضی کو کشادہ کرنے کے لیے قاضی فخرالدین کی اولاد سے یہ باغ خریدا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ لینس ڈاؤن پل تک تفریح گاہ تھا۔ سادہ بیلا، خواجہ خضر کا آستان میر معصوم کا سیتاسر دریا کے اندر اور کنارے کے ساتھ یہی باغات اور سرائے، دریا کی دوسری طرف ساتھ ہی روہڑی شہر ہے۔ میر معصوم کی عید گاہ، ابوالقاسم نمکین کا صفہ صفا (ستیوں کا آستانہ) اور باقی سارا کنارا "چہار باغ" سے سرسبز و شاداب اور آگے اروڑ کا شہر، جہاں کی زمین تربوز اور خربوزے کے باغات کے لیے مشہور اور معروف ہے۔ یہ رونقیں دیکھ کر میر نمکین نے صفہ صفا کا چبوترہ دریا کے کنارے تعمیر کروایا۔ جس کے اوپر بیٹھ کر چاندنی راتیں گذارتا تھا۔

آج ان سب تاریخی آثار میں سے سادہ بیلا، خضر کا آستانہ، صفہ صفا، عید گاہ اور منزل گاہ کی دو عمارات ایک احاطہ میں ویران موجود ہیں نہ وہ رونق ہے اورنہ وہ فضا۔

۸- جہاز نما مسجد (۱۰۰۷ھ)

مظہر شاہجہانی کے مصنف لکھتے ہیں کہ سکھر کی طرف دریا کے کنارے پر سیتاسر کے گنبد کے سامنے ایک دوسری پہاڑی پر میر معصوم نے جہاز نما مسجد تعمیر کروائی تھی جو نہایت خوب صورت جگہ پر واقع تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے پتھر کی سیڑھی تھی۔ لوگ اس کے ذریعے دریا کے پانی سے وضو کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ عید کے دن خاص طور پر بکھر اور سکھر کے باشندے وہاں آکر جمع ہوتے تھے۔۱۵

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد اس کے علاوہ تھی جسے منزل گاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

۹- سیتاسر یا ستیاسر (۱۰۰۷ھ)

ذخیرۃ الخوانین کے مصنف نے جس سیتاسر یا ستیاسر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''روئے زمین پر اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔'' اسی کے متعلق موجودہ دور کا انگریز مؤرخ بلاخمن، ''آئین اکبری'' کے ترجمے میں لکھتا ہے کہ:

> ''بکھر بستی ہے، جس کے بیچ میں میر معصوم نے ایک گنبد تعمیر کروایا تھا جس کا نام ''سیتاسر'' رکھا گیا''۔

اس مؤرخ کا مأخذ مآثر الامراء ہے۔ اس سے زیادہ انھوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی گنمد کی عمارت کی تاریخ ''گنبد دریائی'' (۱۰۰۷ھ) سے نکلتی ہے۔

مظہر شاہجہانی (۱۰۴۰ھ) سیتاسر بننے کے ۳۳ سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس میں بکھر کی دلچسپ جگہوں کا

کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"در مغرب رویہ قلعہ، پا کروهی، کوهی مسطح درمیان دریا افتادہ و در آنجا چند درخت خرما ویک گنبدی واقع است . آن کوہ را "شاد بیلہ" می گویند".

یہ تصویر اس سادہ بیلا کی ہے جو بعد میں ہندؤں کا ہبی آستان بنا اس کے اندر متعدد عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ورے ہندوستان کا مذہبی تیرتھ شمار کیا جانے لگا۔ عصوم کے دور میں یعنی اکبری عہد سے لے کر شاہجہان زمانے تک یہاں ایک گنبد اور دو تین کھجور کے درخت "شاد بیلا" شاید تفریحی نام تھا جس کے بعد "شاد" سے کر "سادہ" کیا گیا۔ جس طرح خود ہمارے دیکھتے ھتے ایک حرف کے الٹ پھیر سے کئی جگہوں اور مقامات نام بدل گئے۔ مثلاً رام باغ میں الف کا اضافہ کر کے آرام کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال وہی مصنف اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

"و پنج کروهی کوهچہ درمیان دریا بود، چنانچہ درهوای زمستان کہ آب کمی می کرد آن کوهچہ ظاهر می شد ودر موسم آب کلانی هیچ اثر آن کوهچہ ظاهر نمی شد. واکثر کشیتهایی کہ از طرف بالا می آمدند بہ آن کوهچہ دکہ ۱۶ خوردہ شکستہ، غرق می گشتند."

میر معصوم کی اپنی ایک کشتی جو وہ باہر سے ون سے بھروا کر لا رہے تھے جو وہاں آکر اس پہاڑی سے ا کر ڈوب گئی۔ جس سے متاثر ہو کر میر معصوم نے وہاں ان تعمیر کروانے کی ضرورت محسوس کی اور انھوں نے یہ

گنبد تعمیر کروایا۔ جسے ملاح دور سے دیکھ کر اپنی کشتیوں کو موڑ دیتے تھے۔ مظہر شاہجہانی کے مصنف لکھتے ہیں:

"گنبد سبزی بالا یش عمارت ساختہ "سیتاسر" نام نہادہ وعجب جای خوشنما شدہ، اکثر مردم بہ طریق سیر آنجا می روند، و محظوظ می گردند، و کشتی ہم آنجارا دیدہ درطغیان آب بہ ملاحظہ می گذرد."[۱۷]

اس وقت اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ سادہ بیلا سے مشرق کی طرف لینس ڈاؤن پل کے پاس یہ گنبد تھا جو اپنے دور میں پنجاب سے آنے یا جانے والی کشتیوں کے لیے لائٹ ہاؤس کا کام دیتا تھا۔

۱۰۔ جیسلمیر کی رفاہی جگہ (۱۰۰۸ھ)

کتبات کے باب میں جیسلمیر کے کتبے نقل کیے گئے جن میں سے ایک کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قندھار سے لوٹتے ہوئے ۱۰۰۸ھ میں میر معصوم جیسلمیر کے راستے سے دربار میں پہنچا۔ میر کی آمدو رفت کا یہی راستہ تھا۔ وہ اس مرتبہ چودہ دن وہاں کے راجا راول کے ہاں مہمان ٹھہرے اور وہیں ایک رفاہی جگہ تعمیر کروائی جس کی تاریخ "بنای دل پزیر" ہے۔ میر بزرگ کا یہ کتبہ وہیں موجود ہے:

"از خدمت قندھار طلب فرمودہ بودند، درحین نزول بدین مقام بنای این بقعۂ خیر نہاد..."

جگہ منہدم ہو گئی ہے جس کے چند کتبے اس وقت حکومت کی تحویل میں ہیں۔ جنھیں مولوی مراد علی نے نقل کیا ہے[۱۸]۔ راقم الحروف کو جناب مالک رام نے کتبوں کی نقل بھیجی تھی۔

۱۱۔ مسجد اور اطاق قندھار؟

میر معصوم نے اپنے خاندانی بزرگ سید شیر قلندر کے مزار پر بطور یادگار ایک مسجد اور اطاق تعمیر کروایا ہے جو اب تک موجود ہے۔ دس کوس مغرب کی طرف قندھار سے دور سکلیچہ پہاڑی (سپیروان) پر نہایت خوب صورت اور دلکش منظر ہے۔[۱۹]

۱۲۔ حویلی، باغ، مسجد؟

"ذخیرۃ الخوانین" کے ذریعے جس حویلی، مسجد اور باغ کا پتہ چلتا ہے، اس میں سے کوئی آثار آج تک موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارات معصومی سادات کے محلے میں کسی جگہ یا حویلی میں آگئی ہے آج ان عمارات کی جائے وقوع کی نشاندہی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح باغ چوبیس ایکڑ میں تھا وہ بھی برباد ہو گیا اور وہ پھول پودے سب اجڑ گئے جن کے لیے شیخ فرید نے لکھا ہے کہ:

"گلہا و درختہای میوہ دار نشاندہ کہ تفرج عالم است۔"

۱۳۔ ہشت پہلو گنبد اور ہفت چاہ سکھر:

پرانے سکھر سے نئے سکھر کی طرف جاتے ہوئے جیل کے پاس گنبد سے ایک ہشت پہلو عمارت ہے۔ روایت ہے کہ اس کے چاروں طرف سات کنوئیں تھے، جہاں یقیناً باغات ہوں گے اس وقت عمارت ویران، کنوئیں نابود، زمین اور عمارت پر جعلی لوگوں کا قبضہ ہے۔ انگریزوں نے اس عمارت کو تیل کے گودام کے لیے استعمال کیا تھا۔ بقول پیر علی محمد راشدی، خاندانی روایت کے مطابق اس عمارت پر کتبہ تھا جو بعد میں گم ہو گیا۔ عبارت وہی ہے جو منزل گاہ کے کتبے پر ہے:

"بنای این بقایه خیر نهاد، امیر معصوم نامی بکری جهت سیر و استراحت وارد و صادر و مقیم مسافر، هر که درین بناء مقبره کند لعنت خدا و پیغمبران و ملائکه و مومنان بروباد."

ظاہر ہے کہ یہ کتبہ بعد میں خاندان کے کسی فرد نے عمارت پر نصب کروایا ہے۔ یہ عمارت اصل میں اسی تفریح گاہ میں نشست کے لیے تعمیر کروائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرز پر ہشت پہلو عمارت ہم نے سمر قند میں ایسے گنبد کے ساتھ "ریگستان" کے علاقے میں مرزا الغ بیگ کے مدرسے کی پشت کے ساتھ دیکھی، عجیب اتفاق ہے کہ وہی طرز تعمیر ہمارے یہاں سکھر میں آیا۔ ماوراء النہر کی طرز تعمیر اور سندھ کی تعمیرات میں متعدد مشترک نشانیاں موجود ہیں۔

عمارت کی جو حالت ہے یا جس طریقے سے اس پر قبضہ ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ یہ تاریخی عمارت تباہ ہو جائے گی۔ محکمہ آثار قدیمہ کب بیدار ہو گا کہ اس تاریخی ورثہ کی حفاظت کر کے اپنا فرض منصبی پورا کرے۔

متفرق آثار:

میر معصوم ہندستان اور قندھار کی سیر کرتے رہے اور جہاں جہاں گئے وہاں کتبہ یا عمارت، مسجد یا مسافر خانہ بطور یادگار چھوڑتے گئے۔ ظاہر ہے کہ اِس وقت تک بہت سے یادگار تباہ ہو گئے ہوں گے اور اگر کچھ باقی ہوں گے تو ان کا ہمیں علم نہیں۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء کو معصومی سادات نے ثابت علی شاہ کو سرداری کی دستاربندی کے شرف کا جو جلسہ منعقد کیا اس میں سید نور علی شاہ معصومی

نے خطبہ استقبالیہ میں کچھ تاریخی جگہوں کا ذکر کیا لیکن درحقیقت یہ صرف خاندانی روایات ہیں اور ان کا دارومدار سنی سنائی باتوں پر ہے۔ بہت سی جگہوں کو میر کی طرف سے منسوب کیا گیا حالانکہ وہ میر معصوم کی تعمیر کردہ نہیں ہیں۔ مثلاً اٹک کا قلعہ، جہلم کا پل، گجرات میں ایک مینار اور تین مساجد (مسجد دلکشا، مسجد اقصیٰ، مسجد اکبری) اور وزیر آباد کے کچھ یاد گار۔ اس سلسلے میں سید نور علی شاہ مرحوم نے تزک جہانگیری، آئین اکبری اور تاریخ فرشتہ کا نام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں مذکورہ بالا کسی یاد گار کا ذکر نہیں ہے۔ سید میر نور علی شاہ نے شکارپور کے قلعے کے لیے کہا کہ یہ میر معصوم کا تعمیر کروایا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکبر کے دور میں نہ تو شکارپور کا وجود تھا اور نہ ہی وہاں کوئی قلعہ موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کسی حصے کی شہر پناہ کے متعلق یہ گمان کیا گیا ہو جو کچھ دیوار ہونے کے سبب کب کی منہدم ہو کر تباہ ہو گئی۔

بہرحال یہ یقین ہے کہ معلوم یاد گاروں کے علاوہ میر معصوم نے کئی یاد گاریں چھوڑی ہوں گی۔ افسوس کہ ہمیں ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

(۱۰-۸-۱۹۷۸ء)

حواله جات

۱ـ ذوق عمارات بسیارد اشت و خود کتبه نویس خوش خط بود. از ابتدا ایروان و نخجوان و تبریز، و اصفهان تا قندهار و کابل و کشمیر و هندوستان و دکن هر جا رسید از اشعار خود نوشته وبرسنگ کنده یادگاری گذاشت.'' (۱:۲۰۳)

۲ـ اکثر جا مساجد و سرا و رباط و پل و چاه آب و باولی بنا کرده، خصوصاً شهر سکر - که وطن اصلی او است- اورا از عمارات عالی و درخت های بر وغیره زیورها پوشانیده، و درمیان دریای پنجاب که در گرد و پیش قلعه بکر جاری است، عمارتی ''سیتاسر'' نام بنا نهاد که در روی زمین نیست. تاریخ اورا ''گنبد دریایی'' یافته (۱۰۰۷هـ) و گورخانه خود را بالای کوهی که مشرف به باغات و دریای پنجاب است، آنچنان ساخته که در عالم به مثل وی نشان نمی دهد. اولاً مناره مرتفع که مناره مانند در دهلی یك کهنه یعنی یك حصه اوسی توان گفت، سربه فلك کشیده از بیست کروه نمایان است و متصل او گنبد مطبوع، اگرچه خشت پخته است اما گویا ریخته است. و در جوار چوکندی از سنگهای کلان که تا دور قیامت انهدام ندارد، درست کرده مقابر پدر و برادر خود زیر آنها نموده، و آیات و احادیث که مدل به مغفرت است، بالای قبر خود در آن گنبد به خط کتبه کنده و برتعویذ قبر نودونه نام باری تعالیٰ نوشته، شصت سال ازین عمارت گذشته است

رخنه و درزی راه نیافته......" (۱:۲۰۴)

۳۔ اما در عمارت حویلی دست تصرف را کوتاه داشته مثل عمارت سائر الناس کرده، می فرمودند که: بر عمر اعتماد نیست بعد از وفات من مبادا آن حویلی نزولی شود، الاسر دروازه خانه خود، متصل مسجد پدر، باغیچه در اراضی بیست بیگه راست ساخته، گلها و درخت های میوه دار رانشانده که تفرج عالم است." (۱:۲۰۴)

۴۔ رباعیات پڑھتے وقت نقشے کو سامنے رکھا جائے۔

۵۔ شروان (شاوران) دارالخلافہ کے شہر کا نام ہے۔ ارمنستان میں وہ شہر تھا جہاں کی شہنشاہی کو شروانشاہ کہا جاتا تھا۔ عرب اور ایرانی حکمران رہے ہیں، ان کا زمانہ ۹۰۱-۱۱۷۴ تک رہا۔

۶۔ نقشے میں اشعار کی جگہ دیکھنی چاہیے۔

۷۔ نقشہ دیکھنا چاہیے۔

۸۔ ان کتبوں کی نقل مولانا شفیع مرحوم کی کتاب "صنادید سندھ" کے ص ۳ سے ص ۸ تک دیکھنی چاہیے۔

۹۔ جلال الدین محمد اکبر پادشاہ مبلغی گرانقدر برای نذر حرمین فرستادہ بود، پس آمدہ، میر معصوم حسب الامر شاھی ازان مبلغھا نشیمنھای پاکیزہ و منارہ معروضہ یادگاری درو ترتیب دادہ. (۳:۱۲۴، مطبوعہ قدیم)

۱۰۔ ہیوز گزیٹر، ص ۸۲۷، سکھر گزیٹر، ص ۹، کزنس، ص ۱۵۱ وغیرہ۔

۱۱۔ ۱۰۱۳=۱۹۵۲

۱۲۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر، ص ۵۹۔

۱۳۔ تحفة الکرام، مخدوم امیر احمد، ص ۲۷
۱۴۔ اینٹی کئٹیز آف سندھ، ص ۱۵۴
۱۵۔ محاذی این گنبد به طرف سکر بالای کوه جنب دریا مسجدی به صورت جهاز راست کرده. بسیار جای باصفا شده. به طرف دریا زینهای سنگ بسته که از آنجا مردم فرود آمده وضو سازند. روزهای عید تماشاگاهِ خلایق بکر و سکر است. (ص:۴۔۵)
۱۶۔ یہ مقامی لفظ سندھی زبان کا (ڈِھکو) استعمال کیا ہے۔
۱۷۔ مظہر شاہجہانی، ص ۴۔
۱۸۔ یادگار مراد علی از مولوی مراد علی، مطبع چراغ راجستان اجمیر ۱۳۱۶ھ، ص:۳۰۸، ان کی نقل کراچی کے ایك اردو رسالے تنویر میں شائع ہوئی تھی۔
۱۹۔ مقالہ میر معصوم ''پروفیسر عبدالحئی حبیبی'' آریانہ سال ۴ ش ۶ ص:۳۸۔

باب ۔ ۲۵

اولاد

سید صفائی نے کھابروٹی سادات میں شادی کی تھی۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے ان کی اولاد کا ابتدائی نقشہ اس طرح ہے۔

سید صفائی (المتوفی: ۹۹۱ھ)
- میر ابوالقاسم (المتوفی: ۹۹۱ھ)
  - میر شجاع
- میر فاضل
  - بیٹی (زوجہ میر شجاع)
- میر معصوم
  - میر بزرگ
    - میرزا قندھاری
    - دختر (زوجہ، خواجہ محمد چشتی)
    - محمد زکریا

میر معصوم کے بھائیوں اور خاندان کے دوسرے قابل ذکر اشخاص کا بیان ہم آئندہ باب میں کریں گے یہاں صرف میر مرحوم کے صاحبزادے میر بزرگ اور ان کی اولاد کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ ''ذخیرۃ الخوانین'' اور ''تحفۃ الکرام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ میر بزرگ کے دو فرزند تھے جن میں سے مرزا قندھاری کا نام صرف ذخیرۃ الخوانین نے دیا ہے۔ تحفۃ الکرام کی تحریر کے مطابق میر بزرگ کی اولاد کا سلسلہ اس طرح بنتا ہے جسے ان کے احوال کے مطالعہ سے قبل ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

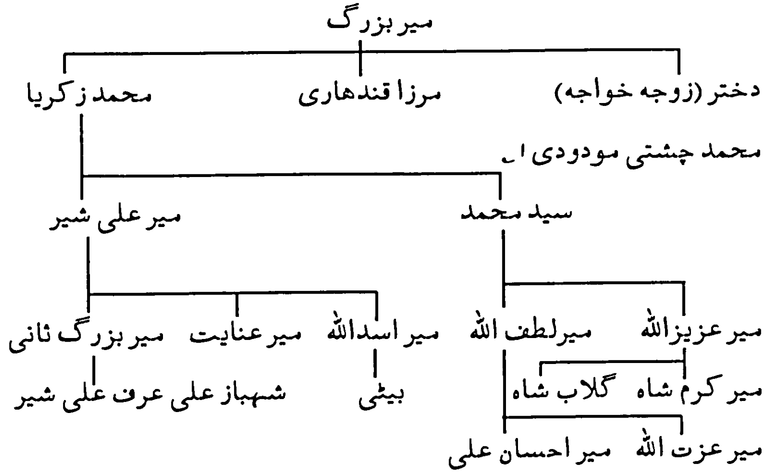

مذکورہ بالا خاندان میں میر بزرگ مشہور ہوئے۔ ان کا تفصیلی احوال دینے سے پہلے متذکرہ سلسلے کے متعلق تحفۃ الکرام کے مؤلف نے جو کچھ لکھا اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے کیوں کہ اپنے دور تک کی دو صدیوں کے عرصے میں خاندان کے متعلق تحریری صورت میں صرف یہی مواد ملتا ہے۔

میر محمد زکریا کے لیے میر قانع کا قول ہے کہ وہ ظاہر و باطن کے بڑے بزرگ تھے۔ انھوں نے شاہ خیرالدین سے عقیدت کے باعث اپنی زندگی پرانے سکھر میں سکونت کر کے گذاری۔

مذکورہ بالا قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا محمد زکریا سے پہلے سید صفائی سے لے کر میر بزرگ تک سکھر اور بکھر کے کسی بھی محلے میں اس خاندان کی مستقل سکونت نہیں تھی اور محمد زکریا پہلے شخص ہیں جنھوں نے پرانے سکھر میں رہائش اختیار کی حالانکہ یہ روایت

درست نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ محمد زکریا کہیں اور جانے کے بجائے خیر الدین کی خانقاہ میں مقیم ہوگئے اور تاحیات اسی سے منسلک رہے۔ گویا آپ کا خاندان میر معصوم سے بھی پہلے ہی پرانے سکھر میں رہائش کرچکا تھا۔

سید محمد علی شیر، سید محمد بزرگ:

مذکورہ بالا میر زکریا کے دو فرزند ہوئے۔ میر قانع کی عبارت مبہم ہے۔ لکھتے ہیں: ”ایضاً دوپسر والا گذاشتہ“

میر عزیز اللّٰہ۔ میر لطف اللّٰہ:

مذکورہ بالا فقرہ سے یہ صریحاً پتا نہیں چلتا کہ یہ دونوں سید کس فرزند کی اولاد تھے۔ میر عزیز اللّٰہ کے لیے میر قانع نے ”عزیز مصر“ کی تلمیح استعمال کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ: میر کرم شاہ۔ میر گلاب شاہ نامی دو فرزند تھے جو تحفۃ الکرام کی تالیف (۱۱۸۱ھ) کے وقت زندہ تھے۔

میر لطف اللّٰہ:

سید محمد بزرگ کے فرزند تھے جن کے دو بیٹے تھے۔

میر عزت علی۔ میر احسان علی:

یہ دونوں فرزند میر قانع کے زمانے (۱۲۰۳ھ) تک موجود تھے۔

میر علی شیر:

میر محمد زکریا ولد میر بزرگ کے بڑے فرزند، بڑی عزت و احترام والے سید گذرے ہیں ان کے تین بیٹے میر اسد اللہ، میر عنایت اللہ اور میر بزرگ ثانی ہوئے۔ جن کی

زندگیاں بخیر و خوبی گذریں۔ بعد کے میر بزرگ ثانی میر شہباز علی عرف میر علی شیر نامی بیٹے ہوئے جو میر قانع کے دور میں تھے۔

میر اسد اللّٰہ ثانی:

مذکورہ بالا میر اسد اللہ ولد میر علی شیر ولد میر زکریا ولد میر بزرگ اول کے نواسے میر اسد اللہ ہوئے جن کی استعداد علمی کی تعریف میر قانع نے کی ہے۔

سید خود مراد یاب خان ولد میاں نور محمد والی سندھ کے پاس مراد آباد میں رہتے تھے۔ جہاں میر قانع کی ان سے ملاقات ہوئی۔ شاعری میں ''آرزو'' تخلص رکھتے تھے۔ نام کی مناسبت سے میر قانع نے ان کی سجع لکھی: ''اسد اللّٰہ ساقی کوثر'' [۲]۔

مقالات الشعراء میں لکھتے ہیں کہ حکیم یعقوب خان سے ان کی دوستی تھی اور دونوں ساتھ رہتے تھے۔ وہ وضعدار سید زادہ تھے۔ ٹھٹھ بھی گئے جہاں میر قانع سے ملے۔ میر قانع نے بطور نمونہ ان کا ایک شعر دیا:

مست گردم زبادۂ کوثر اسد اللّٰہ ساقیم باشد [۳]

میر بزرگ:

میر معصوم کے بعد، خاندان میں نام آور اور مشہور شخصیت کے مالک، میر بزرگ مشہور ہوئے جنھوں نے اپنے والد کے بعد نہ صرف مغل دربار میں بلکہ اپنے دور میں بھی خاصی اہمیت حاصل کی۔ ان کی بود و باش امیرانہ تھی۔ میر معصوم نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جیسا کہ شیخ فرید بکھری کا قول ہے۔ [۴] میر معصوم نے تاریخ معصومی بھی اسی بیٹے کے لیے لکھی اور ان کے نام

منسوب کی تاکہ میر بزرگ کی ذہنی تربیت ہوسکے۔ میر دیباچے میں لکھتے ہیں:

"...آخر اس وقت آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک میر بزرگ اللّٰہ تعالیٰ انھیں صالح بنائے، اس کتاب کے لکھنے کا سبب بنے اور میں یہ اوراق لکھنے پر آمادہ ہوا تاکہ میربزرگ ان لوگوں کے احوال کے مطالعہ سے، جو تربیت یافتہ تھے اور انتقال کرچکے تھے، خود اعلیٰ تربیت حاصل کرے اور نفع، نقصان اور خیر و شر کے نتائج سے واقف ہوں اور ہوشیار بنیں اور تجربہ کار، نیک سیرت اور بااخلاق بزرگوں کے طور طریقوں سے فائدہ حاصل کریں اور ذلیل اور بے ہودہ عادات والے لوگوں کی صحبت اور قربت سے گریز کریں۔ ص:۳۷"۵۔

میر بزرگ کی تعلیم و تربیت، اپنے والد کی خاص نگرانی میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ میر معصوم نے اپنے اکلوتے فرزند کی تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی۔ ان میں وہی علمی و تمدنی خوبیاں موجود رہی ہوں گی جو ان کے والد میں موجود تھیں۔ خطاط تھے، شاعر تھے، بہادر اور سپاہی منش تھے لیکن مزاج امیرانہ تھا۔ اپنے والد کی طرح ان کا مزاج تاریخی تھا۔ یہ بات ان کے کتبوں سے ظاہر ہوئی ہے۔ ان کی خوش خطی کی تعریف ان کے معاصر شیخ فرید بکھری نے بھی کی ہے۔۶۔

جہانگیر کے دور میں شاہی ملازمت میں تھے غالباً اپنے والد کے ہی دور میں انھیں یہ ملازمت ملی کیوں کہ جہانگیر کے بیٹے خسرو نے جب اپنے والد کی تخت نشینی

کے وقت ان سے بغاوت کی اس وقت میر بزرگ شاہی ملازمت میں تھے۔ ایک مرتبہ سرکاری فوج کے ایک دستے نے انھیں ہتھیار بند حالت میں سرِ راہ پکڑ لیا اور کوتوال کے سامنے پیش کیا۔ سپاہیوں کا خیال تھا کہ یہ بھی خسرو کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ معاملہ بہت نازک تھا اس لیے جہانگیر کے دربار میں پیش کیا گیا۔ میر بزرگ نے خسرو کی حمایت سے انکار کیا۔ جہانگیر نے ہتھیار بندی کا سبب پوچھا تو میر نے عرض کیا کہ والد کی وصیت ہے کہ "شاہی کیمپ میں پہرے کے دوران خادم کو ہمیشہ مالک کی حفاظت کے لیے ہتھیار بند رہنا چاہیے جس وقت مجھے گرفتار کیا گیا اس وقت میں پہرہ پر تھا اس لیے مسلح ہونا ضروری تھا"۔ چوکی کے واقعہ نویس نے تصدیق کی اور اس طرح میر بزرگ کی جان بچ گئی۔ ۷؎ اور انھیں آفرین کہا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر معصوم کے آخری دور میں جب میر بکھر لوٹ آئے تو اس وقت میر بزرگ جہانگیر کی ملازمت میں تھے۔ یہ واقعہ ۱۰۱۴ھ کے آخر یا ۱۰۱۵ھ کی ابتداء کا ہے کیوں کہ خسرو ۸/ ذی الحج ۱۰۱۴ھ میں آگرے سے بغاوت کر کے فرار ہوا اور جہانگیر اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے، خسرو ۳ صفر ۱۰۱۵ھ کو گرفتار ہو کر لاہور میں اپنے باپ کے روبرو پیش ہوئے۔ ۲؎ میر معصوم کا انتقال، خسرو کے فرار ہونے کے دو دن پہلے یعنی ۶ ذی الحج ۱۰۱۴ھ میں ہوا۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ میر معصوم کا انتقال اچانک کسی بیماری کے سبب ہوا جب کہ بادشاہ خسرو کی بغاوت کے سبب آگرہ اور لاہور کے درمیان کسی منزل پر تھا اور میر بزرگ ان کے ہم رکاب معلوم ہوتے ہیں۔

مغل قوانین کے مطابق امیروں کی وفات پر ان کی ملکیت بحق سرکار ضبط کرلی جاتی تھی اور ان کے بعد ضرورت ہوتی تو پورا یا اس کا مناسب حصہ اس کے وارثوں

کو نئے سرے سے دے دیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر معصوم کی ملکیت کسی قانون کی زد میں نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ میر بزرگ نے امیرانہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کی۔

میر بزرگ کے ساتھ مذکورہ بالا واقعہ ۱۰۱۴ھ کے آخر یا ۱۰۱۵ھ کے پہلے مہینے میں پیش آیا اور چند مہینوں کے بعد انھیں بخشی کے عہدے پر قندھار روانہ کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر بزرگ جہانگیر کی نظر میں قابل اعتماد تھے۔ ورنہ قندھار جیسی نازک مہم پر یقیناً کسی قدیم ملازم کو روانہ کیا جاتا۔

خسرو کی بغاوت کے بعد جہانگیر کے پہلے سال میں دوسرا مسئلہ قندھار میں ایرانی حملے کا پیش آیا جس سے مغل گورنر شاہ بیگ بہت مجبور ہو گئے اور بادشاہ نے لاہور سے خسرو کی بغاوت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مرزا غازی ترخان کے ماتحت ان کی طرف فوجی کمک روانہ کی۔ جیسا کہ ذخیرۃ الخوانین کا قول ہے کہ میر بزرگ مرزا کے دستے میں بحیثیت بخشی ہو کر وہاں گئے۔۹۔

میر کے وہاں جانے کی تاریخ کا تعین ان کے مندرجہ ذیل کتبے سے ہوتا ہے جو انھوں نے دوران سفر ڈیرہ غازی خان لغاری کے تحصیل میں یارکان (پشین روڈ) کے ایک مقبرے پر نصب کیا ہے۔ کتبے کی عبارت ہے:

> "بہ تاریخ هفدهم ماه رمضان ۱۰۱۵ھ بہ حکم بندگان حضرت نورالدین محمد جهانگیر بادشاه غازی به کمک قندهار تعین شده بود. ازین منزل عبور نموده. میر بزرگ ابن نواب مرحومی میر محمد معصوم بکری المتخلص نامی" ۱۰۔

اس کتبے سے نہ صرف میر بزرگ کی روانگی کا علم ہوتا ہے بلکہ اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ:

الف۔ میر بزرگ اپنے والد کی زندگی میں شاہی ملازمت میں آئے۔

ب۔ لاہور میں جہانگیر کے ہم رکاب ہوئے، والد کی وفات ان کی غیر حاضری میں ہوئی۔

ج۔ بادشاہ خسرو کی بغاوت سے ۳ صفر ۱۰۱۵ھ کو فارغ ہوئے اور وہیں انھیں قندھار کے معاملے کی اطلاع ملی۔ بادشاہ نے مرزا غازی کے ساتھ میر بزرگ کو بھی حکم صادر کیا۔ دونوں سندھ کے تھے، نوجوان تھے، مزاج میں یکسانیت تھی اور غالباً بادشاہ نے اسی لیے منتخب بھی کیا۔

د۔ میر بزرگ نے خسرو کی گرفتاری کے بعد سات مہینے تیرہ دن پنجاب اور سندھ میں گذارے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت ختم ہونے اور قندھار کا حکم صادر ہونے کے بعد سکھر میں آئے اور والد کی وفات کے بعد پیدا شدہ مسائل کو نمٹا کر قندھار روانہ ہوئے۔

کتبے میں میر بزرگ نے والد کے لیے مرحوم کا لفظ لکھا ہے جو خاص اہمیت کا حامل ہے۔[۱۱]

میر بزرگ کے مزاج اور بودوباش کا جو نقشہ "ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف نے کھینچا ہے اس سے ذہن میں مندرجہ ذیل تصویر ابھرتی ہے:

- باپ کی جمع شدہ ملکیت کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہے۔
- ہمیشہ گردن اونچی رکھی، غرور و تمکنت کے سبب کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔
- ملازم بہت تھے جن کو امیرانہ ٹھاٹھ حاصل تھے۔
- کسی بھی صوبہ دار یا سرکاری افسر سے، بنا کر نہ رکھی اور نہ ہی کسی سے غرض تھی۔

- ہر قسم کا نشہ کرتے تھے اور زیادہ مقدار میں کرتے تھے۔
- طبیعتاً تیز بلکہ کسی حد تک سخت مزاج تھے۔
- باپ کے ملازموں کے ساتھ سختی کی۔ انھیں قید میں رکھتے اور کوڑوں سے مارتے تھے۔
- لباس، نشست و برخاست، دستر خوان اور خوراک میں نہایت لطیف اور نازک طبع تھے۔[۱۲]

قندھار میں میر کافی عرصہ (۱۰۱۵-۱۰۲۲ھ) رہے۔ مرزا کے سوا کئی صوبہ دار اور امیران کے دور میں وہیں آئے۔ مثلاً

سردار خان، بہادر خان، ابوالنبی اوزبک، قزاق خان، باقی بیگ اوزبک وغیرہ

میر بزرگ ان سب کی موجودگی میں ایک ہی طریقے اور انداز سے چلتے رہے۔[۱۳] نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی اور نہ کسی کی غلامی کی۔ صوبے دار کا اگر اپنا رعب تھا تو ان کا دبدبہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ بادشاہ کے علاوہ کسی اور کی بالادستی قبول نہ کرتے تھے۔ اگر تھوڑا بہت کسی کا لحاظ کیا بھی، تو وہ مرزا غازی ترخان تھے۔ وہ بھی ہم وطنی اور ہم مشربی کے سبب۔ کیوں کہ دونوں شوقین مزاج، سخی اور دل کے کشادہ تھے۔ بادشاہ نہیں تھے لیکن مزاج شاہانہ تھے۔ مرزا غازی بڑے شاہ خرچ تھے۔ قندھار میں جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی تو میر بزرگ سے قرض لیتے، جیسا کہ تاریخ طاہری کے مصنف نے لکھا ہے جو اسی دور میں مرزا سے منسلک تھے اور دونوں نوجوانوں کے مزاج سے واقف تھے۔[۱۴]

میر بزرگ قندھار سے کب لوٹے، اس کے متعلق صحیح علم نہیں ہے لیکن اندازے کے مطابق مرزا غازی ۱۰۰۱ھ میں فوت ہوئے۔ میر بزرگ اس کے بعد تبدیل ہوئے ہوں گے۔

قندھار کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ میر بزرگ شاہی دربار میں پہنچے تو، اس وقت بادشاہ کی منزل شادی آباد مانڈو میں تھی۔ وہیں انھیں دکن میں تقرری کا حکم ملا۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف لکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ (متمادی ایام) وہیں ٹھہرے ۱۵۔ لیکن جاگیر کی پیداوار سے اس کا خرچ پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے استعفیٰ دے کر گاؤں واپس آگئے اور اپنے والد کی املاک سے اپنا گذر اوقات کرنے لگے۔۱۶۔

میر بزرگ ذہین، ادیب اور سخن سنج تھے۔ نظم و نثر دونوں پر عبور رکھتے تھے۔ افسوس کہ ان کا شعری مجموعہ بھی ان کے والد کے دیوان کی طرح ہم تک پہنچ نہ سکا۔ "مقالات الشعراء" میں آپ کا ایک شعر نمونے کے طور پر درج ہے۔ میر اور مقالات کے درمیان کم و بیش ڈیڑھ سو برس کا فرق ہے گویا ان ہی کے زمانے میں باپ بیٹے دونوں کا کلام نایاب ہوچکا تھا۔ میر قانع نے انھیں صاحب فکر رسا اور ذکی طبیعت کہا ہے۔۱۷۔ شعر یہ ہے:

دوش سود ای سرِ زلف کسی کرد گذر
سحر ازھر سرمو، حلقہ بہ پایم پیچید

والد کی وفات کی تاریخ میر بزرگ کی اپنی بیان کردہ ہے جس طرح گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ کتبوں میں آپ کی بیان کردہ دوسری تاریخیں موجود ہیں جو کتبوں کے تحت دی جا رہی ہیں۔

کتابوں اور خاندانی روایتوں سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ میر بزرگ کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ آپ کے ایک بیٹے مرزا قندھاری کی اولاد کا سلسلہ معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ بیٹا، جن کے نام کے بارے میں میرا خیال ہے۔ قندھار میں (۱۰۱۵-۱۰۲۲ھ) پیدا ہوئے۔ "ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف لکھتے ہیں کہ "دہ سواری منصب پر ٹھٹھہ میں تعینات ہیں۔ آپ کا گذر اوقات والد اور دادا کی املاک سے ہوتا ہے۔

آنکھوں میں حیا تھی، اہلیت رکھتے تھے، بہادر انسان تھے۔۱۸؎ ان کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "ذخیرہ" کی تالیف کے وقت (۱۰۶۶ھ) زندہ تھے۔ ان کی بیٹی خواجہ محمد مودودی چشتی کے نکاح میں آئی جو سلطان مودود کی اولاد میں سے تھے اور ان کے خاندان کی پیری مریدی شال (کوئٹہ) اور مستونگ کے بلوچوں اور پٹھانوں میں تھی۔ قندھار کے صوبہ دار بہادر خان سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ کیوں کہ انھوں نے ایران کے بادشاہ کو قندھار دینے کی سازش کا الزام لگا کر گرفتار کرنا چاہا تھا لیکن وہ وہاں سے بھاگ کر پہلے ہی جہانگیر کے دربار میں جا پہنچا اور بے گناہی ثابت کرنے کے بعد انھیں منصب اور قندھار کی قلعہ داری سونپی گئی۔ عمر کا آخری حصہ سید پور میں گذارا۔۱۹؎

میر بزرگ کی اولاد، جنھیں "معصومی خاندان" کہا جاتا ہے یہ پرانے سکھر میں رہتی ہے۔ ان کا بڑا بیٹا میر محمد زکریا کی نسل سے ہے جن کا ذکر اوپر "تحفۃ الکرام" کی روایت میں آچکا ہے۔ "ذخیرۃ الخوانین" کے قول کے مطابق ان کے خاندان کے کچھ افراد ملتان کی جانب آباد ہوئے ۲۰؎۔ میر بزرگ کی قبر اپنے والد کی چوکنڈی میں ہے۔ قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ ذخیرۃ کی روایت کے مطابق میر بزرگ نے ۱۰۴۴ھ میں وفات پائی اور مآثر الامرا، جس کا مأخذ ذخیرہ ہے، لکھتا ہے کہ ۱۰۴۲ھ میں وفات پائی۔ ۲۱؎ آپ کی قبر بھی اندازے سے بیان کی گئی ہے۔

بہرحال، میر معصوم کے بعد، میر بزرگ وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے اپنا نام تاریخ کے اوراق میں زندہ رکھا۔ آپ کی آمدنی کے علاوہ ان کے والد کے تیس چالیس لاکھ کی نقد بھی تھی جسے انھوں نے بقول "مآثر الامراء" لٹا دیا۔ ۲۲؎

حوالہ جات

۱۔ دیکھئے ذخیرۃ الخوانین، ۲:۱۱ ۴۔ ان کے بھائی خواجہ میر کلان، دیکھئے ذخیرۃ الخوانین، ص ۲:۲ ۱ ۴۔

۲۔ تحفۃ الکرام، ص: ۱۳۱۔

۳۔ مقالات، ص ۲٦۷

۴۔ پدرش در تربیت او تقصیر نکرد.

۵۔ درعقدۂ تسویف و تاخیر می ماند، تا درین ایام که قرہ عینی و ثمرہ فوادی میر بزرگ جعلہ اللہ من عبادہ صالحین باعث تحریر و تالیف سبب تسوید و تصنیف این نمیقه گردیده علتِ غایی این و ثیقه گشت... باشد که از مطلعۂ احوال تربیت یافتگان مهدِ امکان و گذشتگان بنی نوع انسان به لوازم خیر و شر و مواد نفع و ضرر وقوف و اطلاع حاصل نمود، به حسن سیرتِ هوشمندانِ آگاه ونیکو صفتانِ بارگاه اهتدا یابد، و به سنن سنیه و اخلاق رضیه آن زمرۂ علیه اقتدا کرده، از شیوه ناپسندیدۂ اهل نخوت و غفلت و خصائل ایشان و شیمۂ ردیۂ ارباب بطالت و عطلت اجتناب و احتراز نماید، ومن اللّٰه التوفیق و العصمة و العون. (مقدمه ص:۳)

٦۔ ... خط خوب می نوشت... (۱:۴۲۰)

۷۔ ذخیرہ ۱:۹ ۱ ۴

۸۔ خسرو کے سلسلے میں دیکھئے تذکرہ امیر خانی، ص: ۳۴۔۳۵

۹۔ میر بزرگ ... بکری بخشی درخدمت ایشان (غازی)

بوده. (۲:۳۹۳)

۱۰۔ مرزا غازی ترخان اور اس کی بزم ادب، ص:۲۲۹۔۲۳۰

۱۱۔ مولانا شفیع نے واضح کتبیے کے باوجود روز روشن کی تحریر پر خیال ظاہر کیا ہے کہ میر ۱۰۱۹ھ میں فوت ہوئے۔ یعنی مولانا مرحوم کے لیے یہ بات قابل اعتبار نہ تھی کہ آگرہ سے بکھر پہنچ کر میر فوراً فوت ہوسکتے تھے۔ مذکورہ بالا کتبہ گویا قبر کے کتبیے کے بعد مزید دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۲۔ ... زرهای پدر را به اصراف خرج کرد. دماغی بهم رسانید وسر تواضع به کس فرونمی آورد. نوکر بسیار داشت و پیش قرار نگاه می داشت. و با هیچ صاحب صوبه نساخت و کیف خوردن از هر قسم به افراط رسانید و ظالم طبیعت گشت. عاملان پدر را به شکنجه کشید و توکه و غلوله به آنها می زد... در بساط و پوشاك و خوراك بسیار لطیف بود. (۲:۳۹۴)

۱۳۔ ذخیرة الخوانین، ۲:۳۹۳

۱۴۔ احوال ایشان (میرزا) به جای رسید که از سرکار سردار خان و میر بزرگ قرض آورده خرج بیوتات می ساختند... (طاہری، ص:۲۰۷)

۱۵۔ ذخیرة الخوانین، ۲:۳۹۴

۱۶۔ چون از جاگیر کفاف معیشت او نمی شد، ترك منصب و جاگیر کرده دربکر وطن خود مقیم گشته، به املاك و باغات پدر قانع گردیده نشست.

۱۷۔ طبع مذکی و فکر رسا داشته. (مقالات)

۱۸۔ سه پستی ده سوار منصب داده و تعینات تته است. اوقات گذر او بر املاك جد و پدراست. حیای چشم و اهلیت مردمی بسیار دارد... (ذخیره)

۱۹۔ ذخیرہ: ۲:۱۱۴، میرزا غازی کی وفات کا قصہ بیان کرتے ہوئے "ذخیرۃ الخوانین" کے مصنف نے مرزا خسرو چرکس کے بیٹے بھائی خان کی دعوت کا ذکر کیا ہے، جس میں مصنف اور خواجہ شریک ہوئے۔ یہ ۱۰۲۸ھ کا واقعہ ہے جو حسن ابدال میں ہوا۔ (۲:۲۳)

۲۰۔ مآثر الامراء، ۲:۳۲۸۔

۲۱۔ ذخیرہ، ۲:۳۹۴۔ مآثر الامراء نے ۱۰۴۲ھ لکھا ہے۔ (۳:۳۲۸)

۲۲۔ "ذخیرہ" نے لکھا ہے کہ میر اپنی زندگی میں تیس چالیس لاکھ کے مالک تھے جو مآثر الامراء نے ان تیس چالیس لاکھ کے متعلق لکھا ہے کہ میر بزرگ نے انھیں لٹا دیا۔ (ذخیرہ، ۱:۲۰۲، ماثر، ۳:۳۲۸)

باب نمبر ۲۶

بھائی

میر معصوم کے علاوہ سید میر صفائی کے دو اور فرزند تھے جو میر معصوم سے بڑے تھے۔ پہلے:

میر ابوالقاسم:

یہ سب سے بڑے تھے۔ بقول ملا بدایونی اکبری دربار سے انھیں احدی کے منصب پر سرفراز کیا گیا تھا۔ ملا بدایونی نے انھیں "اعظم اکابر بکھر" لکھا ہے۔ ۱ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔

۹۸۴ھ میں میر عدل امروہی بکھر کے حاکم تھے۔ اس دور میں سیوی کا جھگڑا پیش آیا۔ یہ علاقہ ویسے بھی ہمیشہ سے بکھر سرکار کے لیے دردِ سر بنا رہا ہے۔ لوگ آزاد طبع تھے کسی کے ماتحت یا محکوم رہ کر زندگی گزارنے سے گریز کرتے تھے۔ اسی لیے موقع پا کر وقفے سے بکھر سے آزاد رہنے کی تگ و دو کرتے تھے۔ اکبری دور میں بھی انھوں نے متعدد بار آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اس طرف مغل حکومت کا رعب و دبدبہ تھا۔ ان کا لشکر سندھ میں موجود رہتا تھا۔ اس لیے ہر بار سیوی کے باشندوں کو شکست کھا کر محکوم رہنا پڑتا تھا۔ ۹۸۴ھ میں جب انھوں نے بغاوت کی اس وقت میر عدل ۲ بکھر کا گورنر تھا جو ازل سے بدبخت اور سخت ظالم تھا، اُس نے اپنے بیٹے کو لشکر کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ جنھوں نے آزاد پسند قوتوں کو زیر کیا اس کے بعد ۱۰۰۳ھ میں پھر بغاوت ہوئی جس میں میر معصوم اور

سندھ و ملتان کے گورنر لشکر لے کر گئے اور بغاوت ختم کی۔ میر سید ابوالقاسم بکھری نے سیوی کی فتح کی تاریخ کہی۔
فتح سیوی شد بہ اولاد نبی [3]
۹۸۴ھ

میر ابوالقاسم نے اپنے والد ہی کے سال وفات یعنی (۹۹۱ھ) میں انتقال کیا۔ اسی وقت میر معصوم گجرات کی طرف تھے۔ والد کی چوکنڈی میں دفن ہوئے۔ میر معصوم نے تاریخ کہی جو قبر کی پائنتی کی طرف کندہ ہے۔

چو شد میر بو القاسم نیک رای
سوی دار عقبیٰ ز دار فنا
چو نامی طلب کرد تاریخ او
خرد گفت: رفتا بہ دار بقا

میر صفائی کے دوسرے بیٹے تھے:

میر محمد فاضل:

یہ میر معصوم سے بڑے اور ابوالقاسم سے چھوٹے تھے۔ یہ سید اپنے دور کے بڑے اور مشہور شاعر تھے ان کی بڑی فضیلت اور ذہانت یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ وہ نوواردوں کی دوسری پشت کے فرد تھے اور جب کہ ابھی ان کے گھر اور ذاتی محفل کی زبان فارسی تھی۔ سندھی میں کافیاں کہتے تھے جو فصیح تھیں اور عوام و خواص میں مقبول۔ [4]

یہ بزرگ کب فوت ہوئے ان کی زندگی کے اور کون سے واقعات ہیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ بہرحال ذخیرۃ الخوانین کی تصنیف سے پہلے انتقال کر گئے تھے۔ ان کی قبر بھی چوکنڈی میں کوئی ایک ہونی چاہیے جو چونے کی ہیں اور بغیر کتبے کی ہیں۔

اس سید کی صرف ایک بیٹی تھی جس کا نکاح ان کے بھتیجے یعنی میر ابوالقاسم کے فرزند میر محمد شجاع سے ہوا۔

میر معصوم چونکہ اپنی امارت اور عہدہ کے سبب اپنے دور کا بڑا آدمی تھا اسی لیے ان کی اولاد کا تھوڑا بہت ذکر کتابوں میں آیا ہے اور آج بھی سارے معصومی سادات اپنے آپ کو ان کی اولاد کہلواتے ہیں۔ میر معصوم کے بقیہ دو بھائیوں یا کم از کم میر ابوالقاسم کی محمد شجاع سے کتنی اولادیں تھیں وہ خاندان بڑھا یا ختم ہوا اس کا کچھ پتہ نہیں۔

معصومی سادات کے ہاں جو شجرے موجود ہیں ان سب کا سلسلہ نسب میر بزرگ سے جا ملتا ہے۔ اس صورت حال میں میر محمد شجاع کی نسل کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نسل آگے نہ بڑھی ہو یا میرمعصوم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس خاندان نے بھی اپنی نسل کو میر بزرگ کی نسل میں شامل کر دیا ہو۔ بہرحال، میر صفائی کے دو فرزندوں کی اولاد کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بدایونی ۲:۲۴۵

۲۔ میر عدل ۱۱ رمضان ۹۸۳ھ کو بکھر پہنچے۔ ۸ شعبان ۹۸۶ھ کو وہیں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کا بیٹا ابوالفضل انچارج ہوا۔ جس سے ۹ ذی الحج ۹۸۵ھ کو اعتماد خان نے چارج لیا۔ سید ابوالقاسم، سید ابوالحسن اور سید ابوالمعالی ان کے دوسرے فرزند تھے۔

۳۔ بدایونی ۲:۲۴۵۔

۴۔ دوم میر محمد فاضل کہ ... شعر بہ زبان سندی از قسم کافی بہ کمال فصاحت می گفت و قبولیت داشتہ. (۲:۲۰۱)

(۲۰ اگست ۱۹۷۸ء کراچی)

باب نمبر ۲۷

معصومی خاندان کے چند قابل ذکر افراد

معصومی خاندان، پرانا سکھر میں رہائش پذیر ہے۔ جہاں ان کے آباو اجداد کی سکونت تھی وہی جگہیں اور مقامات آباد چلے آ رہے ہیں۔ سب سادات زمیندار اور صاحب اثر و رسوخ ہیں۔ ان میں سے متعدد انگریزی داں سرکاری ملازمتوں میں رہے ہیں۔ انگریز کے دور میں بھی سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔

اس وقت سب سادات شیعی عقیدہ کے حامل ہیں۔ میر صفائی، میر معصوم یا میر بزرگ تک وہ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ معلوم نہیں کہ کس دور میں اور کس کے زیر اثر انھوں نے یہ عقیدہ اختیار کیا۔ خاندانی فضیلت و شرافت اور نسبی روایات کو ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ذیل میں ان چند شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو راقم الحروف نے (۱۹۳۱ سے ۱۹۶۲ء تک) دیکھا اور وہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سردار سید ثابت علی شاہ:

بن علی مردان بن میر عباس علی بن میر حسن علی بن میر شہباز علی بن میر بزرگ ثانی، اس سفید ریش بزرگ کو تمام معصومی سادات نے ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء میں ایک جلسے میں سرداری کی دستاربندی کا اعزاز عطا کیا۔ اس جلسے

میں ہم دونوں بھائی (سید حسام الدین راشدی، پیر علی محمد راشدی) شریک تھے۔ درحقیقت یہی جلسہ ہمارے ربط کا سبب بنا۔ جس سے متاثر ہو کر میرے برادر بزرگوار (پیر علی محمد راشدی) نے ''حیات معصوم'' (جنوری ۱۹۳۶ء) لکھی اور اس چھوٹے رسالے کا نتیجہ ۴۶ سال بعد ان اوراق کی صورت میں نکلا۔

سردار ثابت علی شاہ نہایت شریف، خاندانی اور وضع داری کا مجسمہ تھے۔ اس زمانے میں تقریباً ستر سال کے تھے، ان کے ایک فرزند سید رسول بخش شاہ بھی موجود تھے۔ ہمارے سکھر میں قیام کے دوران ان دونوں باپ بیٹوں نے ہم سے قربت کے تعلقات قائم رکھے۔

سید نور علی شاہ:

قدآور شخص نہایت چست اور جسمانی لحاظ سے مضبوط بزرگ تھے۔ خضاب کرتے تھے، سر پر مشہدی لنگی باندھتے تھے، شکار پور ڈویژن کے محکمہ جنگلات میں ہیڈ کلرک تھے۔ ہمارے دوست تھے، ان ہی بزرگ نے متذکرہ بالا جلسے کا اہتمام کیا اور خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا۔ اُنھوں نے ۱۹۵۳ء (۱۳۰۳ھ) میں اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔ ان کا سلسلہ نسب چوتھی پشت پر میر بزرگ ثانی سے جا ملتا ہے۔ نور علی شاہ، میر حسن علی شاہ، ہمت علی شاہ، میر حسن علی شاہ، میر شہباز علی شاہ، میر بزرگ ثانی۔

نور علی شاہ مرحوم کے تین بھائی تھے: ارباب علی شاہ چیف آفیسر، باقر علی شاہ اور اللہ ورایو شاہ۔ آپ نے تین بیٹے چھوڑے۔ ارباب علی شاہ، وارث علی شاہ اور عنایت علی شاہ۔

حاجی سید نائب علی شاہ:

یہ سید سندھی اسکول میں ماسٹر تھے۔ راقم نے انھیں

آخری مرتبہ ۹ جنوری ۱۹۶۲ء کو دیکھا۔ نیک اور سرنجان مرنج سید تھے۔ ان کا سلسلہ اس طرح ہے: نائب علی شاہ، اختر علی شاہ، مظفر علی شاہ، ہمت علی شاہ، میر حسن علی شاہ، میر شہباز علی شاہ، میر محمد بزرگ ثانی۔

سید منور علی شاہ:

میر بزرگ اوّل کے بعد، یہ خاندان کے دوسرے بزرگ تھے جنھوں نے شاہ خرچی اور عیش و عشرت میں اپنے دادا کی روایت کو تازہ کر دیا۔ نہایت خوبصورت، مناسب قد، چھریرا بدن، داڑھی صاف اور مونچھیں باریک، حسین اور دلکش رنگت تھی۔ سکھر میں آپ کی جوانی کی شہرت تھی۔ موسیقی کے ماہر تھے، کسی کے ساتھ دشمنی نہ تھی، ہمیشہ اپنی دھن میں لگے رہتے تھے۔

خاندان کے بڑے گھرانے میں سے تھے اس لیے آپ کے پاس دستاویز، سکے، مہریں اور خاندانی نشانیاں نیز بہت سی کتابیں تھیں جو لاپروائی کے سبب تباہ اور دریا برد ہو گئیں۔

ہم جب اس حسین اور صاف دل سید کو دیکھتے تھے تو ان کی ڈھلتی ہوئی جوانی دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ مال متاع کے ساتھ اپنی جوانی بھی لٹا رہے تھے، جس کی ہمیں فکر تھی۔ بالآخر غالباً دق اورسل میں مبتلا ہو کر اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔ آپ کا سلسلہ نسب میر بزرگ سے قریب ترین ہے۔ میر منور علی شاہ، غلام شاہ، میر عباس علی شاہ، حسن علی شاہ، میر شہباز علی شاہ، میر بزرگ ثانی۔

سید قوت علی شاہ:

اس دور میں خاندان کے غالباًیہی واحد سید ہیں جو زمانے کی مطابقت سے سیاست اور شہر کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ مقام پر پہنچے۔ مناسب قد، خوبصورت، کشادہ دل اور مہمان نواز ہیں۔ آپ کی رہائش سید صفائی کی مسجد سے ملحق

ہے۔ دسمبر ۱۹۵۲ء سے نومبر ۱۹۵۸ء تک سکھر میں میونسپلٹی کے صدر رہے۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۷ء تک ضلعی لوکل بورڈ کے ممبر رہے۔ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے تین اور بھائی ہیں محمد علی شاہ، سید علی شاہ اور امداد شاہ، ان میں محمد علی شاہ سب سے بڑے ہیں۔ آپ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ پوری زندگی روضہ خوانی میں گزاری۔ محرم میں سارے ہندوستان میں ان کو بلایا جاتا تھا چند سال ہوئے فوت ہو گئے۔

قوت علی شاہ کا نسب اس طرح ہے قوت علی شاہ، حاکم علی شاہ، محمد علی شاہ، حسن علی شاہ، شہباز علی شاہ اور میر بزرگ ثانی۔

میر قربان علی شاہ:

یہ سید بھی تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ پرانے سکھر میں معصومی محلے میں رہتے ہیں۔ زمینداری گذر اوقات کا ذریعہ ہے۔

سادات اور تعلیم:

موجودہ معصومی سادات تعلیم حاصل کرنے اور زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کے متعدد افراد گریجویٹ ہیں۔ مثلاً

۱۔ ارب علی شاہ، بی اے، چیف آفیسر
۲۔ وارث علی شاہ، بی اے، محکمہ ایکسائز
۳۔ اختر علی شاہ، بی اے، محکمہ ایکسائز
۴۔ پناہ علی شاہ، بی اے۔ بی ٹی، محکمہ تعلیم
۵۔ حسن علی شاہ، بی اے، محکمہ جنگلات
۶۔ اقبال حسین شاہ، بی اے

یہ صورت حال ۱۹۶۲ء تک کی ہے جس کے بعد یقیناً انھوں نے تعلیم اور زمانے کے دوسرے معاملات میں ترقی کی ہو گی۔

(۱۲ ستمبر ۱۹۷۸ء)

باب ۔ ۲۸

همکار اور احباب

میر معصوم اکبر کے اقبال مند دور اور مغل سلطنت کے عروج کے زمانے میں سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے۔ انھوں نے اپنا وقت ہندوستان کے اندر اور بیرون ملک مختلف جنگوں، مسئلوں اور معاملوں میں مصروف رہ کر گذارا۔ اس سلسلے میں اپنے عہد کے مشہور امیروں، عہدیداروں، ادیبوں اور عالموں کے ساتھ شریک کار رہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں سلطنت کے تقریباً تمام اہم اور مشہور افراد کے ساتھ شناسائی رہی ہوگی اور کچھ لوگوں سے صرف جان پہچان، کچھ سے واقفیت، کچھ سے تعلقات، کچھ سے دوستی اور قلبی روابط رہے ہوں گے۔ میر صاحب ہمہ صفت موصوف اور متحرک انسان تھے۔ اسی لیے زیادہ تر ہم ذوق اور ہم مشرب لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے، لیکن افسوس کہ ہماری تاریخیں نہ صرف میر معصوم بلکہ اس مد میں اکثر سب کے متعلق ایک سادہ ورق کی مثل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے متعلق میر معصوم اور ان کے احباب کے متعلق کہیں سے مواد نہیں ملتا۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخیں بادشاہوں، حاکموں اور بالادستوں کی جنگ جوئی اور باہمی کشت و خون تک محدود رہی ہیں۔ ان میں سماجی اور تہذیبی یا شہری زندگی کی صورت حال کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی اسی لیے ہماری گذشتہ صدیوں کا یہ پہلو بالکل تاریک نظر آ رہا ہے۔ میر معصوم جیسے دلچسپ امیر اور ادیب سے

کئی لوگوں کی دلچسپ مجلسیں اور محفلیں ہوئی ہوں گی۔ اگر تاریخوں میں وہ درج ہوتیں تو آج ہمارے سامنے اہم اور مفید معلومات ہوتیں۔

میر کے کچھ واقف کاروں کے متعلق کتابوں کے منتشر جملوں سے کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ہم ان عبارات کو یکجا کر کے یہاں ایک خاکہ تیار کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ معلومات نامکمل ہیں تا ہم اس کو بھی غنیمت سمجھنا چاہیے۔

سندھ میں میر معصوم نے جب ہوش سنبھالا۔ اس وقت شاہ حسن ارغون حکمران تھے۔ حکومت کا مرکز ٹھٹھہ تھا، لیکن بکھر چونکہ ایک سرحدی شہر تھا اس لیے جغرافیائی لحاظ سے اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ پنجاب اور ہندوستان ایک طرف اور بلوچستان، افغانستان اور ایران دوسری سرحد پر واقع تھے۔ اس لحاظ سے بکھر دوسرے دارالخلافہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ سلطان محمود بکھری جو وہاں کے صوبہ دار اور بعد میں حاکم ہوئے، اُن سے میر کے والد اور دوسرے متعلقین کے روابط تھے اور ہم وطن ہونے کے باعث گہرے تعلقات تھے۔ بلکہ ایک ضعیف روایت کے مطابق میر نے پہلی ملازمت محمود بکھری کے پاس کی تھی۔

اسی طرح شاہ حسن ارغون کی وفات کے بعد (۹۶۲ھ) عیسیٰ ترخان ٹھٹھہ کے حکمران ہوئے اور سندھ دو حکومتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ٹھٹھہ ہمیشہ سے سندھ کا دارالخلافہ رہا ہے۔ اس لیے یہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی ورثے کے لحاظ سے سندھ کی مملکت اور ملک کا نشان امتیاز تھا۔ ہر فن اور شعبہ کے نام ور ملکی و غیر ملکی افراد یہاں مقیم تھے۔ یہ شہر شعر و سخن اور علم و ہنر کا مرکز تھا۔ تہذیبی لحاظ

سے دمشق، بغداد، بخارا اور سمرقند کا ہم پلہ تھا۔ میر ذی اقتدار خاندان کے فرد تھے اور ذی علم تھے اسی لیے یقیناً ٹھٹھہ اور آس پاس کے چیدہ لوگوں سے ان کی شناسائی رہی ہو گی۔

سیہون آپ کے ننھیال کا شہر تھا۔ یہ شہر بھی علم و فن کے لحاظ سے اپنی اقبال مندی کی انتہا پر تھا۔ اس طرح سندھ کا ہر حصہ قصبہ اور قریہ، سما خاندان کے دور سے لے کر ہمارے ماضی کا ایک روشن باب رہا ہے۔ اس سلسلے میں اگر مولانا جامی کے درج ذیل اشعار زبان پر آجائیں تو بے جا نہ ہو گا۔

این زمینی است کہ، سر منزل جانان بودہ
مطرحِ نور، رخِ آن مہ تابان بودہ
اینِ زمینی است کہ، ہر جا خس و خار است، درو
پیش ازینِ رشتہ بجا یش گل و ریحان بودہ
اینِ زمینی است کہ، ہر شیب و فرازی کہ در وست
جای آمد شدِ آن سرو خرامان بودہ
می دھد خاك درش، خاصیتِ آن آبی
کہ نصیبِ خضر، از چشمۂ حیوان بودہ

بہر کیف، میر کی زندگی کا قابل ذکر عرصہ چونکہ سندھ سے باہر گذرا اس لیے آپ کا حلقہ احباب بھی بیرون سندھ سمجھنا چاہیے۔ سندھ کے اندر اساتذہ اور معاصر اور اہل کمال کے علاوہ تین شخصیات کا حال ذیل میں دیا جاتا ہے۔ جن کا میر سے خاص تعلق بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ ابو الغیث بخاری:

یہ بزرگ بکھر کے صوفی اور خدا پرست تھے، جو حسب روایت ملا بدایونی، میر معصوم کے روحانی پیشوا (مرشد) تھے، میر کا اپنا قول ہے کہ ان کے گھوڑے اگر ایک دن

دانہ نہیں کھاتے تھے تو انھیں سخت ملال ہوتا تھا اور وہ سارا دن غم و غصے کی کیفیت میں کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب میر ابوالغیث سے ملے اور انھیں اس کیفیت میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعض اوقات نہ صرف ان کے گھوڑوں کو کئی دن تک دانہ نصیب نہیں ہوا بلکہ خود ان کے باورچی خانے میں خوراک کی قلت کے سبب آگ نہ جلی۔ اس حالت میں وہ خوش و خرم رہتے اور سب سے ہنستے بولتے، اس وقت میر ابوالغیث کے مزاج میں تغیر آیا۔ ضبط حال اور تزکیہ نفس کا سبق سیکھا۔ پیسہ ہو تو کیا اور نہ ہو تو کیا۔

ازحادثات، در صفِ آن صوفیان گریز
کز بود غم کنند و زِ نا بود شادمان ۱۔

اس روایت سے زیادہ اس بزرگ کا احوال نہیں ملتا۔ میر نے اپنی تاریخ میں جن بزرگوں کا ذکر کیا ہے ان میں ان کا نام شامل نہیں ہے۔ بکھر کے ایک بزرگ میر ابوالغیث کا احوال، میر قانع کی تحفۃ الکرام میں ہے لیکن اس کا زمانہ میرزا میر محمد (چنگیز کے پوتے) کا بتاتے ہیں۔۲۔

۲۔ شیخ میاں اسحاق فاروقی بکھری:

شیخ فرید کے ماموں بکھر کے جید علماء اور شہر کے اہم ترین خاندان میں سے تھے۔ بکھر سے گجرات گئے۔ خواجہ نظام الدین کی ملازمت میں داخل ہوا اور ان کا وکیل (اٹارنی جنرل) بنا۔ بکھر میں میر معصوم اور شیخ ہم سبق تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ہی کی وساطت سے میرمعصوم خواجہ نظام الدین کے قریب آئے ۳۔ اور آخر اپنی علمی فضیلت اور تاریخی معلومات کے سبب ان کے مصاحب اور ہمدم بنے۔

"تاریخ طاہری" اور "تحفۃ الکرام" میں آخوند ملا اسحاق بکھری نامی ایک عالم، فاضل شخص کا ذکر ملتا ہے جو اپنے دور کے زبردست استاد اور مدرس تھے۔ "تاریخ طاہری" کے مصنف نے ان کے ہاں تعلیم حاصل کی اور پھر میرزا غازی ترخان بھی ان کی شاگردی میں آئے۔ ۴ ابتداء میں وہ سلطان محمود بکھری کے پاس تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق بکھری وہی بزرگ ہیں جو پہلے سلطان محمود کے پاس تھے۔ پھر گجرات میں خواجہ نظام دین کے پاس ٹھہرے اور آخر میں وطن آکر سندھ فتح ہونے کے بعد یا اس سے تھوڑا پہلے مرزا غازی ترخان کے معلم ہوئے۔ شیخ سعدی اور مولانا روم کی مثنوی پڑھانے میں انھیں خاص مقام حاصل تھا۔ شعر بھی کہتے تھے، مقالات میں ان کا ایک شعر موجود ہے:

می طپد دل در برم در شوق تو
می گذارد خانہ را از ذوق تو

فرید بکھری کا قول ہے کہ شیخ اسحاق نے بھی خواجہ نظام الدین کو طبقات لکھنے میں میر معصوم کے ساتھ مدد کی۔۵

۳۔ شاہ قلی:

اس نام سے میر کے ایک دوست تھے جس سے میر نے ابوالغیث کا قصہ بیان کیا۔ ذخیرۃ الخوانین کے مؤلف کی روایت ہے کہ شاہ قلی میر کے ساتھی تھے اور گجرات کے سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ ۶ شاہ قلی کا اس سے زیادہ احوال معلوم نہ ہوسکا۔

ذیل میں ان مشہور لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو سندھ کے باشندے نہ ہونے کے باوجود میر کے دوست تھے۔

۴۔ خواجہ نظام احمد بخشی:

میر معصوم کے ساتھی، دوست، قدر دان اور سرپرست تھے۔ ان کی صحبت میں رہنے سے میر کو کئی فائدے پہنچے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ کہ میر نے تاریخ سندھ لکھی جو طبقات کی تالیف کے سبب وجود میں آئی۔ دوسرا یہ کہ میر کی کئی ادیبوں اور شاعروں سے شناسائی ہوئی جن کا تعلق خواجہ سے تھا یا، جو ان کے پاس قیامِ گجرات کے زمانے میں آتے رہتے تھے۔

ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق گجرات میں ہوا اور ۹۹۲ھ سے ۹۹۸ھ تک وہ مسلسل سات سال تک ایک ساتھ رہے۔ آخری سال میں شاہی حکم پر جب خواجہ لاہور آئے اس وقت میر بھی ان کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ یعنی میر سندھ چلے آئے اور خواجہ صاحب دوسری جگہ خدمات کی بجا آوری کرتے رہے۔

خواجہ کے والد کا نام خواجہ محمد مقیم تھا جو شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ہراتی کی اولاد میں سے تھے۔ بابر کے زمانے میں خواجہ مقیم "دیوان بیوتات" لکھ رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا عسکری کے وزیر بن کر احمد آباد پہنچے جو اس وقت احمد آباد کا صوبہ دار تھا۔ خواجہ مقیم، ہمایوں بادشاہ کی غریب الوطنی والے سفر میں ایران میں ان کے ساتھ تھے۔ خواجہ محمد مقیم سلطان محمد بکھری کے آخری زمانے میں مغلوں کی طرف سے بکھر میں "امین" کے عہدے پر رہ چکے تھے۔[۷]

خواجہ نظام الدین احمد نے "طبقات اکبری"، گجرات میں لکھنا شروع کی۔ اس سلسلے میں میر معصوم ان کے خاص معاون اور مددگار رہے۔ مآثر الامرا نے اس سلسلے میں

میر کا نام خاص طور پر لیا ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی خواجہ کے دوستوں میں تھے اور غالباً یہی سبب ہوا کہ میر سے بھی ان کے گھرے مراسم ہو گئے۔

خواجہ نظام الدین نے ۴۵ برس کی عمر میں عین جوانی کے عالم میں تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ میں (۲۸ اکتوبر ۱۵۹۴ء) انتقال کیا۔ لاہور میں اپنے ہی باغ میں دفن کیے گئے۔ ان کی موت نے سب کو اشکبار کر دیا۔ بدایونی نے تاریخ کہی:

رفت میرزا نظام الدین احمد
سوی عقبیٰ و چست وزیبا رفت
جوهر او زبس که عالی بود
در جوار ملك تعالیٰ رفت
قادری یافت سال تاریخش
گوهری بی بها ز دنیا رفت

طبقات اپنی نوعیت کی پہلی تاریخ ہے جو نہ صرف تحقیقی ہے بلکہ ہندوستان کے سارے اسلامی دور پر حاوی ہے یعنی سبکتگین کے حملے (۳۶۷ھ) سے لے کر (۱۰۰۱ھ) کے دور میں لکھی جانے والی تمام تاریخوں نے اس کا تتبع کیا ہے۔[۸]

خواجہ علم دوست اور ادب پرور تھے۔ جہاں رہتے وہاں علما و فضلا کی محفل جمی رہتی۔ گجرات میں متعدد علماء اور شعراء آپ کی محفل اور مجلس سے وابستہ ہوئے۔ ان سب کا تعلق میر معصوم سے بھی تھا۔ ایك ہی طبقے سے تھے۔ خواجہ کی شخصیت میر معصوم کے سلسلے میں نہایت اہم ہے انھوں نے میر کی شخصیت کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور ان کی صحبت نے میر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

۵۔ ملا عبدالقادر بدایونی:

منتخب التواریخ کے (۱۰۰۴ھ) مصنف اور اکبری دور کے بیباک اور شخصی پسند و ناپسند کے تاثر کے مطابق لکھنے والے مؤرخ تھے۔ انھوں نے اپنی تاریخ "طبقات" کے انداز میں تحریر کی ہے۔ آپ کی تاریخ مواد کے لحاظ سے نہایت مفید اور کار آمد ہے لیکن انھوں نے اپنی ذاتی رائے کے تحت لکھنے کا خود کو اتنا پابند کیا ہے کہ اسے آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کیا جاسکتا تاہم وہی ایک ایسے تاریخ نویس ہیں جنھوں نے اپنے دور کے واقعات پر تنقید کی اور روایتی انداز کے بجائے تصویر کا دوسرا رخ پیش کر کے قاری کو غور و فکر کا موقع فراہم کیا جس کے نتیجے میں مغل دور میں لکھی جانے والی دوسری تاریخوں مثلاً طبقات اور اکبر نامہ وغیرہ کی یک طرفہ تحریر کی چھان بین کرنا آسان ہو گیا ہے۔ بدایونی کی تاریخ کی بابت موجودہ دور کے مؤرخین کے سامنے تصویر کے دونوں رخ ہیں اور اسی وجہ سے تاریخی کمزوریوں کے باوجود ان کی تاریخ کی حیثیت مسلمہ ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ ۹۔ میں (۱/۲۱اگست ۱۰۴۰ء) اجمیر کے صوبے رنتھنبور سرکار کے ٹوڈہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گویا میر معصوم ان سے ساڑھے تین سال بڑے (۹۴۴ھ) تھے۔ آپ کے والد کا نام ملوک شاہ ابن حامد تھا۔ مختلف اساتذہ کے ہاں مروجہ علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مخدوم اشرف (نانا)، شیخ پنجو، میاں حاتم سنبھلی، شیخ عبداللہ ولد شیخ الھڈنو خیر آبادی، شیخ مبارک ناگوری اور قاضی ابوالمعاری بخاری آپ کے استاد تھے۔ میاں حاتم (متوفی ۹۶۹ھ) کے مرید ہوئے۔ آپ نے اپنی تاریخ میں اکبری مشاہیر کا تذکرہ میاں حاتم کے احوال سے شروع کیا ہے۔

شیخ مبارک کے ہاں فیضی اور ابوالفضل ان کے

ہمدرس تھے۔ اکبری دور کے ان دو مشہور امیروں سے ان کی ساتھ دوستی قائم نہ ہوسکی کیونکہ بدایونی نے غیر شائستہ الفاظ میں انہیں یاد کیا ہے اس سے ان کے بغض اور عناد کا اظہار ہوتا ہے۔

۹۶۹ھ میں ملا کے والد، آگرہ میں فوت ہوئے۔ ملا، ان کی لاش لے کر اپنے بھائی شیخ محمد کے ہم راہ بساور (ضلع بدایوں) گئے۔ دوسرے سال ملا کے دادا اشرف بھی بساور میں فوت ہو گئے۔ ملا کچھ وقت کے بعد بساور سے ہجرت کر کے بدایوں میں (۹۷۳ھ) مقیم ہو گئے۔ اس کے بعد پٹیالہ آکر حسین خان (متوفی ۹۸۳ھ) جاگیر دار کے ملازم ہو گئے۔ حسین خان، ہمایوں کے دور کے امیر تھے۔ وہ ہندوستان کی فتح کے وقت آپ کے ہمراہ تھے۔ اکبری دربار میں بھی ان کی یہی امارت قائم رہی اور سہ ہزاری منصب پر فائز رہے۔ ۱۰۔ حسین خان کے پاس ملا ۹۸۱ھ تك ملازم رہے۔

۹۷۴ھ میں جب مُلا کچھ وقت کے لیے آگرہ آئے تو اس زمانے میں خواجہ نظام الدین سے ان کی شناسائی ہوئی۔ ۱۱۔ جس نے آگے چل کر دوستی اور یکدلی کی صورت اختیار کی۔ ۹۸۱ھ میں حسین خان کی ملازمت چھوڑ کر ملا جلال الدین قورچی اور حکیم عین الملك کی معرفت اکبر سے متعارف ہوئے۔ اکبر نے انھیں فوجی عہدہ دینا چاہا لیکن ملا مدد معاش کی اراضی پر رضا مند ہوئے۔ ایك سال بعد بدھ کے دن کی نمازوں کی پیش امام مقرر ہوئے۔ ۱۲۔ مُلا کو پہلے ایك سو بیگہ زمین مدد معاش کے لیے ملی تھی۔ شوال ۹۸۳ھ میں ایك ہزار بیگہ زمین انھیں ملی۔ مغل دور میں مدد معاش کے لیے دی جانے والی زمینوں میں یہ زمین سب سے بڑی تھی۔

ملا نے سرکاری ملازمت کے دوران مختلف اوقات میں درج ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔ چہل حدیث

۲۔ تاریخ الفی کا ایک حصہ (۹۹۰ھ)

۳۔ مہا بھارت کا ترجمہ (۹۹۰ھ)

اکبر کو، ملا کا یہ ترجمہ پسند نہ آیا جس پر اس نے ملا کو حرام خور اور شلغم خور کہا۔۱۳۔

۴۔ رامائن کا ترجمہ ۱۴۔ (۹۹۶ھ) اس ترجمے پر بادشاہ خوش ہوا اور ملا کو بساور کی جاگیر بدل کر ۹۹۷ھ میں بدایوں کی جاگیر دی۔ اس کے بعد سے بدایونی" ملا کے نام کا جز بن گیا۔

۵۔ تاریخ کشمیر: از ملا شاہ محمد شاہ کا سلیس فارسی ترجمہ۱۵۔ (۹۹۸ھ)

۶۔ معجم البلدان کے ایک حصے کا ترجمہ ۱۶۔(۹۹۸ھ):

اسی سال ملا بدایوں گئے جہاں بیمار ہو گئے اور دربار سے آپ کی غیر حاضری نے طول پکڑا۔ جاتے وقت سرکاری کتب خانے سے "خرد افروز" ۱۷۔ نامی رسالہ جو سنگاسن بتیسی کا ترجمہ تھا اپنے ساتھ لے گئے بادشاہ نے بارہا اس کا مطالبہ کیا بالآخر ناراض ہو کر ملا کی جاگیر رد کر دی اور فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ملا بیماری کے سبب مجبور تھے۔ خواجہ نظام الدین اور ابو الفضل دربار میں بادشاہ کا غصہ اتارنے میں کوشاں رہے۔۱۸۔

۷۔ نجات الرشید (۹۹۹ھ): یہ رسالہ ملا نے شمس آباد میں اس وقت لکھ کر پورا کیا جب وہ خواجہ نظام الدین کی جاگیر پر آئے تھے وہیں خواجہ صاحب کی صحبت میں انھوں نے "منتخب التواریخ" لکھنے کا خاکہ تیار کیا۔

اکبر کے فوری حکم پر بالآخر ملا بمبھر گوڈھ (کشمیر کی سرحد کے نزدیک) میں شاہی منزل پر پہنچے۔ ملا پانچ مہینے غیر حاضر رہے تھے۔ شاہی استفسار پر انھوں نے

حکیموں کے سرٹیفیکٹ پیش کیے لیکن بادشاہ نے یہ قبول نہ کیے اور اس کا غصہ اسی طرح قائم رہا۔ اس پر ملا سخت مایوس ہوئے اور لکھتے ہیں وہ پانچ مہینے تک ''قصیدہ بردہ'' اور ''حصن الحصین'' کا ورد کرتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے۔ آخر کار پانچ مہینے بعد بادشاہ کشمیر سے لوٹ کر ایک دوسرے مقام پر پہنچے۔ وہاں انھیں ''جامع رشیدی'' کے ترجمے کا خیال آیا۔ شاہی دربار میں خواجہ نظام الدین اور ملا کے دوسرے خیر خواہ موجود تھے۔ انھوں نے ترجمے کے لیے ملا کا نام پیش کیا جسکے بعد شاہی غصہ کم ہوا اور ملا ۱۷ ربیع الاول ۱۰۰۰ھ کو لاہور میں شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔

فیضی، جن کے لیے ملا نے اپنی بدطینتی کے سبب نہایت تلخ عبارتیں لکھی ہیں اور انھیں کافر کہا ہے انھوں نے دکن سے بادشاہ کی خدمت میں ملا کی پر زور سفارش بھیجی۔ ملا نے بمبھر سے ان کی طرف اپنی حالت زار کی اطلاع بھیجی تھی۔ اگرچہ شاہی غصہ فیضی کی درخواست پہنچنے سے قبل اتر چکا تھا پھر بھی فیضی کے سرٹیفکیٹ کو غنیمت سمجھ کر ملا نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔۱۹ے

خط اور فیضی کے متعلق جو کچھ ملا نے لکھا ہے اسے سامنے رکھیں اور پڑھیں تو آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ فیضی کس قدر عالی ظرف اور ملا کس قدر پست طبیعت، کم ظرف اور تنگ دل انسان تھا۔

۸۔ بحر الاثمار (۱۰۰۳ھ) : یہ کتاب کشمیر کے سلطان زین العابدین کے کہنے پر لکھی گئی۔ یہ ہندؤں کے قصے کہانیوں سے متعلق ہے۔ ملا نے مذکورہ بالا سال میں اس کا ترجمہ کیا۔ ۱۰۰۲ھ میں ملا کے دو سرپرست فوت ہو گئے۔ ایک خواجہ نظام الدین اور دوسرے خواجہ ابراہیم حسین ۲۰ے۔

جلد ہی ۱۰۰۳ھ میں دو اور ساتھی فوت ہوئے۔ ایک شیخ یعقوب صیرفی کشمیری اور دوسرے حکیم عین الملک۔ ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ میں فیضی وفات پا گئے ان کی وفات کا نقشہ ملا نے نہایت ذلیل انداز میں کھینچا ہے۔

۹۔ منتخب التواریخ (۱۰۰۴ھ): ملا بدایونی نے ۹۹۹ھ میں اپنی تاریخ کا خاکہ تیار کر کے لکھنا شروع کیا۔ ان کی تاریخ میں تنقید کا ترش لہجہ اور اپنے سارے ماحول سے بے زاری ملتی ہے کیونکہ ۹۹۹ھ سے ۱۰۰۴ھ تک کا زمانہ خود ملا کی صورت حال کے حوالے سے اطمینان بخش نہ تھا۔ بادشاہ کا غصہ، دوستوں کی وفات اور اپنے خانگی معاملات میں یکسوئی کا نہ ہونا ایسے اسباب تھے جن کی بناء پر ملا کے لہجے میں ترشی نظر آتی ہے۔

۱۰۰۴ھ میں آپ نے ۵۷ برس کی عمر میں بدایوں میں جب کہ آپ چھٹی گزار رہے تھے، فوت ہوئے، کہا جاتا ہے کہ آپ کی قبر بدایوں کے نزدیک عطاپور گاؤں میں آم والے باغ میں ہے۔۲۱

معلوم ہوتا ہے کہ میر معصوم کا تعلق، خواجہ نظام الدین کے ذریعے ہوا۔ خواجہ دونوں کے دوست بلکہ سرپرست تھے۔ میر کے متعلق ملا کا لہجہ نہایت نرم اور محبت آمیز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کی دل میر صاحب کے لیے کتنی پسندیدہ تھی۔ ملا نے، میر کے شعروں کا انتخاب بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اور ان کے لیے ''بلند طبیعت اور عالی فطرت'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

میر جس وقت احمد آباد میں تھے اس وقت انھوں نے یہ قصیدہ وہاں لکھ کر ان کی طرف بھیجا تھا اس وقت مُلاّ اٹک میں مقیم تھے۔ ملا نے اپنی تاریخ میں قصیدہ نقل کیا ہے:

قصیده میر معصوم

داغـی کـه بـود بـر دل از عشق تو در ازل
از دولـتِ فـراقِ تـو، بـا درد شد بدل
طـوفـان آتشـی کـه دل از درد، بر کشید
افـگـنده در مـزاج زمـین و زمـان خـلـل
یـاد غـم تـو، مـی دهـدم چاشنی درد
طبـعـم فـراق میـدهـدم لـذت اجـل
خـوش آن کـه در طـریق محبت قدم نهاد
چون شوق بی مـلاحظه چون عشق بی حیل
ره یـا بـی ار بـه کـار گـه صنع بنگری
هـم صنع در مـعـامله، هم عشق در عمل
بـی تـابیـم زعشـق، بـه دایـوانگـی کشید
آخـر شـدم مـن از تـو بـه دیـوانگی مثل
خـوناب گـرم بـس کـه زدل ریختم فگند
ایـام سـربسـر همـه در آتشیـن و حـل
عشـقـت هـزار عـقـدهٔ غـم، پیشـم افـگـند
نـاکـرده یك دقیقـهٔ هـجران هنوز حـل
هـم بیـم مـرگ میـدهـدم نشـأه فـراق
هـم ذوق، وصـل میـد هـدم شـوق ازامـل
نـاگشتـه حشـر، روز قیـامت شود پدید
زیـن آتشـی، که از جگرم گشت مشتعل
در خـون نشستـه چشم جهـانی ازان مژه
درخـاك خـفتـه خلقی ازان چشم مکتحل
در هـر دو کـون آتـش دیـوانگـی زدم
رمـزی زسـر عشـق تـو نـاگفتـه درغـزل

آن دل که داشتم ز تو آمیخته به عشق
خونـاب گشت و از مژها ریخت برطلل
دارم به هر مژه زغمت، ابر شعله بار
دارم به سینه آتش هجران هزار تل
مشغول در مشاهده ات چشم روزگار
مشعوف از ملاز متت دیدهٔ دول
خواهم خلاصیم دهد از دوزخ فراق
ماحی کفر و حامی دین هادی ملل
شاه نجف علی ولی شاه لافتی
کز نقد انبیا ز جهان اوست ماحصل
ماهی که مهر کرده از و اکتساب نور
شیری که شیر چرخ از و مانده در وحل
حفظش اگر حصار کشد بر جهانیان
جز مرگ، کس برون نرود از در اجل
بیند به خواب قوت سر پنجه ات اگر
باز وی چرخ بر کند از بیخ دست شل
بانگ مهابتِ تو رسد گر به کوهسار
پیچد چو تازیانه صدا در تن جبل
یك نقطه قاف قدر تو سنجد اگر به قاف
آن جای قاف گیرد و این جای بر زحل
دستت اگر عنان ابد باز پس زند
افتد هزار مرحله واپس تر از ازل
نحلِ فلك ز گلشن قدرِ تو یك ورق
باغِ جهان ز مزرع جور تو نیم تل
در عهدت آن چنان شده شیرین، مزاج دهر
کز زهر، فرق می نتوان کرد، تاعسل

گر بر بصل فتد نظر همت بسهو
در جنب او نماید گردون کم از به صل
باخصم ذوالفقار و به سایل نعم بلی
ظاهر به عهد تو شده معنی لا و بل
گر در ضمیر تو گذرد صورت غضب
از بیم همچو بید بلرزد تن اجل
باشد سپهر قدر ترا و سعتی که مهر
نبود عجب اگر بودش شاهق جبل
گر خنجرت به تیغ سیاست زبان دهد
ای وای چرخ کجرو مکار پر دغل
آرایش عروس سخن چون به مدح تست
بربستم از معانی رنگین برو حلل
ای وای برتو نامی! و بر اهل حشر وای!
در محشر آیدت چوسیه نامۂ عمل
هستم ز آفتاب شفیعی امیدوار
روزی که هیچ جا نبود سایۂ امل
بارانِ ابر رحمت و ساقیِ روز حشر
آن دینِ پناه اعظم و آن صاحب اجل ۲۲۔

میر کا یہ لامیہ قصیدہ ''مخزن الغرائب'' میں بھی موجود ہے۔۲۳۔

۶۔ عبدالرحیم خان خاناں:

محمد بیرم خان کے فرزند تھے۔ اپنی جنگی مہارت، فتوحات، سیاسی قابلیت، علمی سرپرستی اور داد و دہش کے باعث اسلامی دنیا کے عظیم اور محبوب ترین شخصیتوں میں سے تھے بلکہ برمکیوں کے بعد آپ پہلے امیر ہیں جن کی امارت اور سخاوت ضرب المثل بنی۔ آپ کی شخصیت میں

ایک عجیب شانِ محبوبی تھی۔ آپ سے جو ایک مرتبہ ملتا پھر کبھی جدا نہ ہوتا۔ ادیب، شاعر اور اہل فن تو آپ پر پروانے کے مانند فدا تھے۔

"مآثر رحیمی" کی تیسری جلد ان ہی شعراء پر مشتمل ہے جنھوں نے خان خاناں کی شان میں قصیدے کہے۔ اس دور کا بڑے سے بڑا شاعر آپ کا مداح اور آپ کی زرپاشیوں سے فیضیاب ہوا۔ عرفی، کلیم، نظیری، شکیبی وغیرہ آپ کے دربار سے وابستہ تھے۔ مآثر رحیمی نے ایسے ۱۰۷ شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ان کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ اگرچہ متعدد شعراء نے اکبر اور جہانگیر کی شان میں بھی قصیدے کہے ہیں لیکن انھوں نے جب عبدالرحیم خان خاناں کی مدح میں زبان کھولی تو ہیرے جواہرات بکھیر دیئے۔ ان قصیدوں کا رنگ اور شان ہی نرالی ہے۔ شاہی شان میں کہے گئے قصیدوں میں دماغ سے کام لیا گیا ہے جب کہ ان قصیدوں میں دلی جذبہ کار فرما ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں کا سندھ سے تعلق صرف فاتحانہ نوعیت کا نہ تھا بلکہ انھیں یہاں سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ بھی تھا۔ سندھ سے آپ کو بہت محبت تھی۔ اکبری اور جہانگیری دربار میں سندھ کے مسائل پر آپ نے ہمیشہ سندھ کی وکالت کی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے سندھی زبان بھی سیکھی اور شعر بھی کہے۔ عمر کوٹ کے سوڈھا خاندان میں شادی کی۔ اس بیگم سے مرزا رحمان داد پیدا ہوئے۔ آپ کے بیٹے مرزا ایرج کی شادی جانی بیگ کی بیٹی سے ہوئی۔ ۲۴ جب تک مرزا غازی ترخان زندہ رہے۔ (۱۰۲۱ھ) اس وقت تک سندھ عبدالرحیم خان خاناں کی وجہ سے اس خاندان کے ماتحت رہا خود سندھ کی جنگ میں بھی آخری وقت تک آپ کی یہی کوشش رہی کہ خون خرابے سے پرہیز کریں اور جانی بیگ صلح کے ذریعے سندھ مغلوں کے حوالے کر دے۔

خان خاناں کا میر سے پہلا تعلق گجرات کے زمانے (۹۹۲ھ-۹۹۸ھ) میں قائم ہوا۔ ۹۹۹ھ میں لاہور میں آپ دونوں ساتھ تھے۔ جب دونوں کو سندھ کی مہم کے لیے روانہ ہونا پڑا تو ۱۰۰۱ھ تک آپ دونوں کا قریبی تعلق رہا کیوں کہ میر عالم بھی تھے اور شاعر و ادیب بھی اس لیے مزاج شناسی میں بھی یگانہ تھے۔ اس بناء پر ظاہر ہے کہ خان خاناں جیسے جوہر شناس شخص کی نظر میں میر کا کیا مقام ہو گا۔ ٹھٹھہ کی مہم میں خان خاناں کے ساتھ متعدد شعراء بھی تھے۔ مثلاً شکیبی، انیسی، بقائی، غیوری، وقوعی، محوی، حیاتی، کامی، محمد شیرازی، تاج شیرازی، شجاع شیرازی اور میر عیوضی وغیرہ سب ہی سندھ میں اس موقع پر ساتھ تھے۔ ان میں سے متعدد شعراء نے سندھ کی فتح اور ٹھٹھہ کی فتح میں چراغاں کے موقع پر قصیدے کہے۔ ان سب شعراء سے میر کی بحیثیت ایک شاعر یا بہ حیثیت قدر دان اور ادب پرور کی حیثیت سے شناسائی راہ و رسم اور شعر و سخن کی محفل منعقد ہوتی ہو گی۔[۲۵]

نظیری اور کلیم دونوں اس دور کے اہم ترین شعراء میں سے ہیں۔ نظیری تو گجرات ہی میں تھے کہ فوت (۱۰۱۲ھ) ہوئے۔ خان خاناں سے بھی تعلق تھا اور یقیناً میر سے بھی شناسائی رہی ہو گی۔ عرفی (۹۶۴ھ-۹۹۹ھ) اس دور کا دوسرا بڑا شاعر ہے جس وقت میر گجرات سے لاہور آئے تو عرفی لاہور ہی میں تھے اور عرفی سندھ کی طرف روانہ ہونے والے سال یعنی ۹۹۹ھ میں لاہور ہی میں فوت ہوئے۔ یہ اعزاز صرف خان خاناں کو ہی نصیب ہوا کہ عرفی نے آپ کی مدح میں قصیدہ کہا ورنہ اس وقت کا بادشاہ تو اس سعادت سے محروم رہا۔

خان خاناں ۹۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۶ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کا مدفن دہلی میں ہے۔ آپ سے قبل یا بعد میں ہندوستان کی سرزمین کو آپ جیسا انسان، غریب پرور اور اہل دل امیر نصیب نہ ہوا۔[۲۶]

خان خاناں کا اپنا کوئی ادبی ذخیرہ نہیں ملتا۔ چند ہندی دوہے اور دو تین فارسی غزلیں موجود ہیں۔ ''بابر نامہ''

کا فارسی ترجمہ آپ کی نثر نویسی کا شاہکار ہے۔

مذکورہ بالا جن مشہور اشخاص، امیروں اور شاعروں کے ساتھ آپ کے تعلق کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ میر صاحب کی جان پہچان تھی۔ ان شاعروں کے علاوہ میر معصوم کے ذاتی بلکہ گہرے تعلقات ان سب شعراء سے بھی رہے جو گجرات میں خواجہ نظام الدین سے وابستہ تھے۔ ان شعراء کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۷۔ امنی، ملا غنی:

خواجہ نظام الدین کے پروردہ اور گجرات میں ان کے ساتھ تھے۔ پہلے "خوفی" تخلص تھا جسے خواجہ نے بدل کر "امنی" کر دیا، غالباً خوف اور بے یقینی کی زندگی کا سفر طے کر کے خواجہ کی امان میں پہنچے اسی مناسبت سے انھیں یہ تخلص دیا گیا۔ یہ رباعی آپ کی ہے:

منم کہ غیر غم اندو ختن نمی دانم
تمام رشکم و واسوختن نمی دانم
بہ نور خاطر اگر، روشناس خورشیدم
چراغ بخت خود افرو ختن نمی دانم[۲۷]۔

۸۔ بقائی:

ایرانی النسل تھے۔ پہلے ملک قمی کے پاس دکن پہنچے، پھر احمد آباد میں خواجہ کے پاس آئے۔ ابتداء میں مشغولی تخلص کرتے تھے۔ خواجہ نے بدل کر بقائی رکھا۔ خواجہ کے انتقال کے بعد خان خاناں کی سرپرستی میں آگئے۔

تا عشق زمژگان بتان نیشتر آورد
خون از رگ و از ریشۂ من جوش بر آورد

فـریـاد کـه تـا چشـم زدم، تیـر خیـالـش
از دیـده فـرو رفـت و سـر از دل بـدر آورد ۲۸؎

۹۔ حیائی:

بدایـونی کـا قـول ہے کہ آپ خواجہ کے ساتھ گجرات میں تھے:

پیـغـام دوسـت داغ جـگـر تـازه مـی کـنـد
دردِ و داع و رنـج سـفـر تـازه مـی کـنـد

....

عـاشـق رخ خـویـش بر درت سـود و برفـت
وان مهـر کـه بـاتـو داشـت، بنـمـود و برفـت
یك شـب بـه هـزار حیـلـه در بـزمِ وصـال
پـروانـه بـه شـمـع دیـده بکشـود و بـرفـت ۲۹؎

۱۰۔ صرفی ساؤجی:

گـجـرات میں خواجہ سے وابستہ ہوئے۔ صاحب دیوان شـاعـر تھے۔ بدایونی کا قول ہے کہ قصیدہ اور غزل میں خاص طرز کـے مـالك تھے۔ لاہور میں بھی رہے، آخر میں فیضی کے ساتھ دکن گئے، یہیں فوت ہوئے۔

گـل فـروشِ مـن کـه خـواهـد گـل ببـازار آورد
بـایـد اول تـاب غـوغـای خـریـدار آورد ۳۰؎

خـواجـہ صاحب سے مذکورہ بالا شاعروں کے علاوہ ان شعراء کا بھی تعلق تھا:

وقوعی، میر شریف نیشاپوری (۱۰۰۳ھ)۳۱؎
ملا لطفی منجم ۳۲؎
ملا عبدی رازی ۳۳؎

میر معصوم سے ایران کے سفر میں بھی کتنے ہی ادیب

و شاعروں کی ملاقات اور شناسائی رہی۔ یہاں ان شعراء کے متعلق روایات درج کی جاتی ہے:

۱۱۔ تقی کاشی:

میر کے ایرانی دوستوں میں تقی کاشی، مصنف تذکرہ "خلاصة الاشعار" کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں میر کا چشم دید حال بیان کیا ہے اور ان کے زیادہ سے زیادہ شعر درج کیے ہیں۔ کاشان میں میر جتنا عرصہ ٹھہرے تقی کاشی سے ان کی ملاقاتیں رہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم رہی۔

آپ کا نام تقی الدین محمد بن شرف الدین علی حسین ہے۔ ۹۴۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۱۶ھ میں اپنا تذکرہ مکمل کیا۔ جسے انھوں نے ۹۸۵ھ میں لکھنا شروع کیا تھا تقریباً میر معصوم کے ہم عمر تھے۔

انھوں نے میر معصوم کے بہت سے شعر درج کیے ہیں ورنہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے تو صرف چند شعروں پر اکتفا کیا ہے۔

۱۲۔ اوحدی بلیانی:

میر تقی الدین محمد بن معین الدین صاحب "تذکرہ عرفات العاشقین" متوفی ۱۰۳۰ھ۔ یہ شاعر، میر سے اصفہان میں (۱۰۱۳ھ) میں ملے۔ جس وقت میر بادشاہ سے مل کر لوٹ رہے تھے میر کے اعزاز میں اصفہان میں جو مشاعرہ ہوا اس میں اوحدی موجود تھے۔

۹۷۳ھ میں پیدا ہوئے، ۱۰۱۵ھ میں ہندوستان آئے، آگرہ میں اپنا تذکرہ "عرفات العاشقین" کے نام سے ۱۰۲۴ھ

میں مرتب کیا۔ ۱۰۳۹ھ تك زندہ رہے۔

۱۴۔ حکیم شفائی:

شرف الدین حسینی اصفہانی (متوفی ۱۰۳۷ھ) اپنے دور کے نہ صرف جیّد شاعرتھے بلکہ ایران میں صفوی دور سے تعلق رکھنے والے شعراء میں نہایت بلند مرتبہ رکھتے ہیں، میرزا صائب کہتے ہیں!

در اصفہان کہ بدرد سخن رسد، صائب
کنون کہ، نبض شناس سخن شفایی نیست

اصفہان کے مشاعروں میں شریك رہے۔ اکبر کے ساتھ شاعرانہ صحبتیں رہیں۔ "شفائی" شاعر ہونے کے علاوہ اپنے دور کے جیّد حکیم بھی تھے۔ کیوں کہ میر کو بھی طب سے شغف تھا لہٰذا دونوں کی صحبتیں دو آتشہ شراب کی مانند تھیں۔ اُن کے اشعار ہیں:

از رد و قبول دگرانش چہ تفاوت
آن بندہ کہ درچشم خریدار در آید

....

گفتی کہ چہ شد قاعدۂ مہرو محبت
یك رسمِ کہن بود، بہ عہد تو بر افتاد

....

"شفائی"را تمام عمر در راہِ تومی بینم
بہ کویت می رو د یا از سر کوی تو می آید

....

آن دل کہ نامزد بہ وفای تو کردہ ام
کاری مکن کہ عربدہ جوی دگر شود

۱۴۔ فکری، محمد رضا:

اصفہانی (متوفی ۱۰۲۰ھ) اصفہان میں میر معصوم کے مشاعرے میں شریک ہوئے، اپنے دور میں اصفہان کے چند اہم شعراء میں سے تھے۔ اسی بناء پر شاہ ایران کے وزیر نے انھیں بھی دعوت دے کر شریک کیا۔

ایک خوب صورت لڑکے پر عاشق ہوئے، دکن پہنچے وہیں وفات پائی۔

اگرم ز اشك گلگون شده لاله گون زمینها
نتوان شدن پشیمان گل عاشقی است اینها

....

آن قدر خون زلب لعل تو دارم در دل
کز درونم نفس آلوده به خون می آید

....

زان دهانِ تنگ "فکری" آرزوی بوسه چیست
آرزو خوبست در جائی که گنجد آرزو

۱۵۔ عتابی تکلو:

حسن بیگ ہرات میں پیدا ہوئے۔ قزوین میں پرورش پائی اور اصفہان میں سکونت اختیار کی۔ میر معصوم کے ساتھ ایران سے آئے۔ غالباً ان کی ملاقات اصفہان میں ہوئی۔ ہندوستان آئے لیکن پھر واپس لوٹ گئے۔ دوسری مرتبہ ۱۰۲۰ھ میں آ رہے تھے کہ قندھار میں میرزا غازی ترخان کے پاس ٹھہرے اور ان کی مدح گوئی کر کے انعام حاصل کیا۔ ۱۰۲۱ھ میں میرزا کی وفات کے بعد ہندوستان آئے۔ آپ کے سال وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ۱۰۲۵ھ زیادہ قرین قیاس ہے۔

کوئی دیوان مرتب نہیں کیا، لیکن اتنے اشعار کہے کہ دیوان بن جائے۔ ''نظامی'' کی تقلید میں ''خمسہ'' بھی مرتب کیا تھا۔[۳۴]

ندانم آن گل خود رو، چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنی، گفت و گوی او دارد

....

خوش آن شبی کہ خیالم برد بہ گیسوی یار
دران دو سلسلہ ام، مو بہ مو بگرداند

....

حوالہ جات

۱۔ بدایونی، ۳:۳۶۵
۲۔ ''تحفة الکرام''، طبع قدیم، ۳:۱۲۶
۳۔ ''ذخیرہ'' کی روایت ہے کہ میر تنگ دستی کے سبب پیدل گجرات پہنچے اور شیخ کے ذریعے انھیں ملازمت ملی جو غلط ہے۔ (۱:۲۰۱)
۴۔ طاھری ۱۳، ۱۴، ''تحفة الکرام'' ۳:۱۲۸، مقالات، ۸۹۔ میرزا غازی ترخان، حسام الدین ۱۲۹۔۱۳۰۔
۵۔ ''ذخیرہ'' ۱:۲۰۸۔۲۰۹۔
۶۔ ذخیرہ ۱:۲۰۲
۷۔ مآثر الامراء۳:۲۴۹
۸۔ مقالہ خواجہ نظام الدین احمد از حسام الدین، مجلہ جام جم، اکتوبر ۱۹٦۷ھ، بدایونی، ایلیٹ ۵:۱۷۷۔
۹۔ بدایونی ۱:۳٦۳۔
۱۰۔ آئین ۳۰، شمارہ ۵۳
۱۱۔ بدایونی ۲:۹۹۔
۱۲۔ بدایونی، ۲:۲۰٦۔۲۲٦۔
۱۳۔ بدایونی ۳:۱۱۸۔
۱۴۔ بدایونی ۲:۳۳۷۔۳٦٦۔
۱۵۔ بدایونی ۲:۳۷۴
۱٦۔ بدایونی ۲:۳۷۵
۱۷۔ بدایونی ۲:۱۸۳
۱۸۔ بدایونی ۲:۳۷۷

۱۹۔ خط اکبر نامہ میں ہے اور بدایونی نے بھی دیا ہے، ۳:۳۰۳۔

۲۰۔ بدایونی ۳:۲۲۸

۲۱۔ تاریخ بدایوں، رائے بختاور سنگ، مطبوعہ بریلی ۱۸۶۸ء

۲۲۔ بدایونی، ۳:۳۶۶۔۳۷۰۔ ملا بدایونی کی سوانح کا مآخذ آپ کی تاریخ کے علاوہ یہ بھی ہیں:

1- Badayoni and His Works, by Blochman J.A.S. III, 1869, p.106-144

I۔ بزم تیموریہ، سید صباح الدین، ۱:۱۹۱۔۲۳۷

II۔ ایلیٹ، تاریخ ہند، ۵:۴۷۷

۲۳۔ نسخۂ خطی پنجاب، ورق ۳۴۵ ب و بعد۔

۲۴۔ ملاحظہ کیجیے شجرہ تحفۃ الکرم، ص ۳۸۶۔

۲۵۔ تحفۃ الکرام ۲۵۶۔۲۵۷۔

۲۶۔ مآثر رحیمی کی دو جلدیں خان خاناں کے متعلق ہیں۔ مقالات الشعراء اور تحفۃ الکرام میں سندھ کے بیان کے سلسلے میں آپ کا احوال رقم ہے۔ بزم تیموریہ کی پہلی جلد میں آپ کا حال دیا گیا ہے۔ انگریزی میں ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا ہے۔

Abdu R-Rahim Khan-I-Khanan and his Literary Circle by Dr. C.R. Naik Gujarat University, Ahmed Abad, 1966.

اس کتاب میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ سارے کا سارا مآثر رحیمی کا چربہ ہے۔

۲۷۔ بدایونی، ۳:۱۸۷، نورالحسن ۷۰۔

۲۸۔ بدایونی ۳:۱۹۶، صدیق ۸۱

۲۹۔ بدایونی ۳:۲۲۱

۳۰۔ بدایونی، ۳:۲۲۶

۳۱۔ بدایونی۳:۳۷۸، نظام الدین ۲:۵۰۵، رحیمی ۳:۶۸۷، صباح ۷۶۴۔ صدیق ۵۱۸، آزاد خزانہ ۴۴۳۔

۳۲۔ نظام الدین، ۲:۵۰۱، بدایونی ۳:۳۲۰، نور ۸۸، صباح ۵۹۷

۳۳۔ سام میرزا، نظام الدین ۲:۸۹۹۔

۳۴۔ مزید احوال ''میرزا غازی ترخان اور ان کی بزم ادب'' میں دیکھیے۔

(۴-۱۰-۱۹۷۸ء)

باب - ۲۹

شاعری

جس طرح گذشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ میر کا کلام جو بقول تقی کاشی، غزلیات کے دو دواوین، ایک دیوان رباعیات، پانچ مثنویات پر مشتمل تھا، وہ گم ہوچکا ہے۔ تالپوروں کے کتب خانے میں ایک نسخے کی موجودگی کا ذکر کیا جاچکا ہے وہ بھی زمانے کے انقلابات نے جہاں سندھ کے شاہی خاندان کو ختم کر دیا۔ وہاں ان کا جمع شدہ وہ علمی ذخیرہ بھی اس طرح تہ و بالا ہو کر منتشر ہو گیا جس طرح کہ موسم خزاں میں درختوں، پودوں کے پتے جھڑ کر منتشر ہو کر ختم ہوجاتے ہیں۔ بہرحال اس وقت دنیا کے کسی بھی کتب خانے میں میر معصوم نامی بھکری کے کسی بھی دیوان یا کسی مثنوی کا پتہ نہیں چلتا۔ جو دیوان پرانے سکھر میں ان کے خاندان کے پاس موجود ہے جس کی نقل پیر علی محمد راشدی نے ۱۹۳۲ء میں کی تھی وہ میر مرحوم کا نہیں بلکہ کسی استاد نے مقطع میں یا تو اصل شاعر کا تخلص ہٹا کر نامی تخلص ملا کر جعل سازی کی ہے یا کسی دوسرے تخلص والے معمولی شاعر کا کلام ہے جس کو خاندان والوں نے میر کا سمجھ کر محفوظ کیا ہے۔ اس دیوان کی ابتدا حمد، نعت اور منقبت سے ہوتی ہے:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
اول آثار جدید و قدیم
کرد خدا وند ز حمد و سپاس
بندۂ خود را بہ خودی حق شناس

اختتام اس شعر پر ہوا ہے:

سزای بندہ کہ مظلوم نفس و شیطانم
عطیہ ای بدھی خاصہ از برای حسین ا۔

اسی دیوان سے ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے کچھ اشعار میر معصوم کے سمجھ کر تاریخ سندھ کے دیباچے میں درج کیے ہیں۔ مثلاً اس قصیدے کا شعر:

اول دفتر بنام ایزد دانا
صانع پروردگار وحی و توانا

یہ سعدی کا قصیدہ ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اسی طرح دوسرا قصیدہ ڈاکٹر مرحوم نے نقل کیا ہے:

باد خزان وزید فرو ریخت نو بہار
عمر عزیز رفت و نکردیم ہیچ کار

میرے دوست احمد گلچین معانی کا بھی خیال ہے کہ یہ اسیدی تہرانی کا معلوم ہوتا ہے۔ قصیدہ میں ''باغ اسید'' کا نام آیا ہے جو اسیدی نے لگوایا تھا اور اسی میں ہی خود مارے گئے۔ ''باغِ اسید'' کا نام جس انداز میں آیا ہے اس سے یہ خیال کرنا کہ یہ اسیدی کا قصیدہ ہے میرے خیال میں صحیح نہیں ہے لیکن بہرحال قصیدہ کسی کا بھی ہو میر معصوم کا نہیں ہے۔ اسی طرح یہ قصیدہ:

روزی کہ زیر خاك تن ما نہان شود
و انہا کہ کردہ ایم یکایك عیان شود

اس قصیدے کے ۵۳ اشعار شیخ سعدی کے دیوان میں الحاقی شعروں کے تحت درج ہیں جنھیں ذکاء الملك فروغی نے اپنے تصحیح شدہ نسخہ سے خارج کر دیا۔

میر کا کلام اس وقت اتنا ہی دست یاب ہے جو گورستان میں کتبوں یا دوسرے یادگار پتھروں کے تختوں پر کندہ ہے یا مختلف تذکروں میں بطور انتخاب درج شدہ ہے

لیکن وہ اس قدر کم ہیں کہ اس کی روشنی میں میر کی شاعری کے متعلق صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اسی لیے مجبوراً اسی رائے پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو تذکرہ نویسوں نے دی ہے اور گذشتہ صفحات میں درج ہوچکی ہے۔ ہماری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ میر کا ایک ہی مخصوص رنگ تھا جو ان کی رباعیوں میں نمایاں ہے۔ وہ غزلوں سے زیادہ رباعی کے استاد بلکہ اس صنف کے بادشاہ تھے۔

تمام معاصر تذکرہ نویسوں نے میر کے شاعرانہ کمال اور ان کی اس مد میں حاصل صلاحیت کی تعریف کی ہے۔ تقی اوحدی جن سے میر صاحب اصفہان میں ملے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ واقعی انھیں شاعری میں بڑی قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ ۲۔ اسی سلسلے میں سب "یک زبان" ہیں سوائے دو تذکرہ نگاروں کے یعنی "مجمع النفائس" (۱۱۶۴ھ) اور گل رعنا (۱۱۸۲ھ) کے جنھوں نے ایک دوسرے کی نقل میں لکھا ہے کہ میر کے کلام میں رطب و یابس زیادہ ہے۔ ۳۔ لیکن انھوں نے یہ رائے "مجمع النفائس" کے مصنف تقی اوحدی کی طرف منسوب کرتے ہوئے نقل کی ہے وہ ان کی اپنی نہیں ہے۔ ایک شاعر کا کلام سو فی صد اول درجہ کا ہو وہ ظاہر ہے کہ ممکن نہیں ہے اسی لیے اس کلیے سے میر معصوم بھی مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔

ذیل میں ہم ترتیب زمانہ کے لحاظ سے میر کے دستیاب شدہ اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ کلام کی تصنیف کا علم ہوسکے اور میر کے ذہنی ارتقا کا پتا چل سکے۔

گذشتہ صفحات میں ملا بدایونی کے احوال میں میر کا ایک قصیدہ دیا گیا ہے جو ۹۹۹ھ سے پہلے کا یعنی گجرات کے دور کا (۹۹۲۔۹۹۸ھ) ہوسکتا ہے اسی طرح قبرستان کے سلسلے میں جو اشعار و رباعیات ملے ہیں وہ ۱۰۰۲ھ سے پہلے

کیے ہیں- یہ سال چوکنڈی کی تعمیر کا ہے-

کتابوں میں سب سے پہلا انتخاب طبقات اکبری کا ہے جس کی تالیف کا زمانہ ۱۰۰۲ھ ہے- طبقات میں تین اشعار ایسے ہیں جن میں سے ایک مطبوع نسخے میں کہیں آیا ہے جس کو مطربی سمرقندی نے طبقات کے دو اشعار کے ساتھ نقل کیا ہے- وہ تین اشعار یہ ہیں:

بازِ دلِ وصل جو، مصلحتِ جان گذاشت
آرزوی درد کرد، خواهش درمان گذاشت
نیم نگاهش به ناز، دین و دل از من ربود
نیم نگاهِ دگر، درگرو جان گذاشت ۴
"نامی" از اندوه هجر، سوی عدم رخت بست
وای که جان را بهم، دست و گریبان گذاشت ۵

بعد اس دور اور زمانے کا انتخاب ملا بدایونی کا ہے جنھوں نے اپنی تاریخ ۱۰۰۴ھ میں مکمل کی-

ابیات

چون گریهٔ من دید، نهان کرد تبسم
پیداست که این گریهٔ من، بی اثری نیست ۶ـ

....

در عشق نشه ایست، که عشاق خسته را
ذوقی است در فراق که، اندر وصال نیست ۷ـ

....

داده پیغام به قاصد مه من خنده کنان
ظاهر است از سخن او اثر خنده هنوز ۸ـ

....

چه خوش است آن که از خود روم و توحال پرسی
به تو شرح حال گویم به زبان بی زبانی ۹ـ

....

رباعیات

یك حصهٔ عمر من به نادانی رفت
یك حصه ای ازان چنان که میدانی رفت
یك حصه به بیهوده به بیکار گذشت
یك حصه ای به افسوس و پشیمانی رفت ۱۰ـ

....

از درد تو صد گونه دلِ من ریش است
در هجر توام قیامتی درپیش است
دم در کشم و نفس به بیرون نکشم
کز دل تا لب هزار دوزخ بیش است

....

تنها باخود در انجمن باید بود
با خویش همیشه در سخن باید بود
هم بلبل و هم گلِ چمن باید بود
دیوانه به کار خویشتن باید بود ۱۱ـ

....

عشقت نه متاع هر خریدار بود
اورا دو جهان بهای یکتار بود
گل نیست که در کوچه و بازار بود
یا مشك که در دکانِ عطار بود ۱۲ـ

....

جویای جمالش ار چه بسیار بود
هر دیده نه لایقِ رخِ یار بود
هر کفر نه اندر خورِ زنار بود
هر سر نه سزاوار سرِ دار بود

....

در بحر دلم قلزم خون می جوشد
صد دوزخ دردم بدرون می جوشد
در وضعِ زمانه آتش خواهم زد
زینگونه که در درون جنون می جوشد

....

هر لحظه دلم خیال تو ساز کند
زان سو که تویی هزار انداز کند

ترسم جانا که مرغ جان از قفسم
یکبار زشوق وصل پرواز کند ۱۳ـ

....

هر سال که گل به بوستان می آید
شادی و نشاط در جهان می آید
هر صفحهٔ گل زبیوفایی حرفی
سهل است که بلبل به فغان می آید ۱۴ـ

....

ای آن که بر آن رخت نظر می باید
چشم تو ورای چشم سر می باید
خواهی که زعشق هاش غافل نشوی
در چشم دلت، چشم دگر می باید

....

در دیده ز اندوه خبر می باید
در ناله ز درد اثر می باید
در سینه بجای دل شرر می باید
در دیده بجای خون جگر می باید

....

درعشق بتان مشق جنون باید کرد
جان را به فراق رهنمون باید کرد
چون شیشه تمام پرزخون باید شد
وانگه زرهِ دیده برون باید کرد ۱۵ـ

....

امروز صبا بوی وفایی دارد
گویا خبری ز آشنائی دارد
دیوانه دل مرا به جوش آورده است
آشفتگی ای مگر ز جائی دارد

....

در مذهب ما به جمله یکسان می باش
در دایرهٔ کفر به ایمان می باش
این است طریق عشق جانانهٔ ما
زنار به گردن مسلمان می باش ۱۶ـ

....

گلزار جمال عارض دلدارم
چون جلوه دهد به خاطر افگارم
دریا دریا، جهان جهان، خون ریزم
بستان بستان، چمن چمن گلبارم ۱۷ـ

....

روزی که به فریاد غمش بر خیزم
در دامن هجر دست دل آویزم
زان گریه که با خون جگر آمیزم
خونِ دو هزار دل به دامن ریزم

....

گه نالم و گه ز ناله خاموش کنم
باشد که ز جای سخنت گوش کنم
فارغ ز خیال تو نیم یك نفسی
ترسم که دگر نفس فراموش کنم ۱۸ـ

....

هر اشك که از دیده برانگیخته ام
با زهر غمش، نخست آمیخته ام
ترسم که به حشر دوزخی بر خیزد
این گریه که در فراقِ او ریخته ام

....

از آلایشِ روزگار اندر گله ای
عیبِ دگران مکن، تو هم زان گله ای

پرهیز ز آلودگیِ دامنِ خویش
نامی! دو سه روزی که درین مزبله ای ۱۹ـ

....

ای آنکه تو بار بسته بر راحله ای
در خواب شده غافل ازین مرحله ای
بیدار شو! و پای طلب در ره نه
رفتند همه تو نیز ازین قافله ای

....

فریاد رحیل از همه کس می شنوی
آوازه را، ز پیش و پس می شنوی
کرده همه شبگیر بسر منزل دور
تو خفته به ره بانگ جرس می شنوی ۲۰ـ

....

دلدار مجو تا همه دل خون نشوی
وزوی نشوی تا تو دگرگون نشوی
شوریده و شیدایی و مجنون نشوی
تا از روشِ زمانه بیرون نشوی ۲۱ـ

....

تا کی؟ دل از این و آن، پر از کینه کنی!
تا چند به زر سینه چو گنجینه کنی؟
کار این نبود که تیره سازی دل را
آن کار بود که دل چو آیینه کنی ۲۲ـ

غزلیات ۲۲ـ

بانگ غفران چو زند رحمت او، عصیان را
تکیه بر کفر بود از کرمش، ایمان را
ریش درد دلم، ای دوست! به مرهم مخراش
ورنه از آتش دل داغ کنم درمان را
هجر را، بود به هر خاتمه ای، روز وصال
هست در عهد تو قانون دگر هجران را
صد ره از گنبد فیروزه نهم پا برتر
همچو آهی خود اگر چست کنم دامان را

....

عفو تو بسته است لب عذر خواه را
بر رو نهاده داغ شفاعت گناه را
از بس به جستجوی تو پیك نظر دوید
دیدم هزار آبله در پاه نگاه را
از بس که ناز و عشوه فشاند گهِ خرام
آرایش بهار دهد، جلوه گاه را

....

بی گل رویش، ز برق آه آتشبار ما
سایهٔ گل، شعله گردد بر سر دستار ما
تا فگنده سایه بر ما از کرم آن آفتاب
رشك دارد آفتاب از سایهٔ دیوار ما

....

در بزم دوختم نگهی، بر نگاه غیر
بربستم از نگه سر راه نگاه را

....

تا دور کردی از گل عارض، نقاب را
کردی شکسته رنگ گل آفتاب را
شهری، به نیم جنبش مژگان، کند خراب
یکسو نهاده جنبش روز حساب را
نامی چو بر صحیفهٔ گردون رقم کشد
سوزد صریر او ورق آفتاب را

....

از مهر و ماه پنبه نهد آسمان بگوش
گر سر کشد به جانب گردون فغان ما
آید هزار همچو سمندر به گشت باغ
بلبل اگر به ناله شود همزبان ما
مرغان باغ زان سوی افلاك، جا کنند
گر مرغ ناله، می پرد از آشیان ما

....

به هر طریق که خواهی، لباس غمزه بپوش
که من شناخته ام آشتی و جنگ ترا
تو ننگ و نام، به عالم فروختی نامی!
کنون چه قدر بود پیش یار، ننگ ترا

....

بنما رخ و زلف عنبرین را
تاراج نمای عقل و دین را
هر جا که تو پا نهی، من از شوق
بوسم همه عمر، آن زمین را
گر سجده برم به آن کف پا
خورشید نسب کنم جبین را

....

غمزهٔ کافر، دلت درهم شکست
عاقبت، بام در اسلام را

....

گریه ز بس گره شده، بسته به ناله راه را
چند بدل فرو برم بی تو سنان آه را
تا نکند نظارهٔ ماه رخ تو، چشم کس
پردهٔ حسن تو کنم از همه سو نگاه را

....

دو رو گر نیست تیغ عشق را پس از چه رو باشد
زیك رو زخم بر یعقوب وا زیك رو زلیخا را

....

رخصت یك عشوه ده، آن مژهٔ تیز را
نایب صد فتنه کن، غمزهٔ خونریز را
نیمشبان کز غمت، ناله ز دل بر کشم
وقت مبدل شود، مرغ سحر خیز را

....

از کس نشود حاصل ما مرهمِ دردی
هر چند بدر یوزه فرستیم فغان را

....

از حرف طلب بسته زبان ادب ما
هرگز نرود نام تمنا به لب ما
هرگز به تمنا لب خواهش نکشا ییم
عشق تو بریدست زبان طلب ما

....

از ناله مکن تیز خراش جگر ما
صد دوزخ سوزنده بود از شرر ما

بـر آتـش بـی تـابـیِ مـا، چنـد زنـی طـعـن
خشـکسـت لـب نـالـه، ببیـن چشـم تـرِ مـا
مـا بیـخبـریـم و خبـر از خـویـش نـداریـم
از بیـخبـری پـرس، چـو پـرسـی خبـر مـا
فـرداسـت کـه نـامی صفت از ما اثری نیست
هـر چـنـد کـه در خـاك بـجوی اثـر مـا

....

از خـنـده مـزن اینـهـمـه راه گـلـهٔ مـا
از شـکـوه گـرانبـار مـکـن قـافـلـهٔ مـا
از چشـم زدن پیـش، بـه مـقصـود رسید اسـت
هـر کـس کـه گـرفتسـت پـیِ راحـلـهٔ مـا

....

گـر بـه تیغ غـمـزه، مرغ دل طـپد، عیبش مکن
رسـم بـاشـد، صیـد را هـنـگـام بسمل، اضطراب

....

بـلبـل انـدر وصل امشب ناله های زار داشت
شـاهـد گل گوییا امشب سری با خار داشت

....

حسنسـت کـه او جـلـوه گـر از پردهٔ نـاز ست
عشـقسـت کـه بـاحسـن ازل مـحـرم راز ست ۲۴ـ
قـانـون خـروشم هـمـه بیرون ز جـنـون ست
این زمـزمـه امشـب نـه بـه اندازهٔ نـازسـت
امشـب، بـه تـمنـای مـه روی تـو، تـا صبح
چشـمـم، چـو در خـانـهٔ ویـران شـده بـازسـت ۲۵ـ
آن حسـن کـه، جـولانـگـه او، عرصهٔ نـازسـت
مـتسـغـنیـز آرایـش و فـارغ ز نیـازسـت

....

من بیخبر و در نظرم جلوه گری هست
زین بیخبری در همه عالم خبری هست

....

دلم آیینه و مهر تو درو جلوه گرست
این چراغیست که کونین ازو بهره ور ست

....

مصلحت نیست که بی پرده جمالش نگری
دیده بر دوز که چشم تو حجاب نظر ست ۲۶ـ
نامیا! قطع منازل کن و از پا منشین
ره بسر منزل مقصود ازین بیشتر ست

....

بی روی تو در دیدهٔ من نور نماند ست
یك ذره توان، درمن مهجور نماند ست
پیوسته، بتان را سوی عشاق، نظر بود
این قاعده در عهد تو، منظور نماند ست
دور از تو، مرا حال به مردن شده نزدیك
تا مرگ زمن، یك نفسی دور نماندست
هجران تو نامی صفتم تافته پنجه
بازوی مرا طاقت این زور نماندست

....

شد نگهم گرم تماشای دوست
ساخت در آغوشِ سراپایِ دوست
خواستم از نخلِ قد او ثمر
فتنه فرو ریخت ز بالای دوست
وه که تنم صورت دیوار گشت
بسکه شدم محو سراپای دوست

در دل ناامی! گل شادی دمد
دمبدم از خار ستمهای دوست

....

بلبل امشب نالهٔ مستانه داشت
گل شراب ناز در پیمانه داشت
باخیال او بر آوردیم دوش
آرزوهایی که در دل خانه داشت
عاقبت در کاسهٔ ما کرد خرج
دردی دردی آن که در پیمانه داشت

....

شب که دل بر آتشم پروانه بود
خنده ها بر گرمیِ پروانه داشت
هر که چون من آتشی در خانه داشت
خنده بر جانبازیِ پروانه داشت
دل کجا و آرزوی وصل دوست
آرزویی در دل دیوانه داشت
قصهٔ ما شور حشراز پا نشاند
بلعجب خوابی درین افسانه داشت

....

نگاهش باز چین بر جبین داشت
زغمزه خنجری در آستین داشت
لبت بوسیدم اندر خواب نوشین
مرا تلخی زهر غم، برین داشت

....

مرغ دل باز به سودای کسی افتاد ست
بال نکشوده به دام قفسی افتادست

عاقبت برق محبت ز دل من سرزد
آتش طور به بال مگسی افتادست ۲۷ـ
غمزه اش گرم عنان گشت، پی بردن دل
شعلهٔ برق به دنبال خسی افتادست ۲۸ـ
شبنم آخر شد و آن ماه نیامد نامی
شمع سان کار دلم با نفسی افتادست

....

بیگانه از وفاست بد انسان که هیچگه
اورا کسی به عیب وفا، متهم نداشت
شب چشمم از مطالعهٔ مصحفِ رُخت
عینك صفت ز روی تو چشم بهم نداشت

....

خیال کیست که باز آتشم به جان انداخت
چو شعله هر نفسم رقص در فغان انداخت
شمیم گلشن کوی تو، چون نسیم آورد
دلم به بوی تو، خود را از آشیان انداخت

....

حدیث وصل تو می گویم و به هجر خوشم
به جای دیده، به نظارهٔ تو گوش منست
چو پا به وادیِ عشقش نهی، قدم مشمار
زمین عشق، برون از شمار و فرسنگست
چو من به نالهٔ درد تو، شیون آغازم
اسیر درد شناسد که این چه آهنگست
چو دوست می طلبی، نام رنگ و بوی مبر
که حسن زاده بی بوی و عشق بی رنگست

....

منم که کنگرهٔ عشق جلوه گاه منست
فروغ نور خور، از سایهٔ کلاه منست
چو در خیال رخ دوست دیده بکشایم
هزار جلوهٔ معشوق در نگاه منست

....

عشق تو در درون دل از سینه در گرفت
وین آتشم به سینه ز راه نظر گرفت
پروانه را ز آتش هجران کباب کرد
آن آتش وصال که در بال و پر گرفت
نامی زچیست کز اثر دود آه من
صد شمع مرده باز به هر گوشه در گرفت

....

دل چو ذرهٔ موهوم و تن چو موی ضعیف
هزار کوه غمم در دل این چه بوالعجبیست!

....

هزار روز شد از وعدهٔ توام دیروز
هنوز چشم و دل من به جانب فرداست

....

بیدار مکن هر نفس از جنبش مژگان
آن غمزه که بر بستر ناز تو به خوابست

....

آتشم چون ز دل به جان نرسد
خانه پهلوی خانه افتادست

....

هر نامه ای که از تو به نامی رسیده است
صد بار بیش خوانده و از سر گرفته است

....

کاتب صنع در آنروز که ابرو می ساخت
بهر سنجیدن حسن تو، ترازو می ساخت
خواست نقاش، کشد صورت یوسف ز رخت
جانب روی تو می دید و ازانرو می ساخت
تابگوشی نظرم غمزه حدیثی گوید
ناز را معجزهٔ عشق سخنگو می ساخت
طبع نامی ز پی وصف دهان و خط یار
نکته هایی همه بار یکتر از مو می ساخت

....

چند دستم به گریبان رود از دست غمت
عنقریب ست که همسایهٔ دامان شده است

....

آخر از دست غمش، شد خانهٔ صبرم خراب
بوالعجب همسایهٔ دیوار بر دیوار داشت
جز پشیمانی گلی از گلشن عمرم نرست
گلبن امید ما گلهای حسرت بار داشت

....

دل تلخی کونین چو نوشست، مکیده
لب با شکر آلودن، عیب مگس ماست
ما کام دل خویش ز کونین بریدیم
محرومی جاوید نصیب هوس ماست

....

دانم که سوی اهل وفا گم نشود راه
برهر سر خاری اثری از جگر ماست

....

در دلم از ناز، پیکان برسر پیکان نشست
غمزه ات در سینه، خنجر برسر خنجر شکست

....

کسی که در طلبش رو به سوی کعبه نهاد
به نزد اهل وفا روی در قفا کردست

....

نیست آن دل، که مبتلای تو نیست
نیست آن جان، که در هوای تو نیست
آشنای کسی نشد نگهت
که دگر نازت آشنای تو نیست

....

فروغ شمع جمال تو نور دیدهٔ ماست
ز آفتاب غنی چشم سیر دیدهٔ ماست
هزار دستهٔ گل چید چشم از رخ تو
به باغ روی تو گلهای حسن چیدهٔ ماست

....

سیر گردون کن چو نامی گر سری داری به جیب
پا به دامان کش اگر سر در گریبان تو نیست

....

صد عشوه جا گرفته، در گوشهٔ کلاهت
صد ناز خانه کرده، در دامن نگاهت

....

از زخم خنجر تو، چون جان برد دل من
تا دسته می نشیند، هر خنجر نگاهت

....

دو شم از خاك، لب او به تبسم برداشت
یك بیك عقده ام از دل به تکلم برداشت

تا نگاهت پی خونریز دلم، بست کمر
منت بار سر از گردن مردم برداشت
ز استین ناله دردم چو برون دست کشید
امتحان، ناله کنان دست ترحم برداشت

....

چشمش ازان نمی نگرد، در نیاز مند
کاندر خور کرشمه و نازش نیاز نیست
بگداخت تن ز آتش غم، دل همانکه بود
این شیشه را در آتش سوزان گداز نیست

....

دل چاك گشته ز تیغ نگاه اوست
جان پاره پاره از مژه های سیاه اوست
میر سپاه فتنه و آشوب و ناز گشت
سر کردهٔ هزار کرشمه نگاه اوست
نامی چرا ز رشك نسوزم هزار بار
در هر دلی که می نگرم جلوه گاه اوست

....

بقدر حسن تو و آرزویم ار نگرند
فراق یکدم و صد سال صبر یعقوبست
دهی چو نامه نامی به دست او قاصد
نهفته گوی که: مضمون برون ز مکتوبست

....

در فراق آن بهشتی صورت حوری سرشت
جنتست امروز بر من آنچه فردا آتشست
ز آتش هجر تو بر من تنگ شد روی زمین
هر کجا رومی نهم زین آتش آنجا آتشست

....

رویست ز آب باده گلستان آتشست
می در پیاله ریز که دوران آتشست
امشب به سوز سینه خوشم، مهلت ای اجل
خاشاك نیم سوخته مهمان آتشست ۲۹ب
زان آتشی که در دل نامی زدست عشق
چون برهمن، همیشه ثنا خوان آتشست

....

محروم گشته دیده بختم ز روی دوست
کو برق جذبه یی که برم ره به سوی دوست
گم کرده بود دل به سوی کوی دوست راه
شد بوی زلف راهنمونم به کوی دوست
پر کردم از حدیث غمش، گوش روزگار
تا بعد ازین، کسی نکند آرزوی دوست

....

هر موی تنم مویه کنان بی تو زبانیست
لب بستن و خاموشی من نیز بیانیست
کس نیست که از حالت دردم شود آگاه
هر نکته یکی قصه و هر حرف بیانیست

....

چه شد چه شد؟ که ز طوفان گریه عالم سوخت
چه گریه بود که عالم در آتش غم سوخت
چو اخگر دلم، از دید شد ستاره فشان
فروغ آتش دوزخ به نیم شبنم سوخت

دل بدردش دوست شد ز انروی بامن دشمنست
دوست بهر دوست پیوسته به دشمن دشمنست
تا غم عشق تو، بامن داد، دست دوستی
با گریبان دستم و پایم به دامن دشمنست
نی ز اسلامم نصیب و نی ز کفرم بهره یی
هم به من زاهد بلست و هم برهمن دشمنست
من نمی خواهم که افتد هیچ چشمی بر رخش
دیده از رشك رخش با چشم سوزن دشمنست
دشمنی افتاده در اجزای جسمم سربسر
جزو جزو من، زسر تا پای، بامن دشمنست

....

دلم آیینه و در وی دو جهان جلوه گرست
صورت رفته و آئینه مرا در نظرست
نام آن غمزه چو بردم ز دلم درد چکید
چه کنم وای زبانم بسر نیشترست
هر کجا دیده کشایم، گل خورشید دمد
کافتاب رخ خوب تو، مرا در نظرست

....

تا در دلم ز دست تو شیون گره شدست
رگهای جان من، همه در تن گره شدست
آهم که حلقه حلقه برون می شد از درون
در دل، بسان حلقهٔ آهن گره شدست

....

چرا مرغ اسیر از غم ننالد
که پروازش بدست دیگرانست

....

تـو در مـقـابـل مـن و مـن در خیـال تـو
چشمم به باغ و دل به تـماشای دیگر است

....

ز آتش غم سوختم چندانکه خاکستر شدم
سوزم افزون شد مگر خاکستر من آتشست

....

شمع لگن سینه که سوزش همه دردست
گر شعلهٔ نورش نبود دردِ نفس هست

....

به یاد وصل تو، عمرم در انتظار گذشت
خوشم که بی تو به این حیله روزگار گذشت
گذشت عمر مرا در شمار روز فراق
بیا که روز فراق تو از شمار گذشت

....

بی صبری و نالیدن عاشق، به زبان نیست
خاموشی دل نیز کم از آه و فغان نیست
فریاد که آن غمزه به ایما و اشارت
صد قصه بیان کرده و حرفی به میان نیست

....

امشب از درد توام ناله گرانجانی داشت
دل زبیتابی هجر، آنچه تو می دانی داشت
تا گه از غمزه، به پای نگهم خار خلید
دیده گویا نگهی سوی تو پنهانی داشت
دوش در بزم کسان، از من و او دزیده
نگهش با نگهم، صحبت پنهانی داشت

....

فزون شود ز نگاهم، زمان زمان حسنت
مگر که صیقل حسن رخت نگاه منست

من از دو کون، به راه تو چیده ام دانه
غبار هستی کونین، گرد راه منست

....

ره یابی اگر در حرم بارگه عشق
دانی تو که عاشق که و معشوق کدامست
همت چو بلندست، فلك پایهٔ پستست
وز روی زمین تا به فلك یك دوسه گامست

....

امروز، از تو آئینهٔ دل، صفا نداشت
وان چشم آشنا نظر آشنا نداشت
هرگز نشد امید به سویت کز آنطرف
نومید گشته روی به سوی قضا نداشت

....

در انتظار رهش، صد هزار دیده کمست
بلی به راه وفا، حق بدست یعقوبست
به احتیاط دران کوی پای نه نامی
پر ملایکه آنجا به جای جاروبست

....

عشق در هر دلی که کار گرست
گریه بی نفع و ناله بی اثرست
سوخت پروانه ز اشتیاق و هنوز
همچنان در هوای بال و پرست
صد قیامت ز دل گذشت و هنوز
درد را حشر و ناله را حشرست

....

فغانم باز تاثیر دگر داشت
مگر از سوز درد من خبر داشت
نگاهم چید ازو صد دستهٔ گل
ازان گلشن که او باغ نظر داشت
نیفتد تا به رویش دیدهٔ غیر
سراپایش دو چشمم در نظر داشت

....

چشمش ز نگاهم بسر حرف زبانیست
هر یك نگهش ترجمهٔ راز نهانیست
ای پیرا لب از خنده بیهوده فرو بند
شادی و طرب، لازمهٔ عهد جوانیست
خوبیِ جهان در نظر عقل، چو خوابیست
گوش تو که نشنید نصیحت، ز گرانیست

....

بیدار مکن هر نفس، از جنبش مژگان
آن غمزه که بر بستر ناز تو به خوابست

....

می رفت و نهانی نظری جانب ما داشت
امروز گل عشوهٔ او بوی وفا داشت
بر بوی سر زلف تو دل سوی تو می رفت
هر چند که می رفت رهی، سوی بلا داشت
هر کس به جهان بود دگر رو به تو آورد
عشق تو مگر خاصیت قبله نما داشت

....

هر شب که ناله ام به سوی آسمان شدست
خیل ملك، ز درد دلم در فغان شدست

هر سو که بنگرم به سوی اوست دیده ام
چشمم مگر به غمزهٔ او، همزبان شدست

....

نگذرد برمن دمی کز یاد آن باغ جمال
هر دم از آهم گلی بر گوشهٔ دستار نیست
خواه در خلوت نشین و خواه بیرون جلوه کن
مانع نظارهٔ عاشق، در و دیوار نیست
از گلستان غم و درد تو در بستان جان
یك گلم نشگفت کز وی صد گل اندر بار نیست

....

هر ناز، کو به نرگس لیلی ذخیره بود
امروز آشکار به طرف نگاه تست
ای غمزه چیست کز نگهش پا کشیده یی
بخرام یکزمان که همان جلوه گاه تست

....

غنچهٔ دل بی لبت با خندهٔ گل دشمنست
رشتهٔ جان، بی سر زلفت، به سنبل دشمنست
تا غمت با صبر دشمن گشت و با دل دوست شد
عاشق بیچاره با صبر و تحمل دشمنست
سرفرو نارد به گر دون طبع نامی در جهان
گردن همت بلندان با تنزل دشمنست

....

مستی روزگار به پیمانهٔ منست
رقص فلك ز نعرهٔ مستانهٔ منست
سوزد چراغ مهر گر از رشك دور نیست
امشب که شمع روی تو همخانهٔ منست

....

می خواست که، بیند سوی من دید سوی غیر
افسوس! کـه ایـن تیـر بـه جای دگـر افتاد

....

از گـریـــه و از نـالـــه، تسلـی نپذ یـرد
تـــا ایـن دل غـربــت زده را میـل وطـن شد
بـر بـلبـل شـوریـده گـل از عشـوه بـخـندیـد
یك خـنـدهٔ گـل بـاعـث صـد گونـه سخن شد
رسـمیسـت کـهـن، پرســش یـاران کـهـن عـهد
چـونسـت کـه ایـن رسـم بـه عـهد تو کـهن شد

....

گـر چنیـن ابـرو وچشم خون دل بیرون کشد
چرخ نیـلی هـر زمـان پیـراهنی در خون کشد

....

شـب در خیـال روی تـو چشـمم بـه خـواب بود
تـــا روز در مشـــــاهـــدهٔ آفتـــاب بـــود
پـروانــه را ز عشـق بـه دل شـعـلـه در گـرفـت
بیـــچــــاره درمیـــان دو آتـــش کـبــاب بــود
در آتـــش فـراق تـو، هـر لـحـظـه چشـم زار
بیـخـود در اضـطـراب، چـو سایـه در آب بـود

....

چـه سـایـه شیـوهٔ دیـوانـگیسـت در ره عـشـق
کـــه آشـنـــا خبـر از آشـنـــا نـمـی گیـرد

....

جـــــان هیـــج بـــدرد مـــــا نســــازد
خـــود طـــاقـــت بــــار مـــا نـــدارد

غـم مـی نـرود بـخـواب راحـت
تـا سـر بـکـنـار مـا نـدارد

....

خوش آن بزمی کـه چون بام نگاهش در سخن آید
نـظر دزدیـده از گـلزار رویـش خوشه چین باشد

....

ز جـان، پروانـهٔ اویم، ولـی گـردش نمی گردم
کـه بال افشانی پروانـه شـمعم را ضرر دارد

....

ذوق عشـقـت عـاقبت سـرمایه سودا می دهد
مـی نهد زنجیر بر پـا سر بـه صحرا می دهد
عشـق را نـازم کـه والا منصـب دیـوانگـی
گـاه بـا مجنون و گـاهی با زلیخا مـی دهد
سـاحت ملك دلم دانسته گویا سر عشق
کـز زمین تـا آسمـانم درد یکجا مـی دهد

....

هـر لـحـظـه بر چراغ دلم، آستین مـزن
کـاین شعلـه را، چو بـاد رسد، تیز تر کند

....

خار و خس باد دران دیده، کـه بی نم باشد
خوشدلی دور ازان سینـه، کـه بی غم باشد
گـو بـمیرد همـه در حسرت و در ناکـامـی
هر کـه با زخم تو، در خواهش مرهم باشد
خستـهٔ دشنـهٔ آن غـمـزه دگـر جان نبـرد
گـر همـه برسـر او عیسیِ مـریم بـاشد
نـامـی از نـالـهٔ درد و غـم خود لـب بربـنـد
خلـق تـا کـی ز تو، در نـالـهٔ مـاتم بـاشد

....

آفاق ز بیتابی دردم گله دارد
دوزخ ز شرار نفسم آبله دارد
گویا، خبری یافته از گم شدن دل
این ناله که بانگ جرس قافله دارد

....

دل کام خود از لعل لب یار طلب کرد
در خنده شد و خنده اش آرایش لب کرد ۳۰ـ
یك گام ندیدست که بی تفرقه باشد
عقلم، همه آفاق به اندیشه وجب کرد ۳۱ـ

....

تبسمش، گرهٔ ناز بر جبین دارد
گل وفای بتان، رنگ و بوی کین دارد
مگر ز گلشن کویش، نسیم بوی گرفت
که باز باد صبا گل در آستین دارد
گیاه ناله، دمد از زمین سینهٔ من
هنوز گریهٔ من، تخم بر زمین دارد
کجا ز کوی تو نامی برون تواند رفت
به پای دل ز تو زنجیر آهنین دارد

....

ز بس بگریست، چشمم گشت بی نور
چراغ ار نم کشد، روغن بسوزد

....

آه ازین کودکان که در دل من
هر دم از تیر غمزه راه کنند
تختهٔ مشق کودکان شده دل
که به بازیچه اش سیاه کنند

....

عاشقان هر دم متاع درد و غم برهم نهند
بیغمان، بر زخم دل شادی به جای غم نهند
باد جان من فدای مردمی کز زخم درد
مرهم ریش دل خود، درد دل مرهم نهند
نالهٔ درد دل من بشنوند، ار اهل راز
نوحهٔ درد دگر، در گریهٔ ماتم نهند
از سرشك من، جهان در آتش سوزان نشست
نام دوزخ شاید ار بر قطرهٔ شبنم نهند
شعله سر بیرون کشد ناسی ز اشك دیده ام
سر برارد دانه، آری چون به جای نم نهند

....

دل بی سر زلف تو سراسیمگی ای داشت
چون صید گرفتار که از دام براید

....

مست چشمش، هوس باده و ساغر نکند
فتنهٔ لعل لبش، میل به کوثر نکند
با نگاهش، نگهم دست و گریبان نشود
که نگاه دگرش دست به خنجر نکند

....

غم در دل دیوانهٔ من، خانه نسازد
رسمیست که، دیوانه به دیوانه نسازد
هرگز نشود با دل من عقل و خرد یار
پیدا ست که بیگانه به بیگانه نسازد

....

نقد دل گم شده در کوی یکی، می ترسم
درمیان حاصل کونین به تاوان برود

....

به هوش باش که، هنگام کار می گذرد
تو غافلی و ز تو روزگار می گذرد
به روز وصل همه یاد هجر یار کنم
چه نشأه است که اندر خمار می گذرد
کجا به حوصلهٔ آتش سقر گنجد
ز آهم، آنچه به جان فگار می گذرد
گذشت از سر کویت جنازهٔ نامی
هنوز با دل امیدوار می گذرد

....

هنوزش غمزه نوخیز ست و لعلش خنده نا دیده
هزاران غنچهٔ نشگفته در شاخش نگه دارد

....

نگذشت هیچ آرزویی در ضمیر من
کافسون غمزهٔ تو، به رمزی ادا نکرد
هرگز گذر نکرد به سویش، نگاه من
کز گلشن امید گل تازه وا نکرد

....

خدنگ غمزه، نتواند کند یکره ز دل بیرون
به جذب شوق مقناطیس پیکانرا نگهدارد

....

به بزم غیر چو بینی مرا و رو تابی
تغافل نگهت، کار صد نظاره کند

....

مگر خواهد نهد طرح بنایی در دل تنگم
غمش امروز در گرد دلم، بسیار می آید

....

امروز چه شد، باز که ابر مژه نم داد
صد قافلهٔ صبر، به سیلاب عدم داد
هر مرغ که، جا داشت در ایوان تو، رم کرد
شب نالهٔ من سوزش مرغان حرم داد

....

سلطان گل ز باغ به شبگیر می رود
ساقی بیا که وقت ز تاخیر می رود
مطلق عنان به هر طرف آن غمزه را مده
چشمم به غمزهٔ تو عنان گیر می رود
عیبم مکن به رندی و بدنامی، ای حکیم
این گفتگو به عالم تقدیر می رود

....

سبزه نه از گلشن رویش دمید
ناز ز گلزار رخش سر کشید
معتکف دیده شده طفل اشك
تا نگه انگشت نگاهش مکید
دیده بیك چشم زدن می ربود
چشم تو، هر ناز که می آفرید

....

ز فسون معجز آیین، نظری بکار دارد
که به نیم غمزه چشمش دو جهان فگار دارد
نگهش ز نرگس او، ننهد ازان برون پا
که هنوز نرگس او اثر خمار دارد
نگهم، ز دیده خیزد همه دم، بغل کشاده
که همیشه با نگاهش هوس کنار دارد

....

برق پیمایان، کز آب دیده ره گل می کنند
کار بر پس ماندگان عشق، مشکل می کنند
جاوان چشمانِ او بهرِ گزند چشم بد
ناز را در گردن غمزه حمایل می کنند
ای خوش آن مستان که از خوناب اشك وآه دل
هر نفس آیینهٔ خورشید را گل می کنند
نامی از کوی بتان هر سوی بوی درد خواست
درد خیزد هر کجا عشاق منزل می کنند

....

چشم مستش با نگاهم دوش، در گفتار بود
او به خواب ناز و ناز غمزه اش، در کار بود
دوش از چشمش همی آمد خریدار نگاه
کاروان آرزو را تا چها در کار بود
از ره کوتاه دست، امید را پا بُود لنگ
نا امیدی هر طرف خار سر دیوار بود
گلشن رویش یکی در دیدهٔ من جلوه کرد
چشم من هر جا که می افتاد بر گلزار بود
امشب از شاخ نگاهم هر طرف گل می دمید
شوخ چشمی را مگر گل برسر دستار بود

....

ایام فراق تو مرا تنگ گرفته
عمرم عجبست ار به مه و سال رساند
یکمرغ نگاهم به تو پرواز نکرده
چشم دگری را به پر و بال رساند ۳۲ـ

....

شوخی که چشم او ره گلزار می زند
مستانه گل به گوشهٔ دستار می زند

غنچه ز شوق لعل لبت جامه می درد
گل بر زمین ز بوی تو دستار می زند
تا دید گل، جمال تو، از شرم هر نفس
از خون خویش، غازه به رخسار می زند
صورتگری که روی تو بیند ز بیخودی
بی اختیار تکیه به دیوار می زند

....

از دیدهٔ حیرت زده ام، خون جگر ریخت
فریاد ازین خانهٔ فرسوده که نم داد
نامی به غم عشق تو از ذوق الم مرد
می ساقیِ عشقت نه به اندازهٔ غم داد

....

به هر کجا سپه غمزه، تیغزن باشد
زخنده سربسر زخم او دهن باشد
به هر کجا سخن عشق، درمیان آید
حدیث لعل تو، پیرایهٔ سخن باشد

....

چند گویی ناصحا دست از گریبان باز دار
از گریبان خود چه گویی؟ حرف با جان میرود

....

ناله ام چون بر آسمان گذرد
برق را بر سنان پیچد
چون بر آرم نفس ز آتش دل
گرم بر خویش شعله سان بندد
رشتهٔ آه را بسر بندد
رسن ناله بر میان پیچد

....

غمزهٔ او، بسته ره آرزو
کس به تمنای دلی، چون رسد

....

حدیث وصل تو در آرزو، نمی گنجد
ازان طرف که تویی گفتگو نمی گنجد
چنان ز غمزهٔ او، چاك گشته سینهٔ من
که قدر یك سر سوزن رفو نمی گنجد
هجوم گریه گره شد، ز سینه می جوشد
شراب عشق تو، در هر سبو نمی گنجد
شدست نامی از اندیشهٔ غمش چون موی
هنوز در دل آن جنگجو نمی گنجد

....

نگاه من، چو به رویش رود به گل چیدن
نگاه او، نگهم را گلی بدست دهد

....

رسید قاصد و آورد از تو وعدهٔ وصل
نظر ز شوق نظاره ات، به گوش آمد

....

بسکه معانیست به هر حرف من
نامه ازان بار گرانی کند

....

گهی مشاهده آن نظر توانی کرد
که چشم صورت خود را دگر توانی کرد
نظارهٔ رخ جانان کنی به چشم نظر
گهی که چشم دلت در نظر توانی کرد
چو آفتاب، سری گر فرو بری در جیب
دگر به پای دل خود سفر توانی کرد

به ناله، سوز دلت، کم نگشت ای نامی
علاج دل مگر از چشم تر توانی کرد

....

آن غمزه دل مرا نهان برد
دزد آمد و رخت کاروان برد
از نالهٔ دل شدم، به سویش
بانگ جرسم به کاروان برد
شب، نسیم گل دماغ جان پریشان کرده بود
نرگسش از ناز، گویی گل به دامان کرده بود
بی تو، از بی طاقتی هر گه که کردم جامه چاك
دست شوقم دامنِ جانرا گریبان کرده بود

....

ناله را سر می دهم گو آتشین طوفان شود
می فشارم دیده را گو آسمان ویران شود
من نخواهم کرد سودای غمش از سر برون
گو گریبان هوس از دست دل دامان شود
مطلع خورشید گردد خانهٔ همسایه ام
گر شبی در خانهٔ تاریك من مهمان شود
خانهٔ دل کرد نامی عاقبت هجرش خراب
آنکه کرد اینخانه ویران، عاقبت ویران شود

....

چون نکتهٔ کلکم به فلك دانه دماند
زینگونه اگر تربیت دانه کند ابر

....

صید نگهت شد دلم، ای ماه! نگهدار
در رشته فگن تابی و کوتاه نگهدار

چشمش به کمین دگری تیغ کشید ست
ای دیده! تو مردانه سر راه نگهدار
نقد گهر دل، که به دست تو فتاد ست
خواهی به منش باز ده و خواه نگهدار
در راه تو از درد به هر سوی گره هاست
نامی! دگر این رشتهٔ کوتاه نگهدار

....

شمع افروختهٔ عشق، نمیرد هرگز
گو پی تجربه در رهگذر باد ببر

....

فهرست شهیدانش بیرون ز شمار آید
این جمع کجا گنجد فردا به حساب اندر
پیوسته بود جسمم، در آتش بی تابی
جان در تن من سوزد چون خون به کباب اندر
از رایحهٔ دردم، کونین معطر شد
سوزی به نهان دارم چون بو به گلاب اندر

....

طریق عشق از انرو بدیده پیمایم
که هست در قدم دیده جستجوی دگر

....

کام خسرو یافت از شیرین، کنون ای ابرغم
اشك حسرت، بر تمنای دل فرهاد ریز

....

من بیخود از نظارهٔ جانانه ام هنوز
بیرون نرفته بوی گل از خانه ام هنوز

صد بار بیش گشت مرا خان و مان خراب
چغدی نکرده بانگ ز ویرانه ام هنوز

....

یکی مرهم ز پی زخم دلت، می طلبی
هر دم از ناله، دلت را به خراش و به خروش
نقد، هر وقت تو، نامی! گهر بیش بهاست
مده از دست به بازی و به غفلت مفروش

....

ترا خوش باد هردم شادی و نوش
که من دارم به یادت غم در آغوش
چو عرض حال دل، گویم به پیشت
کنم طرز سخن گفتن، فراموش
چنان عشق تو ام، دیوانه کردست
که خود گویم حدیث و خود کنم گوش

....

ما بسته ایم از دو جهان در بروی خویش
در دل بریده ایم سر آرزوی خویش
ترسم که، از جمال ازل، پرده برفتد
روزی که دل رود بسر گفتگوی خویش
چون شیشه ام به قهقهه گر نیك بنگری
دارم هزار گونه گره در گلوی خویش
در باغ دهر، عمر تو یکروزه بیش نیست
ای گل مناز اینهمه بر رنگ و بوی خویش

....

دری که جای گرفتست در بنا گوشش
بهانه یی شده بهر گرانی گوشش

کرشمهٔ مژه اش هر زمان بیاد دهد
اگر به سهو شود غمزه یی فراموشش
عجب که نامی بیدل دگر به هوش آید
چنین که بادهٔ عشق تو برده از هوشش

....

بر آفتاب رخت، نیست قطر های عرق
که در بهار رخش، حسن آمدست به خوش

....

نزدیك شد که مرحلهٔ هجر، طی کند
شوقم چنین که بر زده دامان اشتیاق

....

هرجا که می روی تو، من از پی همی رسم
طی کرده پی گرفته رهت را به بوی دل

....

خون می خورم چو غنچه مگر خندهٔ گلم
نالم به صد ترانه مگر صوت بلبلم
تا آن پری، گمان نبرد از محبتم
جان محو از نظاره و من در تغافلم

....

تا دیده را، ز گریه به صد آب شسته ایم
چشم خود از مصاحبت خواب شسته ایم

....

به جستجوی تو، هر سوی چون صبا رفتم
رهم غلط شد و در کوچهٔ بلا رفتم

شکوه حسن تو، زانگونه ام ز جای ربود
که راه آمده را باز بر قفا رفتم
رسید نوبت پای طلب، به سعی دو چشمم
کنونکه در طلب او به سعی پا رفتم
به جستن تو، من و دل هم اتفاق شدیم
دلم جدا به طلب رفت و من جدا رفتم
چنان ز دست غمت، تنگ شد جهان نامی
که پای بر سرغم بود، هر کجا رفتم

....

از جنون عشق، شوری در جهان انداختم
غلغل بی تابی اندر آسمان انداختم
او به جانم دشمن و من حرف مهرش را به خود
آن قدر گفتم که خود را در گمان انداختم

....

بلبل خجل از نالهٔ من گشت به گلزار
ترسم که رهش بر گل و گلزار ببندم

....

چو شب شود ز تو چون شمع مرده جان گیرم
به شاخ شعله چو پروانه آشیان گیرم
ز دور آیم و دست نگه دراز کنم
در آستین نگه، غمزه را نهان گیرم

....

هستیم مهر وار به هر ذره نور بخش
گردیده گرد عالم و در خانهٔ خودیم

....

دل از درد فراق تو خروشان دارم
دوزخ سینه ز غمهای تو جوشان دارم

چون نیابی به جهانم به عدم خواهی جست
خانه پیوسته به بازار خموشان دارم

....

زنگار دل، از مصلقهٔ ناله، ز دودم
خورشید شد این آیینه بر روی که دارم

....

نه ناله بود، که من بی تو دوش می کردم
همه ز دست غمت، دشنه نوش می کردم

....

اگر اجازت بی نامیم جنون میداد
چها که با جگر اهل هوش می کردم

....

بگرفته دلم از در و دیوار زمانه
خواهم که دری بر رخ ایام بر آرم

....

منم که بی تو گرفتار شهر بند تنم
سزد که بر پرم و دام این قفس شکنم
نه چون چراغ ره باد کشتهٔ نفسم
در آتشم ز تو، چون شمع مرده، در کفنم
دران نفس که مرا دایه تربیت می کرد
چو شیر، بوی همی داد عشقت از دهنم
چنان شدم به تو یکروی و یکدل و یکتن
که هر که دید ترا، رفته در گمان که، منم

....

چو ذره، گرچه به مهر تو، دل قرین دارم
چو آفتاب ز تو داغ آتشین دارم
چنان به دیدهٔ من جا گرفته یی که مگر
نظر به روی تو ای شوخ نازنین دارم

....

نظرم از پی گلچینی ناز تو رود
چون گل عشوه ز باغ نظر آید بیرون
مژدهٔ آمدنت داد چو قاصد، جانم
از ره گوش برای خبر آمد بیرون

....

ناله مجروح از دل این مستمند آید برون
ناله یی کز درد خیزد درد مند آید برون

....

گر از تو تا به مقصد، یك گام مانده دور ست
گر صد هزار منزل طی کرده یی بیابان

....

آفتابی در پس دیوار این سر منزلست
جلوهٔ دیدارش از دیوار می آید برون

....

ما زمی وحدتیم، مست الست آمده
جام می بیغشیم، دست بدست آمده
سنگ ستم خورده ایم، بیش درستی مجوی
شیشهٔ ما در ازل، بهر شکست آمده

....

خون نیست جلوه گر به رُخ آتشین تو
جوشید حسن همچو عرق از جبین تو

....

با عشق تو، چون بسر توان کرد
کاین راه دراز و عمر کوتاه

....

باز از غم تو دلرا جوش هوس نشسته
امید باز گشته، خواهش به پس نشسته
بر وعدهٔ نگاهت صد قاصد نگاهم
بی دیده باز گشته، در ره ز بس نشسته
مو نیست بر سر من، سودات سر کشیده
از بس که در دماغم درد هوس نشسته
دل شد اسیر زلفت، خود گوچگونه داند
پرواز شاخ گلبن، مرغ قفس نشسته
از ضعف آنچنانم، کز سینه تا زبانم
صد جای نالهٔ من در هر نفس نشسته
نامی زجنس وصلش هر کس خرد متاعی
من چون گدای مفلس، بی دسترس نشسته

....

کو نگهی که تا کند رشتهٔ دلربایی
یا کششی ز جذب دل تا کنم آشنایی
صد گره از شکنج غم باز فتاده در دلم
غمزه کجاست تا کند تازه گرهکشایی
شربت وصل اندکی بیشترك به کام جان
چون نچشیده است دل چاشنی جدایی
نامی خسته را بود خواهش پرسش ازلبت
ناله به درد می کند زمزمهٔ گدایی

....

خوشدل شوم مگر که به وصلت رسیده ام
آید، چو از دیار تو ناگاه همدمی

....

زمانه گو نکند پشتی و فلک یاری
مرا بسست غم دوست در هوا داری
چه سحر بود ترا، در دو چشم خواب آلود
که تلخ کرده به من خواب را چو بیداری
هزار بار ازان دل به است آهن و سنگ
که یکدمش نکند درد او خریداری

....

ز بس خوارم ازان بیگانه پرور
گریزم چون ببینم آشنایی

....

چون صندل تب دارم، داغ تو به پیشانی
کفرست به کیش ما آیین مسلمانی
سوز عجبی دارم از خندهٔ پنهانت
داری نمکی گویا در خندهٔ پنهانی
داریم دلی فارغ از قاصد و از نامه
ناگفته همی دانی ننوشته همی خوانی
زاهدا! ز بهار من، بربند دماغ خود
کز عشق بسر دارم گلهای پریشانی

....

چو راه عشق نرفتی به کاروان نرسی
اگر زخود نگذشتی، به همرهان نرسی
زغم به ناله در آیی، هنوز بیدردی
به ذوق غم نرسی تا زغم به جان نرسی
مسافران ره او، به طی مرحله اندر
ز پا چو خار براری به همرهان نرسی

....

از مطلع ضمیرم سر بر زد آفتابی
مه را مهین شریکی، خورشید را جوابی
باز از شکنج دردت، تنگ آمده درونم
لب تشنه فغانم چون تشنه یی به آبی
من گلستان عشقم، از پرتو جمالش
برهر سر نگاهم، گل کرده آفتابی
تا از خمار هستی، فارغ شوم زمانی
کو مستی جنونی، کو نشهٔ شرابی
تاچند از تو باشم پیوسته همچو نامی
در خواهش خیالی در آرزوی خوابی

....

رباعیات

ای در تو نهان، ز خاک تا اوج سما
چون آینه ساز جوهر جان ز صفا
رو قطرهٔ دل چو ساحت دریا کن
تا محو شود قطره درون دریا

....

در دیده ز بس خیال یارست مرا
جان و دل و دیده لاله زارست مرا
دل از هوس وصل فگارست مرا
پا در طلبش برسر خارست مرا

....

ای آنکه نرفته یی ره مقصد را
کی دانی که طریق نیک و بد را
گر حال درون خود به خود بنمایی
شاید که به دست خود بسوزی خود را

....

نامی چو نخفته ای جهانرا دریاب
بنیاد زمانه هست چون نقش بر آب
با تو گویم که حاصل دنیا چیست
بیداری یکزمان و باقی همه خواب

....

نامی ز غم فراق محزون می گشت
در بادیه ای که باد مجنون می گشت ۳۳ـ
خورشید اگر پای نهادی آنجا
سر تا به قدم آبلهٔ خون می گشت

....

این کاشته برداشته بگذاشتنی است
تخم دگری درین جهان کاشتنی است ۳۴ـ
چیزی که گذشتنی است می برداری
می بگذاری هر آنچه برداشتنی است

....

نامی تو که کام خواستی، کام کجاست
در گردش روزگار، آرام کجاست
صیاد قضا نهاده دامی زاجل
مرغی، که برون جهد ازین دام، کجاست

....

اوراق فلك، دفتر پارینه ماست
گنجینهٔ اسرار ابد، سینهٔ ماست
راز ازل، اندر دل بی کینهٔ ماست
نقش دو جهان پرتو آیینهٔ ماست

....

چون مست، به هر ترانه، می باید ساخت
چون طفل، به هر فسانه می باید ساخت
از من بشنو نصیحت، ای یار عزیز
شرطست که، با زمانه می باید ساخت

....

جانم، دگر امروز شرار افروزست
دل باز، به ناله های دوزخ سوزست
از چیست که امروز ز دست تو، رمید
صید دل من، که مرغ دست آموزست

....

غم را، به دلم، دوستي جاویدست
با دوستیش، دلم پر از امیدست
از عشق تو، پای تا سرم پر مهرست
وز مهر تو، ذره ذره ام خورشیدست

....

ما آمده بودیم درین باغ بگشت
چون ابر بروی سبزه، چون باد بدشت
چون نرگس پر خمار، ناگاه از خواب
تا چشم کشادیم ز هم عمر گذشت

....

چون خاك شود ز غم وجود پاکت
وز حادثه برباد دهد افلاکت
جز سبزه، کسی سر نکشد بر گورت
جز باد، کسی پا ننهد بر خاکت

....

از کردۀ معصیت دلم دو نیمست
پر نامه ز بد چو جدول تقویمست
ای وای! چو نامه ام به محشر آرند
بر دوزخ و بربهشت آن دم بیمست

....

دل دوست نهاده نام آن دشمن دوست
چون مایل دشمنست، دشمن تر ازوست
آن دوست که من گرفته ام دشمن خوست
دشمن بود آنکس که بود دشمن دوست

....

از وصل تو صد گونه دل من ریشست
وز هجر تو ام قیامتی در پیشست
دم در کشم و نفس به بیرون نکشم
کز دل تا لب هزار دوزخ بیشست ۳۵ـ

....

غم بر جانم، ز نو غمی آور دست
وز درد متاع عالمی آوردست
نی نی، ز پی هلاك من قاصد هجر
پیچیده به نامه ماتمی آوردست

....

دل از می عشق، باز قلزم نوشست
وز موج سرشك دیده دریا پوشست
از حیرت آن جمال و گفتار چو نوش
گوشست تمام چشم و چشمم گوشست

....

بر روی بتان، نگاه از دور خوشست
هر دیده ای که او کجست، بی نور خوشست
هر کس که، به چشم بدبه خوبان نگرد
دور از رخ صاحب نظران، کور خوشست

....

چشمم که به گریه های دل، می خندید
دامان مژه به قلزم دیده کشید
آن جان غم آشتی، شادی دشمن
چیزی، که ز گریه دید، از خنده ندید

....

خواهی که دلت شود بسان خورشید
آیینهٔ دل پاك كن از بیم و امید
با آینه یك مو نرسد، سود و زیان
بینندهٔ آن اگر سیاهست و سفید

....

ای از تو دل مرا تمنای امید
چشمیست مرا از توبه پهنای امید
صحرای دلم، که از دو عالم بیشست
افتاده درو، امید بالای امید

....

چون داغ، دهان بی زبان باید بود
چون نعل، زبان بی دهان باید بود
با این دهن و زبان، که گفتم، همه عمر
از درد دل خود، به فغان باید بود

....

هر گه که غمت، به جان من آمیزد
دوزخ ز شرار نفسم بگریزد
چون توسن ناله ام، شود گرم عنان
از دل، همه گرد آتشین برخیزد

....

عشقت نه متاع هر خریدار بود
اورا دو جهان بهای یك تار بود
گل نیست، که در کوچه و بازار بود
یا مشك، که در دکان عطار بود ۳۶ـ

....

از جان، غمت ای دوست! نهان خواهم کرد
لب بسته، ز درد تو فغان خواهم کرد
صد جان به هوس گرد سرم خواهد گشت
این کار که امروز به جان خواهم کرد

....

تیر مژه را چو غمزه، پیکان گردد
صد جان به هوس آید و قربان گردد
چون تیغ کشی، ز بیم خوی تو، اجل
در قالب کشتهٔ تو، پنهان گردد

....

بیچاره کسی که از ره بخت افتد
سهلست کسی که از سر تخت افتد
کاری نکنی، که از نظرها افتی
افتاد هر آنکه از نظر سخت افتد

....

پیوسته دو دیده لاله گون می آید
دل نیز چو دیده غرق خون می آید
وا رستگی ای گرت به عالم هوسست
دیوانگی ای به از جنون می آید

....

جویای جمالش، ارچه بسیار بود
هر دیده، نه لایق رخ یار بود
هر کفر، نه اندر خور زنار بود
هر سر، نه سزاوار سر دار بود

....

روزی که دلم ز دهر نومید شود
جان باز بسر منزل جاوید شود
ذرات وجودم که به مهرت شده خاک
کمترِ ذره ازو چو خورشید شود

....

مهر تو، نه آن مهر که، از جان خیزد
نقش تو، نه آن نقش که، از دل برود
از دل عجب ار صورت قاتل برود
کِی ز آئینه نقش در مقابل برود

....

آنکس که به منتهای وادی نرسد
تا یافته رنج و غم به شادی نرسد
در دهر بدان که، نامرادیست مراد
چیزی به جهان به نامرادی نرسد

....

گر دل زغم عشق به گفتار افتد
آفاق ز گفته ام، به زنهار افتد
رمزی اگر از عشق تو برلب رانم
سر ازل و ابد به بازار افتد

....

چون داغ ز دیده خونچکان باید بود
لب بسته ز درد در فغان باید بود
چون غنچه به خنده ای نهان باید بود
خاموش چو گل به صد زبان باید بود

....

عاشق ز فراق یار در جوش شود
یابد چو وصالش، همه تن گوش شود
دریا که بود همیشه در جوش و خروش
چون سوی محیط رفت خاموش شود

....

نامی ز چه اسرار تو پنهان باشد
برسر تو ظاهر تو عنوان باشد
چون شیشه شو از صافدلی، پاك ضمیر
تا، ظاهر و باطن تو یکسان باشد

....

هر دم، الم از درد، بجان می دزدم
صد نشتر شعله از فغان می دزدم
غم می مکم، ایدوست! ز سبابهٔ آه
از ناله بدل زخم سنان می دزدم

....

ای تازه و تر شگفته، مانندهٔ گل
بنگر، سوی اوراق پراگندهٔ گل
ایام بقای زندگانی، بمثل
چون گریه شبنمست و چون خندهٔ گل

....

نامی چه شد ار تو تختگاهی کردی
در قصر زراندود پناهی کردی
خوبی جهان، به صورت آیینه دان
انگار درو تو هم نگاهی کردی

....

نامی به قضا رو به تمنا میرو
ره جانب آرزو چلیپا میرو
پشتت به امید داد، پهلو به مراد
رو تافته از خود بپس پا میرو

....

ای آنکه، بر آن رخت نظر می باید
چشم تو ورای چشم سر می باید
خواهی که ز عشوه هاش غافل نشوی
در چشم دلت چشم دگر می باید

....

آنرا که، به معشوق نظر می باشد
در هر نظرش، چشم دگرمی باید
نظاره آن جمال، آسان نبود
در هر سر مو، هزار سرمی باید

....

آنرا که، به غمزه اش نظر می باید
در خورد نظاره اش جگر می باید
آسان نبود نظر، سوی غمزهٔ دوست
یك دیده وصد هزار سر می باید

....

عشقت، چو به سینه آتش افگن، گردد
چون سنگ تن از سوختن من گردد
دل سخت شد، از بس که تن از عشق گداخت
هر گه که گداخت سنگ، آهن گردد

....

تا کی ز ستمهای تو، ای رشك بهار
تا چند ز بی مهریت، ای لاله عذار
از آه زنم دستهٔ سنبل برسر
وز ناله نهم شاخ گل بردستار

....

خواهی که شوی بهره ور از عالم جان
دمسازی کن، به گریه و آه و فغان
چون شمع، به گریه باش بی منت چشم
چون نی، همه ناله باش بی کام و زبان

....

ای دردا! ترا به جان من کار دراز
غمهای ترا، بر دلم آزار دراز
وصل تو، چو عمر صبح، بسیار اندك
هجر تو، چو روزگار، بسیار دراز

....

هر چند که، بی تو میکشم از دل، آه
فریاد که، یکره نکند بر لب راه
افتاد به آه دلم از بس که گره
آه دل من ازان بر آمد کوتاه

....

پیچیده به سینه ام، نفس می گردد
چون مرغ اسیر، در قفس می گردد
زانگونه ضعیفم که، اگر آه کشم
برلب نرسیده، باز پس می گردد

....

آهم همه نقد دل به صحرا داده
چشمم ز جگر مایه به دریا داده
خسران زده ای چو من، کجا خواهد بود
هم مایه و هم سود، به یغما داده

....

ای روی تو، چون مهر فلك، عالمسوز
خندان ز رخت جمال عید و نوروز
چون هست رخ تو، در جهان بزم افروز
گو دور شو از میان چراغ شب و روز

....

گر با غمِ تو، دسترس داشتمی
غم داشتمی تا نفسی داشتمی
غمخواری من، اگر غمت می کردی
من نیز چو دیگران کسی داشتمی

....

جانیست چو شعله ام در آتش جانی
بر آتشم آه می کند دامانی
آن نیست که آتشم دگر بنشیند
گر زانکه در آب کوثرم بنشانی

....

دریا موجم، ز ابر بارانیِ خویش
درزخ فوجم، ز آه طوفانی خویش
بر عارض مهر، همچو مه نیل کشم
گر آه کشم ز سوز پنهانی خویش

....

ای عشق، نه آتشی بلای دگری
گه دردی و گه درد دلم را اثری
گر آه همی کشم، تو یی در دل آه
ور ناله همی کنم، تو در ناله دری

....

در عشق بسوز، اگر تو یی صاحب حال
از آتش عشق، عاشقا نراست کمال
پروانه رسد به شمع پایش سوزد
پروانهٔ ماراست ز آتش پر و بال

....

من بی تو، ز آتش هوس، می میرم
چون مرغ اسیر، در قفس می میرم
چون آتش کاروان، که در پس مانده
نه مردم نه زنده هر نفس می میرم

....

افگند ز پا هجر بلا انگیزم
چون پای ندارم، به کجا بگریزم
از ضعف چنان شدم، که آویزم دست
در دامن ناله و ز جا برخیزم

....

ما دست، ز دامن هوس، وا زده ایم
صد لطمهٔ طعن، بر تمنا زده ایم
خاشاك تمنا، همه جمع آورده
آتش به متاع آرزوها زده ایم

....

از یاد تو، خویش را فراموش کنم
خود حرف غمت گویم و خود گوش کنم
ترسم که، جهان ز درد آزرده شود
لب بندم و ناله های خاموش کنم

....

زان اخگر آتشین که، در تن دارم
از دیده شرارها به دامن دارم
عشق آتش و تن فتیله و دل فانوس
هر شب، ز تو این چراغ، روشن دارم

....

آنم که، ز عشق دل به سامان دارم
صد طعن، به ملك روم و خاقان دارم
چشمی به خیال روی جانان دارم
در خانه نشسته، گشت بستان دارم

....

نامی نیم آنکه عهد مشرب شکنم
گر توبه کنم بروز، در شب شکنم
گر توبه، ز دل بر آیدم، باکی نیست
صد توبهٔ نا رسیده بر لب شکنم

....

من ذوق لب تو، از سخن می یابم
ذوقست دران سخن که من می یابم
حرفی که، ز لعل تو بر آید، آنرا
می گویم و ذوقش بدهن می یابم

....

از حرف تو، لذت شکر می یابم
می گویم و از لبت اثر می یابم
هردم به زبان همی کنم تکرارش
هر مرتبه، لذتی دگر می یابم

....

یکچند پی زینت و اسباب شدیم
یکچند به بیهوده به هر باب شدیم
یك چشم زدن، چشم گشادیم ز خواب
تا چشم بهم زدیم، در خواب شدیم

....

من مشتریم، لیك خریدار خودم
دلال متاع زر بازار خودم
حرف تو، به خود گویم و خود گوش کنم
دیوانه صفت عاشق گفتار خودم

....

از عشق تو، پشت سوی ننگ آوردم
اندر طلبت، جهان به تنگ آوردم
پایی به هزار ره، به سنگ آوردم
تا همچو تو دلبری، به چنگ آوردم

....

دور از تو، چو نخل خشك، بی برگ و برم
چون داغ درون همیشه باچشم ترم
رحم آرا! به مرده جانی من، که ز تو
نه مردم نه زنده، چون چراغ سحرم

....

آنم که، دل از دو کون برداشته ام
اسباب جهان، در آتش انداخته ام
در آتش خود چو شمع، بگداخته ام
پروانه صفت، به سوختن ساخته ام

....

دارم، دردی نهفته در جان، از تو
هیچم نبود امید درمان از تو
درد تو مرا از تو نهان خواهد گشت
ای دلبر بی درد، چه پنهان از تو

....

المعمیات

باسم آهی:

عشاق اگر به کام وصل تو، رسند
کی محنت هجر پیشت اظهار کنند
پیش تو چه گویند، توهم می دانی
ای ماه رخ! آنچه در فراق تو کشند

سالم:

چه غم ای دل گر اول گفت حرفی سخت بر رویم
ز مهر آنماه بین آخر فشاندست آستین سویم

میر:

تا کی ز درد هجر بنالیم چون جرس
ای دل! به یار گو که: به فریاد ما برس

قراری:

با بودن رویش دلا دایم چه باشد روی مه
بی عارض آن دلربا خوبست ماه چارده

میر یمینی:

چون شبم یاد کردی از یاری
گویم از دل بروز یاد آری

است:

همه دارند وصلش را تمنی
دل ماخود ز دیدن شد تسلی

ساقی نامہ

تقی کاشی نے لکھا ہے کہ میر معصوم نے دو ''ساقی نامے'' تصنیف کیے، خوش قسمتی سے، ایک ''ساقی نامہ'' مجھے ایک بیاض سے مل گیا، جو بیاض میر غلام علی ''آزاد'' کے گھرانے میں موجود ہے۔ ''ساقی نامہ'' مکمل نہیں ہے، لیکن جتنا بھی ملا ہے وہ بہرصورت غنیمت ہے۔

الا ای دلِ گشتہ از ہوش مست
پیِ خواهشِ دل، شدہ بت پرست
تو تا کی چنین بت پرستی کنی
نہ دیوانہ ای؟ چند مستی کنی
بہ ہوش آی یکدم زمستی خویش
برون آی از بت پرستی خویش
بت شیشہ را، در بغل آر تنگ
برون آی از کسوتِ نام و ننگ
تنت را یکی شست و شویی بدہ
رخت را ز می، آبرویی بدہ
گذر کن بہ میخانہ ای اہل درد
کہ بویت ترا سازد از خویش فرد
در و بام او، از نشاط و طرب
ز عشرت خم وشیشہ را لب بہ لب
بہ خاك عبیرش چنان بیختہ
بہ می آبِ حیوان در آمیختہ
بہ کف ساقی بزم جام شراب
زدہ پنجہ بر پنجۂ آفتاب

هوایش موافق به صبح دویم
به ذرات فیضش مه و مهر کم
ضمیر خمش آفتاب منیر
به هر قطره خورشید اندر ضمیر
شفق باده، سیارها چون حباب
خُم می، فلك خشت، خم آفتاب
درو جا گرفته فرشته و شان
ز دنیا و عقبیٰ نجسته نشان
گروهی به بیگانگی آشنا
به دیوانگی گشته از خود جدا
فشانده بدین خاکدان دامنی
به بر کرده از خاك پیراهنی
به بدنامی خویشستن در خروش
به رسوایی دیگران عیب پوش
حریفان سرمست و بیدار دل
بریده به یکباره ز اغیار دل
نهاده به بی دانشی دل همه
به رسوایی خویش مایل همه
به بدنامی خویش پر داخته
لباسی به دیوانگی ساخته
ازان پی که هر گه شود شعله تاب
کند روز را شب، به شب آفتاب
شعاعش، اگر پرتو افگن شود
جهان همچو خورشید، روشن شود
کند پر توش، گر سوی دیده، راه
دگر تا ابد مست افتد نگاه

سپهرِ حرون، تیز جولان ازو
بساطِ زمین، تنگ میدان ازو
چو دور افگند خشت خم می فروش
فلك چون خمِ می، در آید به جوش
حبابی که برباده اش مسکن است
سراپای او، دیدهٔ روشن است
نباشد فروزان شراب، از حباب
شگفت است از می، گلِ آفتاب
گریبانِ پرهیز، ازو چاك چاك
دلِ زهد و تقویٰ، ازان دردناك
گنه را ازو مایهٔ پردلی
درو رسم دیوانگی عاقلی
سواریست باده به میدانِ غم
ز جام و صراحیش طبل و علم
چو پنبه ز گوشش بر آری برون
فرو ریزد از دیده سیلاب خون
تو هم پنبه از گوشِ مینا بر آر
صراحی و بربط به غلغل در آر
که یکدم ز دوران کناری کنم
وزان سوی عالم، گذاری کنم
بیاو بده جام چون آفتاب
که از بوی او مرده خیزد ز خواب
بیا ساقی! آن آتشین جام را
که برده ز سیماب آرام را
به من ده که تا بیقرارم کند
گلِ آرزو در کنارم کند

بیـا سـاقی! آن شـکرین جـام را
کـه شیـریـن کـنـد تلخی کام را
مـغـنـی! بیـاو طـرب سـاز کـن
نشـاطـی بـه شادی هم آواز کن
مـغـنـی! بـزن یـکـره ایـن تـار را
کـــه بیــرون بـــرد از دل آزار را ۳۷

بعـد کـے تذکرہ نگاروں نے اکثر اپنے تذکروں میں میر کـے اشـعـار ایك دوسـرے سـے نـقـل کـیـے ہیں، چند اشعار ایسـے مـلـتـے ہیں جو پہلے کـے مآخذ میں نہیں آئے۔ ذیل میں اسی قسـم کـے مـنـتـشـر اشـعـار تذکرہ کـے حوالے سے نقل کیے جاتے ہیں:

ابیات متفرق

نامی ز زمانه بار بردار
رو آر بآن جهان سبکسار

....

تو خفته بره و کاروان تیز
تو سنگ خودی ز راه برخیز ۳۸؎

....

در دلم صد سیل اشك و برلبم صد برق آه
عشق را نازم که پیدا آب و پنهان آتش است ۳۹؎

....

یہ مثنوی کا بیت ہے:

اگر در سایه سرو ایستادی
برآن سوی دگر سایه فتادی ۴۰؎

....

حسن است که او جلوه گر برسر ناز است
عشق است که باحسنِ ازل، محرم راز است
امشب به تمنای مهِ روی تو، تا روز
چشمم، چو درخانه ای غارت زده، باز است ۴۱؎

....

چغدی دیدم نشسته در صبح پگاه
بر کنگرهٔ مقبرهٔ شرو انشاه
فریاد کنان ز روی عبرت می گفت
کو آن همه حشمت؟ و کجا آنهمه جاه؟ ۴۲؎

....

باگشت چمن ز تو تسلی گشتیم
وز دوست به گفتگو تسلی گشتیم
دیدم که وصال و هجر یکسان بوده است
از وصل، به آرزو تسلی گشتیم ۴۳؎

....

کچھ ابیات کتبوں میں ہیں جو آنے والے ابواب میں دیے جا رہے ہیں۔ فی الحال میر معصوم کا اتنا کلام ہماری دسترس میں آیا، ممکن ہے کہ اس کے بعد کبھی ان کا سارا کلام یا یہاں درج شدہ کلام کے علاوہ کچھ اور مل جائے یہ بعد کے محققین کا کام ہے اور اس سلسلے میں کوششیں جاری رکھنی چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ میر معصوم کے اہل خانہ اگر اپنے اثاثے کا اچھی طرح جائزہ لیں گے اور تلاش کریں گے تو میر کا ادبی سرمایہ لازماً دستیاب ہوگا۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ صرف یہی یادگار ہے جس سے میر کا نام قائم رہ سکتا ہے اور خاندان کی نیک نامی برقرار رہ سکتی ہے اور سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں سوائے علمی آثار کے جو اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک یہ دنیا قائم ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دیوان ۱۰ ذیقعد ۱۳۵۱ھ (مارچ ۱۹۳۲ء) جو کہ سکھر میں نقل ہوا۔

۲۔ عرفات تقی اوحدی: ''الحق اورا قوت و قدرت عظیم در شاعری بود'' رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن، ص ۳۴، جنوری ۱۹۲۹ء

۳۔ نفائس: ''اگرچہ رطب و یابس در کلامش فراوان است'' گل رعنا کی عبارت بھی اسی طرح ہے۔ ''نفائس'' کی عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ رائے تقی اوحدی کی ہے۔ جیسا کہ لکھتے ہیں: درینجا تقی اوحدی گوید کہ......... الحق اورا قوت و قدرت درین فن بود اگرچہ رطب و یابس در کلامش فراوان است.

۴۔ یہ شعر، مطربی نے مطبوعہ نسخے کے علاوہ دیا ہے۔

۵۔ طبقات و تذکرۃ الشعراء مطربی، ص ۱۵۔

۶۔ بدایوانی کے علاوہ یہ شعر طبقات، گل رعنا، مخزن الغرائب، شمع انجمن، تاریخ مظفری (خطی انجمن) میں ہے۔

۷۔ گل رعنا، مخزن الغرائب۔

۸۔ گل رعنا، مخزن الغرائب، انیس العاشقین، نشتر عشق۔

۹۔ طبقات، ماثر الامرا، مقالات الشعراء، گل رعنا، نشتر عشق، ''مخزن الغرائب''، یہاں یہ تمام اشعار بدایونی میں بھی ہیں۔ (۳:۲۶۶)

۱۰۔ ''مخزن الغرائب ''۔
۱۱۔ ''گل رعنا''، ''مخزن الغرائب''۔
۱۲۔ ''گل رعنا''۔
۱۳۔ ''مخزن الغرائب''۔
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ تقی کاشی، مخزن الغرائب، نگارستان سخن، گل رعنا۔
۱۶۔ گل رعنا، مخزن الغرائب۔
۱۷۔ تقی کاشی۔
۱۸۔ مخزن الغرائب۔
۱۹۔ تقی کاشی، مخزن الغرائب۔
۲۰۔ مخزن الغرائب، یہ رباعی عادل شاہ فاروقی کے مقبرہ پر میر کے نصب کردہ کتبے میں ہے۔
۲۱۔ مخزن الغرائب۔
۲۲۔ مخزن الغرائب۔ یہاں تک مذکورہ کلام بدایونی میں نقل کیا گیا ہے۔ (۳:۳۷۰۔۳۷۵)
۲۳۔ جوابیات اور رباعیات اس سے پہلے کی کتابوں میں آئی ہیں یا درج ہوچکی ہیں وہ اوپر دی گئی ہیں۔
۲۴۔ مخزن الغرائب۔
۲۵۔ مخزن الغرائب، نشتر عشق، روز روشن۔
۲۶۔ ریاض الشعراء
۲۷۔ مجمع النفائس، ریاض الشعراء۔
۲۸۔ ریاض الشعراء
۲۹۔ مخزن الغرائب، شمع انجمن، گل رعنا، مجمع النفائس، نشتر عشق۔
۳۰۔ نشتر عشق، انیس العاشقین، مخزن الغرائب، روز روشن۔

۳۱۔ روز روشن، مخزن الغرائب۔
۳۲۔ ریاض الشعراء۔
۳۳۔ نشتر عشق، مخزن الغرائب، انیس العاشقین، ریاض الشعراء۔
۳۴۔ مخزن الغرائب۔
۳۵۔ مخزن الغرائب۔
۳۶۔ مخزن الغرائب۔
۳۷۔ بیاض کے ورق ۲۲۱ ب، تا ۲۲۲ الف تک نقل کیے گئے۔
۳۸۔ یہ دونوں اشعار عادل شاہ فاروقی کے مقبرے پر میر کے نصب کردہ کتبے میں ہیں۔ (معارف، مارچ ۱۹۲۱ء)
۳۹۔ روز روشن، مخزن الغرائب، نشتر عشق، ریاض الشعراء۔
۴۰۔ مجمع النفائس، گل رعنا۔
۴۱۔ ریاض الشعراء۔
۴۲۔ مآثر الامراء، ۳۲:۵۳۷، گورستان میر معصوم، مقبرہ شاہ بداغ
۴۳۔ گل رعنان، مجمع النفائس۔

(۱۶-۱۰-۱۹۷۸ء)

باب - ۳۰

کتبات

این خط جاده ها که به صحرا نوشته اند
یاران رفته با قلمِ پا نوشته اند

[راہ کا یہ نشان جو ریگستان میں لکھا گیا ہے، وہ گذشتہ دوستوں نے پاؤں کے قلم سے لکھا ہے۔]

اگلے صفحات میں میر معصوم اور ان کے فرزند میربزرگ کے کتبات درج کیے جا رہے ہیں۔ کتبات مزید ہوں گے۔ لیکن کچھ برباد ہو گئے اور کچھ ابھی دستیاب نہیں ہوئے، جو مل سکے ہیں انھیں یہاں تاریخی ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے۔

کتبات، تاریخ نویسی اور واقعات کی کڑیاں ملانے کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کتبے میر معصوم کی زندگی سے متعلق کئی گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور کئی اہم واقعات ان کے ذریعے حل ہوتے ہیں۔ ان کے سفر اور سفر کے راستوں کا علم بھی ان ہی کتبوں سے ہوتا ہے۔ میرصاحب آخری مرتبہ آگرے سے کب روانہ ہوئے اس کے متعلق کتابوں میں کوئی معلومات نہیں ملتی۔ ان کی قبر پر تاریخی کتبے کے باوجود مؤرخین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میر ۱۰۱۴ھ میں فوت ہوئے ہوں گے۔ اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ میر نے ۱۰۱۹ھ میں وفات پائی ہے۔ میر کے مدھکر والے کتبے سے نہ صرف ان کا آگرہ سے روانہ ہونے کا سال بلکہ مہینے کا بھی علم ہوتا ہے اور اسی سے ان کی بکھر میں آمد

اور قیام کا وقت متعین ہوتا ہے۔ اسی طرح میر بزرگ کے ۱۰۱۵ھ کے کتبے سے نہ صرف میر بزرگ کے قندھار جانے کے زمانے کا علم ہوتا ہے بلکہ اس میں میر بزرگ نے اپنے والد کے لیے ''مرحوم'' کا لفظ لکھ کر وفات کے معاملے کو واضح کر دیا ہے۔

آسیر کی فتح کی تاریخیں اور ایران جانے کا راستہ اور زمانہ بھی کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ایران کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے اس سفر میں اپنا خمسہ مکمل کیا۔ مسجد علی (اصفہان) کے کتبے پر پہلی مرتبہ، خمسہ کی مثنویات کے نام اور ابیات دیے گئے اور لکھا گیا کہ خمسہ اسی سفر کے دوران مکمل ہوا۔

میر صاحب کے اشعار کا زیادہ ذخیرہ ہمیں ان کتبوں میں محفوظ ملتا ہے۔ قبرستان سے ان کی بڑی تعداد ملی ہے اور کئی نئے اشعار اور دوسرے کتبوں کے ذریعے ملے ہیں۔

آسیر جاتے ہوئے آگرہ سے برہان پور تک بادشاہ ساٹھ مقامات پر ٹھہرے، سفر اڑتالیس دن رہا۔ ا۔ ظاہر ہے کہ میر نے ہر منزل پر کتبے نصب کیے ہونگے لیکن ہماری رسائی صرف کچھ کتبات تک ہوسکی ہے۔ جو اپنی جگہ پر تاریخی تعین کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔

میر صاحب کے خط کی سب نے تعریف کی ہے لیکن کتبات سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ میر صاحب کا نستعلیق خط صاف اور رواں ضرور تھا لیکن انھوں نے کتبہ نویسی اور خط کے شاندار نمونے نہیں چھوڑے۔ فنی لحاظ سے بھی کتبہ نویسی کی سندھی روایت کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے حالانکہ میر کے اپنے دور میں سندھ میں ترخانوں کے کتبے، خط اور فن کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے جن کو میر جیسے شوقین نے ضرور دیکھا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میر

صاحب کے مدنظر فن یا خط نہیں تھا ان کا مقصد کتبوں کے ذریعے اپنے تاریخی آثار چھوڑنا تھا جس میں وہ یقیناً کامیاب رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں کتبہ نویس بھی میر صاحب کے ہم راہ رہتے تھے۔ وہ مناسب مقامات پر پتھر پر خود لکھتے تھے اور سنگ تراش کندہ کر کے کتبہ تیار کرتے۔ میر بزرگ نے بھی اپنے والد کا یہی طریقہ اختیار کیا ہوا تھا۔

آنے والے صفحات میں دونوں سیدوں کے ۵۴ کتبات دیے گئے ہیں۔ ان میں سے متعدد کتبات کی تصویریں بھی لی گئی ہیں۔ یادگار عمارات کے سلسلے میں بھی کئی کتبے شامل ہو گئے ہیں۔ ایران اور افغانستان کے کئی کتبے دستیاب نہ ہوسکے اور اسی طرح ہندوستان کے کئی کتبے منتشر ہیں۔ فی الحال آئندہ کی امید پر دستیاب کتبوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کتبہ نمبر ۱ سنہ ۱۰۰۷ھ

چہل زینہ قندھار

میر معصوم نے اپنی تاریخ میں قندھار کے عجائبات کا ذکر کرتے ہوئے چہل زینہ کی عمارت کے لیے لکھا ہے:

> ''دوسری عمارت ایک کمرہ کی طرف فردوس مکانی بابر بادشاہ کے حکم پر ''سرپوزہ پہاڑ'' پر، پہاڑی کو تراش کر بنائی گئی ہے جو بہت بلندی پر ہے۔ اسے ۸۰ (اسی) افراد نے نو سال کی مدت میں تیار کیا۔ حقیقت میں نہایت عمدہ اور فرحت بخش جگہ ہے۔ ارغنداب کے کنارے پر واقع ہے۔ اس ملک کے اکثر باغات اور فصلیں اس کے پانی کے ذریعے سیراب ہوتی ہیں اور موسم بہار میں عام آدمی وہاں

سے گذرتے ہیں۔ اونچائی کے سبب لوگوں کو
چڑھنے میں دشواری ہوتی تھی اور ان کا
دہشت کے سبب اوپر تک پہنچنا ناممکن
تھا۔ وہاں حضرت فردوس مکانی، بابر بادشاہ،
مرزا عسکری، مرزا کامران اور مرزا هندال کے
نام پر، جو اس کام کے نگران تھے، کتبہ نصب
ہے۔ حضرت جنت آشیانی همایوں بادشاہ وہاں
نہیں آئے تھے۔ اس لیے ان کا نام (اسی کتبہ
میں) نہیں ہے اور ان کے زیر نگیں ممالک میں
سے صرف قندھار، کندہ ہے۔

کاتب جب وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جنت آشیانی اور حضرت خلیفہ الٰہی کے اسمائے گرامی اور زیر نگین ممالک جو کابل اور قندھار سے ہزار گنا بڑے ہیں کے نام مرقوم نہیں تھے تو دل میں خیال آیا کہ یہ نام، شہر اور ممالک یہاں لکھنے چاہئیں اسی لیے بکھر سے خوش نویسوں اور سنگ تراشوں کو بلوایا گیا، انھوں نے نام لکھے اور حضرت جنت آشیانی اور حضرت شہنشاہ کے ممالک جو بنگال سے بندر لاھری تک اور کابل و غزنی سے دکن تک پھیلے ہوئے ہیں، کے نام درج کیے گئے۔ تقریباً چار سال تک (۱۰۰۴–۱۰۰۷ھ) ان لوگوں نے کام کیا اور مکمل کیا۔ کام واقعی قابل دید ہوا ہے اور لوگ اسے دیکھنے آتے رہتے ہیں۔[۲]

اس کتبے اور اس عمارت کا ذکر جس کو چہل زینہ[۳] کہا جاتا ہے اور اوپر پہنچنے کے لیے اسی پہاڑی پر چالیس زینے بنائے گئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۳۲ء) میں منشی موہن لال[۴] نے اس کا معائنہ کیا اور کتبے کو نقل کیا، جس کے بعد کتبہ "مفتاح التواریخ[۵] (نصف ۱۸۴۸ء) میں آیا۔ اس کے بعد فرانسیسی مستشرق "James

"Darmesteter نے رسالہ Journal Asiatique کے ۱۸۹۰ء کے پرچے میں اس پر مفصل مقالہ لکھا اور کتبہ نقل کیا۔ جس کے بعد وہ نقل در نقل ہوتا رہا۔ ۶۔ یہاں کتبہ کی نقل Darmesteter کی عبارت سے دیا جاتا ہے جو زیادہ مستند ہے۔

در تاریخ سیزده شهر شوال نهصد و بیست و هشت، عالیحضرت گردون بسطت مملکت پناه، معدلت شعار، مکرمت آثار، نوین بزرگ کامگار، اعتضاد سلاطین گردون اقتدار، ملاذ قیاصره گیتی مدار، شهسوار مضمار عدل و احسان، اعدل اکاسره زمین و زمان، المنظور بانظاره ...... ت اللّٰه، ابو الغازی ظهیر الدین محمد بابر بادشاه خلد اللّٰه ملکه و سلطانه، فتح قندهار نمود و در همین سال امر عالی به بنای این رواق جهان نمای، که سر رفعتش به محاذات ایوان اوان رسیده، شرف نفاذ یافت و اتمام آنرا به اهتمام فرزند همایونش محمد کامران بهادر که شرفات کاخ عدالتش ازین نه طاق در گذشته و برحسب اشارت علیه بی توقف مهندسان صاحب هنر و استادان ماهر دانشور در ساعتی خجسته و طالع فرخنده اساس آنرا طرح انداختند و عمله و تیشه کاران چابك دست، که هر یك سرآمد کشوری و یگانه مملکتی بودند، دقاق خداقت و مهارت در احداث آن به ظهور رسانیدند. و از میامن التفات شاهزاده فیروز بخت که ضمیر منیرش

مطرح الانوار الٰهی است، در نهصد وسی وسه
این عمارت سپهر فرسای به اتمام رسید و چو
...... شا ...... مشارالیه ایالت مملکت قندهار را
به برادر ارجمند سعادت یار مرحمت آثار
معدلت شعار محمد عسکری بهادر طول عمره
و افاض علی العالمین بره و احسانه تفویض
فرمود، و در ایام ایالت این شاهزاده عالیشان
در نهصد وسی ... منقوش مرات ضمیر ارباب
دانش می گرداند که مملکت قندهار در قبضهٔ
تصرف ابای بند گان حضرت شاهنشاه جم جاه
فلك بارگاه خلافت پناه ظِل اللّٰه جلال الدین
محمد اکبر پادشاه غازی خلد ملکه بود و در
حینی که رایات کشورستانی جنت آشیانی
محمد همایون پادشاه غازی طیب اللّٰه ثراه و
جعل الجنة مثواه، به میامن توفیقات ربانی و
تاییدات سبحانی تسخیر دهلی نمود، دیار
قندهار از تصرف این دودمان بیرون رفت، و
چون اقبال و دولت شاهنشاهی اکثر اقالیم ربع
مسکون را که طول آن از حدود سراندیپ و
ادیسه و بندر گوراکات و کورو بنگله تاته و بندر لاهری و
هرمز، که مسافت آن قریب دو ساله راه
می شود، و عرض آن از کابل و کشمیر تا سرحد
دکن و برار، که قریب یك نیم ساله راه باشد،
مسخر گردانید، در سنه هزار ودو مملکت
قندهار درحیطه تصرف غلامان درگاه خلایق
پناه درآمد. و مخفی نماند که مابین حدود

مذکوره ولایات و شهرها و قعله ها بسیار و تعداد آنها دشوار بود، به ایراد بعضی اختصار نموده شد و تفصیل آن این است. ادیسه، جکنات، ستگانو، چتگانو، بردوان، سلیمان آباد، پیرنیه سنار گام، کوراکات، شیر پور، میر چه، پیرنیه، تاج پور، کور، تانده، اك محل، منگیر، بهار، ترهت، حاجی پور، بیه، ره تال، سهسرام، چوسا، غازی پور، چنار، بنارس، جونپور، کر [ناتك]، مانك پور، کالپی، کیلنجر، اتاوه، قنوج، لکنو و اود، بهرایج، سنبل، امروهه، بداوون، کول جلالی، شمس آباد، آگره، گوالیار، چندیری، رایسین، سارنگ پور، اجین، مالو مندو، هندیه، برار، اسیرو برهانپور، تطربار، صورت، بروج، برودە، محمد آباد، کنبایت، جوناگر، نوانکر جام، کچ کنکار، احمد آباد، ایدر، پتن، نهرواله، جالور، سروهی، میرته، جودپور، جیسلمیر، ناگور، نارنول، اجمیر، رن تپور، لنبلمیر، چتور، بیانه، فتحپور، متره، دهلی، پانی پت، ماهم، حصار فیروزه، تانیسر، سرهند، تجاره، سلطان پور، جلندر، لاهور، کلانور، نکر کوت، ره تاس، اتك، جمو، جلال آباد، بهیره، غزنین، شور پتن شیخ فرید، ملتان، دودای، اچه، بکر، سهوان، عمر کوت، تته.

امید که عنقریب اکثر اکناف عالم از تایید بخت و اقبال حضرت ظلل الٰهی و شاهزاده های

کامگار گردون اقتدار عالم مدار شاه سلیم و شاهمراد و دانیال شاه و خسرو شاه و پرویز شاه مسخر اولیای دولت بی زوال گردد. آمین یارب العالمین! تمت فی سه هزار و هفت.

پوشیده نماناد در زمانی که اعلیحضرت خاقانی حکومت قندهار را به نواب نامدار شاه بیگ خان کابلی مفوض فرموده بودند، بنده درگاه محمد معصوم بن سید صفایی اباً، و بن سید شیر قلندر بن سید حسین زنجیر پای ابن بابا حسن ابدال جداً، و النامی تخلصاً البکری مسکناً در سلك امراء نامدار به کومك قندهار آمده، روزی به این سر منزل عالی رسید، چون از ممالك محروسه غیر قندهار در اینجا مرقوم ندید، بنابران پاره ای از شهرها در این رواق ثبت نمود به دعای حضرات اختصار کرد.

محرره من کتاب حُسن و ناز:

نشان مظهر حق شاه اکبر

تعالی شانه اللّٰه اکبر

درین خمخانه تا مهر است ساقی

به دوران جام عمرش باد باقی

وله من کتاب مثنوی رای و صورت:

ذاتش با مهر همنشین باد

نامش به جهان ابد قرین باد ۶؎

چہل زینہ اور کتبہ کے کچھ حصوں کی تصویریں دی جاتی ہیں۔

اس کتبے سے ایک علمی مسئلے پر بھی روشنی پڑتی

ہے یعنی ۱۰۰۷ھ تک میر نے مذکورہ بالا دو مثنویاں پوری کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ دوسری مثنویاں اگر تیار ہوتیں تو دستور کے مطابق ان کے اشعار بھی لازماً اس موقع پر کتبوں میں داخل ہوجاتے۔

کتبہ ۲ سن؟

اندھیری محل اُدگیر

یہ کتبہ نامکمل ہے اس کا ایک حصہ بیدر بھیجا گیا بقیہ حصہ اندھیری محل رودگیر کے مغربی دیوار میں لگا ہوا ہے۔ اس کے اشعار میر معصوم کے ہیں جن کا ذکر دیگر کتبوں میں بھی آیا ہے۔

۱ ستوان کردن تمام عمر را مصروف آب و گل
کہ شاید یکدمی صاحبدلی دروی کند منزل

۲۔ ساختم این خانہ را تا دوستی منزل کند
ورنہ عاقل عمر خود کی صرف آب و گل کند۷

کتبہ ۳ ۱۰۰۷ھ

بیانہ – بازار مسجد

بیانہ کی بازار والی مسجد، خواجہ حسن کی تعمیر شدہ ہے۔ اس کی تاریخ میر معصوم نے مندرجہ ذیل طریقے سے کتبے پر نصب کی:

مسجد .... ساخت خواجہ حسن
کز جہان کرد سا کنش امراض
نامی از بھر سال تاریخش
گفت: آباد مسجد فیاض

تاریخِ بنا کا سال ۱۰۰۷ھ نکلتا ہے۔۸

کتبہ ۴ ۱۰۰۸ھ

اروڑ

مندرجہ ذیل کتبہ اروڑ کے ویران شدہ شہر کے نزدیک ایک درخت کے نیچے پڑا ہوا ہے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر یہاں آپڑا ہے۔

پہلی مرتبہ اس کتبے کا ذکر ایسٹ وک نے کیا۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ پتھر دریا کے پرانے بہاؤ کے نشان کے طور پر لگایا گیا تھا۔۹ لیکن کتبہ کی عبارت سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ گمان غالب ہے کہ یہ کتبہ دلی اور آگرہ کی طرف جانے والے راستے کی یادگار پر جو اس اراضی میں تھی میر صاحب کے فرمانے پر نصب کیا گیا تھا عبارت ہے:

برادر قدم چو رہ نوردان
دربادیہ پانہ چو مردان

بہ فرمودہ سیادت پناہ امیر محمد معصوم مرقوم شد، ۱۰۰۸ھ۔

یہ پتھر میں نے خود ۱۹۵۷ء میں دیکھا تھا، میں نے اس کی تصویر کھینچی جو یہاں شامل ہے۔ حامد علی مرحوم نے اس کی تصویر ۱۹۶۹ء میں شائع کی۔

کتبہ ۵-۲۱ ۱۰۰۸-۱۰۱۴ھ

فقیروں کا تکیہ - جیسلمیر

جیسلمیر میر صاحب کی آمدو رفت کے راستے پر تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کے راجہ سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ ایک دفعہ راجہ راول کی استدعا پر میر صاحب نے دس دن وہاں قیام کیا۔ انہوں نے وہاں ایک عمارت بطور یادگار تعمیر کروائی۔ ذیل میں ہم متعدد کتبات دے رہے ہیں جو اسی مسجد پر نصب ہیں جسے عرف عام میں ”فقیروں کا تکیہ“

یعنی فقیروں کا آستانہ کہا جاتا ہے۔ میر بزرگ کے کتبے بھی ہیں۔ یہ سب مختلف سالوں کے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ آمد و رفت کے سلسلے میں جیسلمیر مرکزی مقام تھا۔

فقیروں کے تکیے کے دروازے پر مندرجہ ذیل اشعار علیحدہ علیحدہ پتھروں پر کندہ ہیں۔

(۱)

قدم بردار نامی وقت کار است
که بختی عمر بر صرصر سوار است
بیا بگذر ازین زال جهان نام
که ناکامیست از وی حاصل کام

(دوسطریں 1-10 Metre27 Centimeters)

(۲)

اسی جگہ پر:

زد شیشۂ چرخ سنگ بر ساغر ما
خون شد چو انار دانه، دل در بر ما
گردی ننشسته بود بر افسر ما
اکون بنگر خاك سی ه برسر ما

(دو سطریں 1-10 Mt 30 cm)

(۳)

اسی جگہ پر

ما آمده بودیم درین باغ بگشت
چون ابر بروی سبزه، چون باد بدشت
چون نرگس پر خمار، ناگاه از خواب
تا چشم ك شادیم ز هم، عمر گذشت

(دو سطریں 1-20 m26 cm)

(۴)

اسی جگہ پر:

هان نامی هان! بخویش یکدم پرواز
مردانه بساز توشه ای رفتن بساز
داری درپیش بس ره دور و دراز
ای کاش، امیدِ آمدن بودی باز

(90m 29cm دو سطریں)

(۵)

اسی جگہ پر:

ای تازه و تر شگفته مانندۂ گل
بنگر سوی اوراق پراگندۂ گل
ایام بقای زندگانی بمثل
چون گریه شبنم است، چون خندۂ گل

(1-22m 27cm دو سطریں)

(۶)

دروازے کے اوپر:

شد بی تو مرا ناله کوتاه نفس
بی ناله به لب نمی برد راه نفس
از ضعف چنان شدم که اندر دمِ مرگ
بیرون نرود بی مددِ آه نفس

(2-30mx20cm ایک سطر)

(۷)

شہتیر پر ایک سطر:

جام از می عیش تلخکام افتاده
وین مجلس باده ناتمام اُفتاده
بنگر ز حریفان می و جام افتاده
مستانه بخواب هر کدام اُفتاده

....

ای آنکه توچون بادصبایی در گشت
گه سوی چمن خرامی گه سویِ دشت
چون زیر زمین جای تو گردد دانی
تا در ته خاك برسرِ ماچه گذشت
(5.15 mx20cm، ایك سطر)

(۸)

شهتیر پر ایك ستر میں:
ای تاره و ترشگفته مانندۂ گل،
بنگر سوی اوراق پرا گندۂ گل،
ایام بقای زندگانی بمثل،
چون گریه شبنم اسب چون خندۂ گل۔

....

فریاد رحیل از همه کس میشنوی
آواز دراز پیش و پس میشنوی
کرده همه شبگیر بسر منزل دور
تو خفته به ره بانگ جرس میشنوی
(4mx20cm ایك سطر)

(۹)

اسی جگه ایك سطر میں:
نامی من ازین دهر پشیمان رفتم
ناچیده گلی ازین گلستان رفتم
بودم دو هزار آرزو در دل بیش
ناکرده یکی ازو بسامان رفتم
(2.25mx20cm ایك سطر)

ان اشعار کے کتبے ''فقیروں کے تکیے'' پر کندہ ہیں۔
ذیل میں تاریخی کتبے جو اسی عمارت کی مختلف جگهوں پر

ہیں، دیے جاتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۱۰۰۸ھ میں تعمیر ہوئی اور "بنامی دلپذیر" اس کی تاریخ ہے۔

(۱۰)

ایک سطر میں:

گویند بود فاتحه را فایحه ای
زان فایحه بخش نکهتِ رایحه ای
بر روح گذشتگان فرست اخلاصی
محتاج دعائیم بخوان فاتحه ای

....

میر معصوم آن سیادت منزلت
ساخت اینجا از پی برنا و پیر
سالِ تاریخش چو جستم از خرد
درزمان گفتا، بنایی دلپذیر
۱۰۰۸-۱۶۰۰ء

دو سال کندہ ہیں جیسا کہ دکھایا گیا۔ ایک سال عمارت کی تعمیر کا ہے۔ (5.92mx20cm ایک سطر)

(۱۱)

مذکورہ بالا کتبے کی تشریح اس کتبے میں ہوتی ہے جو ایک دوسرے شہتیر پر ایک سطر میں کندہ ہے۔

در شهور سنه هزار و هشت هجریه که
بندگان خلافت پناهی ظل الهی جلال الدین
محمد اکبر بادشاه غازی خلد ملکه ابدا. نواب
سیادت پناه فصاحت و بلاغت دستگاه میر
محمد معصوم نامی تخلصاً و البکری مسکنا ولد
میر سید صفایی الترمذی اباً وبن سید شیر قلندر

و بن بابا حسن ابدال جداً [را] از خدمت قندھار
طلب فرمودہ بودند، در حین نزول بدین مقام بنا
این بقه خیر نهادند . حررہ العبد میر بزرگ ولد
امیر محمد معصوم.

نامی بکشا چشم بصیرت دریاب
بنیاد زمانه همچو نقشی است برآب
باتو گویم که حاصل دنیا چیست
بیداری یکزمان و باقی همه خواب

(10.30mx20cm ایك سطر)

(۱۲)

اسی عمارت پر دوسرا تاریخی کتبه ایك سطر میں ہے۔

نامی زخرد دوش دلم کرد سوال
کز رفته و آینده بیان کن احوال
گفتا! چه خبرز رفتگان نیست اثر
آینده چو رفته دان چه می پرسی حال

بندگان حضرت اعلا به ایلچی گری عراق نواب
سیادت پناه ابوی امیر محمد معصوم بکری را رخصت
نمودندو در سنه ۱۰۱۰ھ از اینجا عازم بکر شدند حررہ
میربزرگ.

(5.20mx20cm ایك سطر)

(۱۳)

اسی عمارت کی دیوار پر باہر کی طرف سے چار سطر
میں یہ کتبہ ہے:

چون درمیان نواب ابوی امیر محمد معصوم
و حکومت دستگاہ راول بنیو [بنیو؟] نسبت (دوستی)
ویگانگی بود بنا برآن به استدعا راول جیو درین منزل

دہ روز اتفاق مقام افتاد، سنہ ھزار و دہ العبد میر بزرگ.
(92.36cm)

مذکورہ بالا کتبوں کی تاریخیں واقعاتی لحاظ سے بہت اہم ہیں جن کے سلسلے میں گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے۔

اس عمارت کے علاوہ جو کتبوں سے ظاہر ہے کہ مسجد نہیں بلکہ مسافروں کے لیے رہنے کے لیے اطاق ہے۔ میرصاحب نے ایك اور جگہ بھی تعمیر کروائی جو آج کل لڑکوں کے لیے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کے کام آ رہی ہے۔

(۱۴)

بیرونی دروازے کی دیوار پر باہر کی طرف سے تین سطروں میں کچھ کتبے ہیں:

این تازہ بنا چو میر معصوم نھاد
چرخ فلکش دید و برو تحسین گفت
ھنگام بنا، چو خلق کردند دعا
از ھر طرفی خیل ملك آمین گفت
چون بود زسنگ، سال بنیادش عقل
بنیاد نمود خانۂ سنگین، گفت

نواب سیادت پناہ ابوی ام امیر محمد معصوم البکری النامی المخاطب بہ امین الملك بہ جھت یادگار این عمارت بنا فرمودہ ۱۰۱٤ھ.
(2.10mx42cm)

اس کتبے میں لقب ''امین الملك'' آیا ہے جسے پہلی بار اکبر نے ۱۰۱۰ھ میں اپنے خط میں لکھا تھا، جب میر صاحب شاہ ایران کی طرف گئے اور واپس آنے کے بعد جب جہانگیر نے انھیں بکھر بھیجا۔ اس وقت انھیں ''امین الملك'' کا عہدہ تفویض ہوا۔ یہ سن ۱۰۱۴ھ تھا۔

(١٦)

اس عمارت کے اندر ستوں کے اوپر والے سرے پر چاروں طرف کندہ ہے۔

در جیسلمیر خانه ای فرمود
میر معصوم آن جهان کرم
تا خلایق همی بیاسایند
اندرین منزلی چو باغ ارم
کرد تاریخ سال میر بزرگ
در زمان خانهٔ نشاط، رقم

اسی کتبے کا دوسرا حصه:

نواب سیادت
نقابت پناه ابوی ام
امیر محمد معصوم بکری
المتخلص بالنامی و
المخاطب به امین الملك
این سر منزل به جهت
آسایش خلایق بنا نمود.
حرره العبد
میر بزرگ
١٠١٤ھ
(1.80 14x32 cm)١٠ا

میر مراد علی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ جیسلمیر شہر کے مشرق میں دہلی دروازے کے سامنے جودھ پور کی طرف جاتے ہوئے راستے پر ہندوؤں کا مرگھٹ ہے جس کے قریب گڈیسر تالاب ہے۔ اس کے شمال کی طرف سفید پتھر کی اطاق ہے۔ اندر تین محرابین ہیں۔ (ترپولیا)

میر مراد علی کی یادداشت میں ان عبارتوں کا اضافہ ہے۔

(۱۵)

محراب پر یہ عبارت ہے:

عن سلیمان علیه السلام اعظم المصایب فوت
الوقت بلا فایده- حررهٔ العبد میر بزرگ بن
میرمعصوم النامی تخلصاً و البکری مسکنا
ترمذی اصلاً و الحسینی نسباً- وکان لما ذالك
فی سنة ثمانیة والف.

میر کی یادداشت میں یہ ابیات زیادہ ہیں۔

(۱۶)

دو جهان در نظر دیده وران مختصر است
هر که بربست از و چشم طمع، دیده ور است
تا تو بد عهد، رهِ مهر و وفا بربستی
نامیِ دل شده را دیده به دیوار ودر است ۱۱؎

کتبہ ۲۲ ۱۰۰۸ھ

بیانہ — عیدگاہ مسجد

بیانہ میں، عید گاہ کی مسجد کہی جاتی ہے، جس پر میر کا یہ کتبہ ہے:

نامی بکشا چشم بصیرت دریاب
بنیاد زمانه همچو نقشی است برآب
باتو بگویم که حاصل دنیا چیست
بیداری یکزمان و باقی همه خواب

قایله میر محمد معصوم البکری مسکوناً [ترمذی] اصلاً و النامی تخلصاً ... حرر مرزا ... ۱۰۰۸ھ ۱۲؎

کتبہ ۲۳ ۱۰۰۸ھ

بلند دروازہ، فتح پور سیکری

فتح پور سیکری میں، اکبری مسجد کے بلند دروازے پر میر معصوم کا یہ کتبہ دو تختوں پر کندہ ہے۔

شدہ رشک طاق سپهر بلند

۱۔ قال عیسیٰ علیه السلام الدنیا قنطرة فاعبروها ولا تعمروها- فی الاخبار- من تامل انه یعیش غداً، تامل انه یعیش ابداً وقیل -الدنیا ساعة فاجعلها طاعة بقیة العمر. لاقیمة لها.

۲۔ فی الاخبار- من قام الی الصلوٰة و لیس معه قبله فانه یریده من - اللّٰه الا بعداً - خیر المال ما انفق فی سبیل اللّٰه، بیع الدنیا بآخرة یربح، الفقر ملك، فیها محاسبة

۳۔ نامی چه شد ار تو مسجد گاهی کردی
وز قصر زر اندوده پناهی کردی
خوبی جهان به صورت آیینه دان
خود گیر و تو هم درو نگاهی کردی

۴۔ قایله و کاتبه محمد معصوم نامی بن سید صفایی الترمذی اصلاً و البکری مسکناً و المنتسب الی شیر قلندر بن بابا حسن ابدال السبزواری مولداً و القندهاری موطناً.۱۳۔

سید لطیف نے اپنی کتاب کے ص ۱۴۶ پر کتبے میں یہ اضافہ کیا ہے: وقال عیسٰی...... الخ سے پہلے یہ عبارت ہے:

حضرت شهنشاه فلك بارگاه ظل اللّٰه جلال الدین محمد اکبر بادشاه بعد فتح ملك دکن و داندیش که سابقاً مسمی به خاندیش بود در سنه ٤٦ الاهی مطابق ۱۰۱۰ھ به فتح پور رسیده عزیمت آگره فرمودند.

تـــا نـــام زمیـن و آسـمـــان ســـت
تـــا نـقـــش وجـود در جهـــان ســـت
نـــامـــش بــه سپهـرهـم نشیـن بـــاد
ذاتـــش بـــه جهـــان ابـد قـریـن بـــاد

اس عبـارت کـے بـعـد وقـال عیسٰی تـا عبارت ”العمر لا قیـمـت لها“ ہے اور یہاں تك ایك پتھر پر ہے جو مشرقی دیوار پر ہے باقـی کتبه عبارت ”مـن قـام الی الصلوۃ ولیس“ .... ”والقندهاری مـوطناً“[۱۴] تك مغربی دیوار پر ہے۔

کتبہ ۲۴ ۱۰۰۸ھ

اُجین کی عمارت

۱۰۰۸ھ میں جب اکبـر دکـن کـے لیـے روانـه ہو، اس وقـت میر مـعـصـوم نے اجین پہـنـچنے پر یہ کتبه ناصر الدین خلجی کی قائم کردہ عمارت پر لگایا:

بتاریخ ۱٤٤ الاهی موافق ۱۰۰۸ هجری رایات ظفر آیات عازم تسخیر دکن بود به اینجا عبور افتاد.

نظم

نـــامـــی! زفـلـك دوش دلـم کـرد ســوال
کــز رفتــه و آیـنـده بیـان کـن احـوال
گـفتـا! چــه خبـر؟ ز رفـتـگان نیست اثر
آیـنـده چـو رفته دان چه می پرسی حال
راقـم مـحـمـد مـعـصـوم نـامی البکری [۱۵]

کتبہ ۲۵ ۱۰۰۸ھ

درگاہ محمد غوث گوالیاری

حـضرت محمد غوث گوالیاری کے صحن میں میر کا یه کتبه نصب ہے:

۱۔ من اکثر ذ [کرالم] وت
۲۔ رضی من الدنیا بالیسیر
۳۔ یکدم ز گذشتگان بکن یاد
۴۔ وز فاتحه روح شان بکن شاد
۵۔ قایله و راقم محمد معصوم البکری
۶۔ موطناً و الترمذی اصلا ۱۰۰۸/۱۰۰۷ھ ۱۶۔

گوالیار، دکن کے راستے پر ہے۔ مسٹر سکسینا کا خیال ہے کہ دکن کی مہم پر جاتے ہوئے جب اکبر نے یہاں قیام کیا تو میر نے یہ کتبہ لگایا۔ حضرت محمد غوث کا مقبرہ اکبر نے بنوایا ہے۔

کتبہ ۲۶ ۱۰۰۸-۱۰۰۷ھ

خانقاہ حمید الدین ناگوری

یہ کتبہ، میر بزرگ کا خانقاہ شیخ حمیدالدین ناگوری (سلطان التارکین) پر نصب ہے جسے میرے دوست ڈاکٹر عبداللّٰہ چغتائی نے EI.M & (1949-50) میں چھاپا ہے۔ کتبہ اس طرح ہے:

۱. عن سلیمان علیه السلام اعظم المصایب فوت الوقت بلا فایدة
۲۔ حرره العبد میر بزرگ بن امیر محمد معصوم النامی تخلصاً و البکری مسکناً
۳۔ والترمذی اصلاً و الحسینی نسباً وکان ذالك فی ۱۰۰۸/۹۰۰۷ھ ثمان و الف.

کتبہ سال ۱۰۰۸ھ کا ہے۔ اس کے نیچے ۹۰۰۷ کے عدد ہیں جس کے متعلق ڈاکٹر عبداللّٰہ کا خیال ہے کہ اس کا مطلب مذکورہ بالا سال کی تاریخ اور مہینہ ہے یعنی ۷ تاریخ ۹ مہینہ یعنی ۷ رمضان ۱۰۰۸ھ (۲۲ مارچ ۱۶۰۰ء)۔۱۸۔

کتبہ ۲۷ ۱۰۰۸ھ

خانقاہ شیخ حمید الدین ناگوری

یہ کتبہ شیخ حمید الدین کی خانقاہ میں نصب ہے۔ کتبہ میر بزرگ کا ہے جو والد کے ساتھ ۱۰۰۸ھ میں اس خانقاہ میں آئے۔

نامی بکشا چشم بصیرت دریاب
بنیاد زمانہ همچو نقشی است برآب
باتو گویم کہ حاصلِ دنیا چیست
بیداری یکزمان و باقی همه خواب

بتاریخ سنه ۱۰۰۸ھ در خدمت نواب امیر محمد معصوم نامی به زیارت این مزار رسید.

حررہ میر بزرگ. ۱۸؎

یہ کتبہ خانقاہ کے دروازے کے بائیں جانب نصب ہے۔

کتبہ ۲۸ ۱۰۰۸ھ

ناگور

یہ کتبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے عنایت کیا۔ میر بزرگ کا ہے اور ناگور میں نصب ہے۔

۱۔ قیل الدنیا ساعته فا جعلها طاعته

۲۔ بتاریخ ۱۰۰۸ھ به زیارت این مزار

۳۔ درخدمت نواب امیر محمد معصوم

۴۔ نامی رسید ... حررہ میر بزرگ. ۱۹؎

کتبہ ۲۹ ۱۰۰۸ھ

ناگور، محلۂ آہنگران

ناگور شہر میں جنوب کی طرف لوہاروں کا محلہ ہے جس میں ایک مقبرہ کے ستونوں پر یہ کتبہ نصب ہے:

تو خفته ای به راه و کاروان تیز
منشین وچو گرد و باد برخیز

....

نامی چه نشسته ای درین راه
می نه قدمی دراز و کوتاه

....

گویند، بود فاتحه را فایحه ای
زان فاتحه بخش نکهتِ رایحه ای
بر روح گذشتگان فرست اخلاص
محتاج دعاییم بخوان فاتحه ای

حررہ میر بزرگ ۱۰۰۸ھ ۲۰؎

کتبہ ۳۰ ۱۰۰۸ھ

دھار

دھار میں لاٹ مسجد کے اندر یہ کتبہ نصب ہے:

☆ در زمانیکه اعلیٰ حضرت خاقانی ظل سبحانی شان مظهر حق، شاه اکبر تعالیٰ شان الله اکبر

عازم دکن بود به تاریخ هشتم اسفند ماه سنه ٤٤ جلوسی موافق ۱۰۰۸ھ درین مقام نزول اجلال فرمودند.

عمل دار و کنده کار [حرره] محمد [معصوم] نامی البکری ۲۱؎

کتبہ ۳۱ ۱۰۰۸ھ

سعدل پور

سعدل پور مالوہ میں ہے۔ دھار سے شمال اور مشرق کی طرف ۱۲ میل کے فاصلے پر سعدل پور کے رود خانہ پر یہ کتبہ دو پتھروں پر ہے۔

۱۔ بندگان حضرت شہنشاہ خلافت پناہ ظل اللہ جلال الدین محمد
۲۔ اکبر بادشاہ، درحین توجہ تسخیر دکن این منزل رابہ عز قدوم
۳۔ رشک فردوس برین ساختند.
وکان ذالك
۴۔ فی تاریخ اوائل اسفند ماہ سنہ ٤٤ الٰهی
۵۔ موافق سنہ ۱۰۰۸ھ حررہ محمد معصوم نامی بکری
۶۔ نامی بکشا چشم، بصیرت دریاب
۷۔ بنیاد زمانہ ھمچونقشی است برآب
۸۔ باتوگویم کہ: حاصل دنیا چیست؟
۹۔ بیداری یکزمان و باقی همه خواب ۲۲۔

کتبہ ۳۲ ۱۰۰۸ھ

مانڈو- نیل کنٹھ

شادی آباد مانڈو کے قلعے میں نیل کنٹھ نامی شاہ بداغ کی تعمیر کردہ عمارت ہے جس کے ستون پر یہ کتبہ ہے:

۱۔ در تاریخ سنہ ٤٤ الٰهی موافق ۱۰۰۸ھ بندگان اعلیٰ حضرت جهان پناہ
۲۔ فلك بارگاہ ظل اللہ متوجہ دکن بودند، بدین جاعبور افتاد.

۳۔ تاکی گویی بہ چرخ شد خانۂ ما
خندند همه بردلِ دیوانۂ ما
۴۔ ز افسانۂ دیگران بیا عبرت گیر
زان پیش کہ بشنوند افسانۂ ما ۲۳۔

اس عمارت کے دوسرے کتبے ۱۰۰۹ھ میں دیکھنا چاہیے۔ شاہ بداغ والا کتبہ بھی اسی عمارت میں ہے۔ ملاحظہ کریں کتبہ نمبر ۳۴۔

کتبہ ۳۳ ۱۰۰۹ھ

اُجین - عمارت سلطان ناصر الدین

سنه ٤٥ الٰهی موافق سنه ۱۰۰۹ھ حضرت خلافت پناه ظل الہٰ جلال الدین محمد اکبر بادشاه ملك دکن و خاندیس را ...... تفویض نموده مراجعت فرمودند. لمحرره:

فتح خاندیس و دکن چون کرد شاه
عازم نزهت گه معمور شد
یك عدد نام فرود آنگاه گفت:
شاه والا عازم لاهور شد ۲۴۔

یہ تاریخ معمولی تغیر سے دوسرے کتبہ پر بھی ہے۔ (دیکھئے نمبر ۳۵ اور ۳۷)

کتبہ ۳۴ ۱۰۰۹ھ

مانڈو - نیل کنٹھ

شادی آباد مانڈو کی عمارت نیل کنٹھ کے نام سے، شاہ بداغ کی تعمیر شدہ ہے جو سارنگپور کا تیوالدار تھا۔ نیل کنٹھ پرندہ ہے جس کی گردن میں سبز ڈور ہوتی ہے۔ شاہ بداغ نے اس پر یہ کتبہ اپنے ہاتھ سے نصب کیا۔

توان کردن تمامی عمر را مصروف آب و گل
کہ شاید یك دمی صاحب دلی اینجا کند منزل
کتبہ شاہ بداغ خان ۹۸۲ھ ۲۵۔

اس عمارت پر میر معصوم کا یہ کتبہ نصب ہے:

۱۔ بتاریخ ۱۰۰۹ھ حضرت اکبر بادشاہ فتح
۲۔ داندیس و دکن نمودہ عازم ہند شدند.

حررہ محمد معصوم

اسی سال میں میر نے دوسرا کتبہ نصب کیا۔

۱۔ حضرت ظل اللہ اکبر بادشاہ فتح دکن و داندیس
۲۔ نمودہ در سنہ ۱۰۰۹ھ عازم ہند شدند، قایلہ نامی
۳۔ دیدم چغدی نشستہ در صبح پگاہ
بر کنگرۂ مقبرہ شروان شاہ
۴۔ فریاد کنان ز روی عبرت می گفت
کو آن ہمہ حشمت و کجا آن ہمہ جا۔ ۲۶۔

اس عمارت پر میر کے سال ۱۰۰۸ھ کا بھی کتبہ ہے جو پیچھے دیکھنا چاہیے۔

کتبہ ۳۵ ۱۰۰۹ھ

برہانپور - جامع مسجد

برہانپور شہر میں عادل شاہ فاروقی (۸۶۱ھ / ۱۴۵۷ء ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء) کی تعمیر شدہ جامع مسجد ہے جس کے صدر دروازے پر عادل شاہ کا کتبہ ہے۔ اس مسجد کے مینار پر میر معصوم کا کتبہ ہے۔

تاریخ الٰہی عبارت است از زمان جلوس حضرت
شاہنشاہ ظل اللہ اکبر بادشاہ غازی کہ ز تایید
جوان بخت خویش اسیر کشاد.

گشت آباد اسیر ازان نامی
سنہ پیشش بگفت: الہ آباد ۲۷۔

بتاریخ ۱۱ فروردین ماہ الٰہی سنہ ٤٥ موافق ٥ رمضان سنہ ۱۰۰۹ھ حضرت شاہنشاہ فلک بارگاہ ظل الہٰ برہانپور را مقر آیات ظفر آیات ساختند، و بہادر خان آمدہ بہ پابوس مشرف شدند و او رابہ اتباع جان بخشی کردند و قلعہ اسیر فتح شد۔

شاہ غازی جلال الدین اکبر
آن بہ تایید بخت قلع کشا
کرد فتح اسیر ازان نامی
گفت: بگرفت قلعہ اعلا ۲۸۔

قایلہ و کاتبہ محمد معصوم المتخلص بہ نامی بن سید صفائی لترمذی اصلاً و البکری مسکناً و مدفناً و منتسب اماً الی سید شیر قلندر بن بابا حسن ابدال السبزواری مولداً و القندھاری موطناً و مرقداً۔

بہ تاریخ روز ماہ دواز دھم اردی بھشت سنہ ٤٦ موافق ۲٦ شوال ۱۰۰۹ھ بندگان حضرت عازم لاھور شدند۔

فتح خاندیس و دکن چون کرد شاہ
عازم ھندوستان فی الفور شد
یک عدد نامی فزود، آنگاہ گفت:
شاہ والا عازم لاھور شد ۲۹۔

یہ نہایت مفصل کتبہ میر معصوم نے فتح خاندیش کے سلسلے میں جامع مسجد میں نصب کیا تھا، جس میں فاروقی سلطان بہادر خان کے پیش ہونے، اسیر کی فتح ہونے، جان بخشی اور بادشاہ کی لاھور روانگی کا ذکر اور تاریخیں درج ہیں۔۳۰

کتبہ ۳۶ ۱۰۰۹ھ

برہانپور - مقبرہ عادل شاہ

برہانپور میں عادل شاہ فاروقی کے مقبرے پر میر کے تین کتبے ہیں وہ اس طرح ہیں:

(۱)

انظروا الی اهل القبور فاعتبروا یا اولی
الابصار لما قبل غفلته الاحیاء اکثرا
حسرة الاموات . قال عیسٰی عم الدنیا و
قنطرة باعبروها ولا تعمروها.

(۲)

فریاد رحیل از همه کس می شنوی
آواز درا، ز پیش و پس می شنوی
کرده همه شبگیر سر منزل دور
توخفته بره بانگ جرس می شنوی

....

نامی ز زمانه بار بردار
رو آر بر آن جهان سبکسار
تو خفته به راه و کاروان تیز
توسنگ خودی زراه بر خیز ۳۱۔

(۳)

۱۔ درحین که حضرت ظل اللّٰه جلال الدین محمد اکبر پادشاه از فتح قلعه اسیر
۲۔ واحمد نگر وا پر داخته متوجه لاهور شدند، تحریر یافت ۱۰۰۹ھ
۳۔ العبد محمد معصوم بن سید صفایی ابا و البکری مر قداً و الترمذی اصلاً
۴۔ بن سید شیر بن بابا حسن ابدال اماً و القندهاری مشهداً و سبزواری مولداً.

کتبہ ۳۷ (الف) ۱۰۰۹ھ

قلعہ اسیر داخلی دروازہ

قعلہ کے داخلی دروازے سے باہر دیوار نما پہاڑی پر چار کتبے ہیں جن میں سے دو میر معصوم کے ہیں، ایک شاہجہان کے دور کا اور ایک عالمگیر کے زمانے کا ہے۔ یہ سب نستعلیق خط میں ہیں۔

۱۔ قلعہ اسیر کہ باکرہ اثیر همسرست و از زمان بنا تا
امروز دست

۲۔ تصرف ازان کوتاہ بود تاریخ سنه ٤٥ موافق ۱۰۰۹ھ بردستِ

۳۔ شهنشاه ظل اللّٰه جلال الدین محمداکبر بادشاه مفتوح شد.

۴۔ کرد از تائید لطفِ ایزدی فتح اسیر
شاه هفت اقلیم عالمگیر اکبر پادشاه

۵۔ نامیا داد الٰهی دادش این فتح عظیم
سال تاریخ الٰهی خواه از– دادِ الٰه

۶۔ قایله کاتبه محمد معصوم بکری

کتبہ ۳۷ (ب)

دوسرا کتبہ اسی جگہ پر اس طرح ہے:

۱۔ بندگان حضرت ظل اللّٰه ملك دکن و

۲۔ داندیس را به حضرت قدسی القاب

۳۔ شهزاده دانیال تفویض فرموده.

۴۔ ۱۲ اردی بهشت سنه ٤٦ موافق ۲٦

۵۔ شوال ۱۰۰۹ عازم هند شدند. لمحرره

۶۔۷۔ فتح داندیس و دکن چون کرد شاه
عازم هندوستان فی الفورشد

۸۔۹۔ یك عدد نامی فزود آنگاه گفت
شاه والا عازم لاهور شد ۳۲؎

کتبہ ۳۸ ۱۰۰۹ھ

قلعہ اسیر داخلی دروازہ

قلعہ اسیر میں جامع مسجد کے مشرق سے درمیانے ستون پر نستعلیق خط میں پندرہ سطروں میں یہ کتبہ ہے:

۱۔ به تاریخ ٦ بهمن ماه الٰهی سنه ٤٦
۲۔ موافق ۲۲ رجب قلعه اسیر
۳۔ مفتوح شد و به تاریخ سنه ٢٤
۴۔ موافق ۸ شعبان حضرت
۵۔ خاقانی ظل سبحانی جلال
۶۔ الدین اکبر بادشاه غازی
۷۔ به مقدم شریف آنرا مزین ساخت.
۸۔ از بخت جوان فتح آسیر کرد
۹۔ جان بخش شاه اکبر ملك گیر
۱۰۔ چو نامی طلب کرد تاریخ فتح
۱۱۔ خرد گفت: بگرفته کوه اسیر
۱۲۔ قایله کاتبه محمد معصوم بکری
۱۳۔ ابن سید صفائی الترمذی
۱۴۔ المنتسب اماً الی سید شیر بن بابا حسن
۱۵۔ ابدال السبزواری اصلاً و القندهاری مرقداً. ۳۳۔

اسیر کا قلعہ ۶ بہمن سن ۴۶ الٰہی (۲۲ رجب ۱۰۰۹ھ) میں فتح ہوا اور اسی مہینے کی ۲۴ تاریخ (مطابق ۸ شعبان ۱۰۰۹ھ) کو بادشاہ قلعے کے اندر داخل ہوا۔ میر معصوم نے مذکورہ بالا کتبہ نصب کیا اور قلعے کی تاریخ: "بگرفتہ کوہ اسیر" ۱۰۰۹ھ نکالی۔ گویا فتح کے ۱۶ دن بعد یہ تاریخ نکالی گئی۔

کتبہ ۳۹ ۱۰۱۰ھ

مدھ کر - باغ سلطان سلیمہ

آگرہ اور فتح پور کے درمیان بیگم سلطان سلیمہ ۳۴ کا باغ ہے جس میں ایک مسجد ہے اس کے اوپر میر کا کتبہ ہے، یہ مسجد اور باغ میر کی آمد و رفت والے راستے پر تھا۔ کتبہ ہے:

بندگان حضرت ظل الاهی بعد از فتح دکن بنده را
از آگره بجانب عراق و خراسان در سنه ۱۰۱۰ھ
مرخص فرمودند. حرره محمد معصوم بکری بن
سید صفایی المتخلص به نامی. ۳۵

اس کتبے سے ظاہر ہے کہ میر معصوم کو اکبر نے آگرہ سے اسیر پہنچ کر پھر آگرہ سے ایران کی طرف روانہ کیا۔ اس مسجد پر دوسرا کتبہ ۱۰۱۴ھ کا ہے جو تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ یہ آئندہ کے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کتبہ ۴۰ ۱۰۱۰ھ

بیانہ - خواجہ باؤلی

بیانہ شہر میں جنوب سے خواجہ باؤلی کے پاس ایک گنبد ہے جس کے ستون پر یہ کتبہ ہے۔

به تاریخ سنه ۱۰۱۰ھ حضرت شاهنشاه خلافت
پناه اکبر بادشاه بعد از دکن و خاندیس از ین
جا عبور فرمودند. العبد محمد معصوم نامی
البکری. ۳۶

کتبہ ۴۱ ۱۰۱۰ھ

جیپور میوزیم

یہ کتبہ نرانہ کلان کے تالاب پر ۱۰۱۴ھ والے کتبے کے ساتھ نصب ہے جو بعد میں جیپور میوزیم میں منتقل کیا گیا۔

۱۔ طاعته الله ...

۲۔ جام از مـی عیـش تـلـخـکـام افتـاده

۳۔ (بـنـگـرز) حـریفـان مـی و جـام (افتـاده)
مستـانـه بـه خـواب هر کـدام افتـاده

۴۔ قایله محمد معصوم

۵۔ سنه ۱۰۱۰ھ۔۳۷ س

کتبہ ۴۲ ۱۰۱۰ھ

خانقاه حمید الدین ناگور

میر معصوم کا درج ذیل کتبہ شیخ حمید الدین ناگوری کی خانقاہ کے دروازے کے داہنی طرف نصب ہے جس میں موصوف کی ایران میں تقرری کا ذکر ملتا ہے:

۱۔ دو جهان در نظر دیده وران مختصر ست
هر که بربست از و چشم طمع دیده ورست

۲۔ تـاتـو بـدعهـد رهِ مهـر و وفـا بـربستـی
نـامـی دلشـده را روی بـه دیوار و درست

۳۔ بعد از فتح دکن حضرت اعلا بنده را به حجابت عراق رخصت فرمودند.

۴۔ العبد محمد معصوم بکری سنه ۱۰۱۰ھ۔۳۸ س

کتبہ ۴۳ ۱۰۱۰ھ

کھٹو

یہ کتبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے شایع کیا ہے۔ کتبہ شیخ احمد کٹھو (متوفی ۸۴۹ھ) کی خانقاہ پر نصب ہے۔

۱۔ گویند بود فاتحہ را فایحہ ای
زان فاتحہ بخش نکھت رایحہ ای

۲۔ بر روح گذشتگان بفرست اخلاصی
محتاج دعائیم بخوان فاتحہ ای

۳۔ بندگان حضرت ... محمد معصوم بکری رابہ حجابت عراق مرخص نمودند. ۱۰۱۰ھ. ۳۹۔

کتبہ ۴۴ ۱۰۱۱ھ

شاہ کا گوٹھ نوڈیرو

نوڈیرو کے قریب شاہ کا گوٹھ کے نام سے سادات کا ایک گاؤں ہے وہاں کی جامع مسجد میں میر معصوم کے کتبے کا ایك بڑا پتھر ہے جو درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی کنویں پر پڑا تھا جہاں سے اٹھا کر یہاں رکھا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں راقم نے اسی پتھر سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی۔

کتبے کے کنارے پر:

۱۔ ... و آخرۃ و گشتی او تقوی و مردمان همه مسافر

۲۔ ... پی که بعد از تو چون خواهد بود ... که پس از مرگ دیگران چونست

پتھر کے سامنے والے حصے پر یہ عبارت ہے:

۳۔ ... نامی ابن سید صفایی ترمذی ... ۱۰۱۱ھ

۴۔ ... بسرم چو باد و باران ذرہ

۵۔ ... دهد ز خاکساران ذرہ

۶۔ ... رہ ذرہ ام کہ نایم بہ شمار
۷۔ ... رہ ذرہ هزاران ذرہ
۸۔ ... وقع هذ العمارة فی
۹۔ ... عشر و الف و هزار و یاز دہ

پتھر عین درمیان سے ٹوٹا ہوا ہے۔

کتبہ ۴۵ ۱۰۱۲ھ

مقبرہ احمد جام زندہ پیل

تائباد سے مشہد کے راستے پر "تربت جام" نامی ایک گاؤں ہے۔ جہاں مشہور صوفی بزرگ احمد جام زندہ پیل مدفون ہیں۔ قندھار یا پاکستان سے ایران (مشہد) پہنچنے کا یہی راستہ تھا ہمایوں جب فرار ہوئے تو اسی راستے سے گئے اور وہاں زیارت کے لیے قیام کیا۔ میر معصوم بھی ایران جاتے ہوئے ہرات سے تائباد اور وہاں سے تربت جام سے ہوتے ہوئے ایران میں داخل ہوئے۔ میر نے مزار کے کٹھرے پر احمد جام زندہ پیل کی تاریخ وفات منظوم کر کے کندہ کی جو اس طرح ہے۔ راقم الحروف دو مرتبہ یہ کتبات دیکھنے کے لیے گئے۔ ایک بار مشہد سے تربت جام ۸۰ میل، دوسری بار مشہد سے تائباد جاتے ہوئے راستے میں اسی مقبرے پر دعا مانگی۔ مغربی دیوار کے اوپر کٹھرے کے اوپر والے سرے پر کتبہ کندہ ہے۔

۱۔ مرشد نامی شیخ گرامی
احمد جامی عمم برہ
سال و فاتش گر تو بجویی
احمد جامی قدس سرہ

۲۔ ۵۳۶
۳۔ حررہ محمد معصوم
۴۔ بکری نامی
۵۔ ۱۰۱۲ھ

تاریخ نہایت قابلیت سے نکالی گئی ہے۔

کتبہ ـ ۴۶ ۱۰۱۳ھ

اصفہان - مسجد علی

مسجد علی اصفہان میں سلجوقی دور کی ہے۔ داخلی دروازے کے سامنے خانقاہ ہارون ولایت ہے۔ اس گنبد کے عقب میں کسی زمانے میں مہمان سرا تھی۔ جواب مسمار ہوگئی ہے۔ مسجد کے مشرقی کونے میں نہایت خوب صورت مینار ہے۔ اس مسجد کے ایوان کے دیوار پر میر معصوم نے کتبے نصب کیا، کتبہ کی پیمائش ۹۵×۱۶ سینٹی میٹر ہے۔

۱۔ نی بہ تمنای تو از خود تھی
نالہ ز سودای تو در فربھی
(از معدن الافکار)

۲۔ بحر ز گرداب شدہ کاسہ گر
تا نمی از جود تو یابد مگر

۳۔ مہر کہ عالم ھمہ محتاج اوست
خال جمال شب معراج اوست
(معراج)

۴۔ نالۂ من شعلۂ دوزخ ضمیر
دانۂ اشکم شرر دیر میر
(حسب حال)

۵۔ چرخیست اگرچہ تیز رفتار
برجاست ھمان چو گاو عصار
(توحید)

۶۔ میگردد و گردنش بہ بندست
از مہر و مھش دو چشم بندست

۷۔ حمدش چو قلم شروع کردہ
صد سجدہ بہ یك رکوع کردہ

۸۔ تا ز تو سایہ بر کنار شدہ
آفتاب از تو سایہ دار شدہ

(حسن و ناز)

۹۔ حدیثِ لعل آن برچشمۂ نوش
شدہ پیرایۂ لب چون در گوش

۱۰۔ بزیر سایہ سرو ار ستادی
بہ آن سوی دگر سایہ فتادی

(اکبر نامہ)

۱۱۔ بگل چینیِ آن گلستان شدم
سراپا صبا وار دامان شدم

(درجنگ)

۱۲۔ سرو دست بہ دیدہ افتادہ پست
چو گرزی کہ یابد ز دستہ شکست

یہ عبارت پتھر کے کنارے پر لکھی ہے:

۱۳۔ درحین کہ از هند بہ رسالت نزد شاہ عالم پناہ فلك بارگاہ شاہ عباس آمدہ بود از ایران درسنہ ۱۰۱۳ھ مرخص شدہ

۱۴۔ بہ اینجا رسید این چند بیت از خمسہ کہ درراہ بہ اتمام رسیدہ بود، ثبت نمود. قایلہ و راقمہ محمد معصوم الحسینی النامی. ۲۱ـ

کتبہ ۴۷ — ۱۰۱۳ھ

گوشت - بلوچستان، ایران

ایرانی بلوچستان میں خاش اور سراوان کے درمیان گوشت نامی ایك گاؤں ہے۔ میر معصوم نے ایران کے سفر کے دوران وہاں سے گذرتے ہوئے ایك پتھر نصب کیا جو آج تك موجود ہے اور وہاں کے لوگوں کے لیے ایك تبرک کی حیثیت

رکھتا ہے۔ پتھر کی پیمائش ۵۵×۳۰ سینٹی میٹر ہے۔ پتھر پر بکرے کی قربانی دیتے ہیں، خیر خیرات کرتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، گاؤں سرسبز اور شاداب ہے۔

۱۔ شه دین و دنیا علی ولی
۲۔ وصی وفی جانشین نبی
۳۔ قدمهاش بر بازویی شد سوار
۴۔ کز و بازوی شرع شد استوار
۵۔ قایله نواب امیر محمد معصوم
۶۔ الحسینی نامی تخلصاً و البکری مسکناً.

پتھر کے اوپر کنارے پر:

۷۔ در وقتی که از هند به رسالت ایران آمده بود
۸۔ اینجا رسید. ۱۰۱۳ھ هزار و سیزده ۴۲۔

کتبہ ۴۸ ۱۰۱۳ھ

کوهك۔ بلوچستان، ایران

سراوان (بلوچستان، ایران) سے ایك سو دس کلو میٹر مشرق کی طرف پاکستانی سرحد کے قریب کوهك نامی ایك چھوٹا سا گاؤں ہے۔

یہاں بھی میر معصوم کا کتبہ سیاہ پتھر پر کندہ ہے جسے لوگ پوجتے ہیں۔ عبارت ہے۔

ساقی از این باده که دارم به جام
فیض رسان شو به سوی خاص و عام
قایله نواب میر محمد معصوم الحسینی البکری
در وقتی که از هندوستان به رسالت ایران آمده بود
اینجا رسید ۱۰۱۳ھ۔ ۴۳۔

کتبہ ۔ ۴۹ ۱۰۱۳ھ

خانقاہ حمیدالدین ناگوری

مندرجہ ذیل کتبہ ۱۰۱۳ھ کا ہے جو میر بزرگ نے اس وقت نصب کیا جب میر معصوم ایران سے لوٹ کر آگرہ جا رہے تھے۔ آپ کی خمسہ ایران کے سفر میں مکمل ہوئی تھی۔ ایران کے اصفہان والے کتبے میں اسی کا ذکر ہے۔

(مسجد علی کا کتبہ)

۱۔ درحین مراجعت از ایران از ملازمت نواب امیر محمد معصوم نامی

۲۔ به اینجا رسید و این چند بیت از خمسه ایشان که درین ولا به اتمام رسانیده

۳۔ بودند تحریر نمود. در سنه ۱۰۱۳ھ.

۴۔ از ''معدن الافکار'':

بحرز گرداب شده کاسه گر
تا نمی از جود تو یابد مگر

۵۔ از کتاب ''حسن و ناز'':

حدیث لعل آن سر چشمۂ نوش
شده پیرایۂ لب چون در گوش

۶۔ از کتاب ''اکبر نامه'':

به گل چینی آن گلستان شدم
سراپا صبا وار داماں شدم

۷۔ از کتاب ''رای صورت'':

حسنست درم خریدۂ او
خوبیِ گل آفریده او

۸۔ از کتاب ''خمسه متحیره'':

هست برناست ابتدایِ همه
به تو آغاز و انتهای همه ۴۴

ناگور میر معصوم کے راستے میں تھا، کتبوں کی تاریخوں سے مختلف واقعات اور میر کی آمد و رفت کے سالوں کا تعین ہوتا ہے۔

کتبہ ۵۰ ۱۰۱۳ھ

کھٹو - خانقاہ بابا اسحاق مغربی

مندرجہ ذیل کتبہ خانقاہ بابا اسحاق مغربی پر نصب ہے۔ میر بزرگ اپنے والد کے ساتھ ایران سے واپس ہونے کے بعد اسی خانقاہ پر ملے اور یہ کتبہ اسی ملاقات کی یادگار ہے۔

۱۔ به تاریخ ۱۰۱۳ھ هزار و سیزده در وقت مراجعت از
۲۔ ایران در ملازمت نواب سیادت پناه امیر محمد معصوم
۳۔ نامی به زیارت اینجا رسید و این بیت تحریر نمود.
۴۔ بیدار دلان خفته پیکر
افتاده به زیر خاك، بنگر ۴۵؎

یہ خانقاہ ناگور سے ۳۵ میل مشرق کی طرف ہے اور کتبہ خانقاہ کی شمالی دیوار پر ہے۔ (روایت ڈاکٹر چغتائی)

کتبہ ۵۱ ۱۰۱۰/۱۰۱۴ھ

دھلی دروازہ– آگرہ

مندرجہ ذیل کتبہ جہانگیر کی تخت نشینی کے متعلق ہے۔ Mr.Keene لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ کتبہ دہلی دروازے کے دائیں جانب کمرے میں دیکھا۔ اس کے کچھ حروف ٹوٹے ہوئے تھے۔ مسٹر Blochmann نے ۱۸۷۵ء میں Transaction of the Archaeological Society of Agra. کے تیار شدہ مواد سے پڑھ کر نقل کیا۔

حضرت شاهنشاه جم جاه خلافت پناه ظل الله
جلال الدین محمد اکبر پادشاه در سنه ۱۰۰۸ھ
توجه (تسخیر دکن) فرمود و درسنه ۱۰۱۰ھ
نزول اجلال فرمود ... چون به گلزار آگره جای
گرفت. ۴۶؎

یہ حصہ دکن کی مہم سے متعلق ہے اور یہ اشعار جہانگیر کی تخت نشینی سے متعلق ہیں:

شاہ جہان گرفت جای بہ تخت شرف
تخت ز رفعت نہاد بر زبرِ چرخ پا
دست دعا بر کشاد پیر فلك از نشاط
گفت کہ بادا مدام حکم تو فرمان روا
خواست کہ نامی کند سال جلوسش رقم
بود دران دم لبش پر ز ثنا و دعا
میل دو چشم حسود یك الفش کردو گفت
باد جہان پادشاہ، شاہ جہانگیر ما
قایلہ و راقمہ محمد معصوم البکری اصلاً ... ۴۶ے

کتبہ ۵۲ ۱۰۱۴ھ

مدھ کر- باغ سلطان سلیمہ

اسی مسجد میں جس پر ۱۰۱۰ھ میں میر نے کتبہ نصب کیا۔ اسی پر مندرجہ ذیل کتبہ ۱۰۱۴ھ میں نصب کیا جو اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ میر اسی کتبے کے مطابق ۱۰۱۴ھ میں رمضان میں جہانگیر سے رخصت ہو کر بکھر روانہ ہوئے۔ جہاں پہنچنے کے فوراً بعد فوت ہوئے۔ آپ کی روانگی کا وقت اس کتبہ سے متعین ہوتا ہے۔

من معدن الافکار

بختی عمرست چنان راهوار
کش نتوان باز کشیدن مهار
نامی ازین ره دلت آگاه بہ
ساز بہ انداز ازین راه بہ

قایلہ و کاتبہ محمد معصوم النامی البکری تحریر فی الشهر رمضان سنہ ۱۰۱۴ھ۔ ۴۷ے

کتبہ ۵۳ ۱۰۱۴ھ

جے پور - نرانہ کلاں

جے پور میں نرانہ Naraina تالاب کے اوپر میر معصوم کا یہ کتبہ ہے:

۱- چند بخسپی تو درین خوابگاہ
خیز کہ بس دور دراز ست راہ

۲- قایله و راقمه محمد معصوم البکری النامی ۱۰۱۴ھ۔۴۹۔

اس کے ساتھ ۱۰۱۰ھ کا بھی کتبہ اسی جگہ پر تھا۔ جسے بعد میں جے پور میوزیم میں رکھ دیا گیا۔

کتبہ ۵۴ ۱۰۱۵ھ

ڈیرہ غازی خان

یہ کتبہ میر بزرگ کا ہے اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ میر بزرگ میرزا غازی ترخان کے ساتھ قندھار کی طرف سرکاری عہدے پر مقرر ہوئے تھے۔ اس کتبہ سے ان کی روانگی کا سال، تاریخ اور جانے کے راستے کا پتہ چلتا ہے۔ دریافت ہونے والے کتبوں میں اس خاندان کا یہ آخری کتبہ ہے۔ میر معصوم نے ٦ ذی الحج (جمعہ) ۱۰۱۴ھ کو انتقال کیا اور میر بزرگ گویا ایک سال بعد ۱۷ رمضان ۱۰۱۵ھ میں قندھار جاتے ہوئے یہاں سے گذرے۔ یہ قندھار جانے کا پرانا راستہ ہے جو ڈیرہ غازی خان کی لغاری تحصیل یارکھان متصل پشین روڈ سے گذرتا ہے۔

به تاریخ هفدهم ماه رمضان ۱۰۱۵ھ به حکم بندگان حضرت نور الدین محمد جهانگیر پادشاه غازی به کمک قندهار تعین شده بود، ازین منزل عبور نموده، میر بزرگ ابن نواب مرحومی میر محمد معصوم بکری المتخلص نامی۔ ۵۰۔

اس کتبے میں میر بزرگ نے "مرحوم" لکھ کر والد کی وفات کے مسئلے کو حل کر دیا ہے۔

میر بزرگ قندھار میں بڑے عرصے تک رہے۔ والد کی تربیت کے باعث کتبے لگانے اور یادگاریں قائم کرنے کی عادت تھی۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے قندھار میں کئی کتبے نصب کیے ہوں گے جن میں سے کچھ کی نشاندہی پروفیسر عبدالحئی حبیبی نے اپنی کتاب "تاریخ افغانستان در عصر گورگانی" میں کی ہے۔ افسوس کہ کتبوں کا متن نہیں دیا گیا۔

۱۔ مرزا سید عبدالجلیل (شاہ مقصود) بن سلطان خلیل بن سلطان محمد (متوفی ۸۵۴ھ) کے مزار پر میر بزرگ نے کئی کتبے نصب کیے۔ مزار کی عمارت بھی میربزرگ نے تعمیر کروائی۔ جس پر بعد میں (۱۰۵۵ھ) شاہ صفی صفوی نے بھی کتبے نصب کیے اور مرمت کروائی۔

۲۔ "کوہ شوراب" پر میر نے اس وقت کتبہ نصب کیا جب ان کے والد ایران جا رہے تھے۔ یہ کتبہ فراہ کے راستے پر دلارام کی حدود کے اندر کوہ شوراب پر ہے۔ یہ راستہ قندھار سے ھرات کی طرف جاتا ہے۔ میر بزرگ نے ۱۰۱۲ھ میں عمارت تعمیر کروائی اور کتبہ نصب کیا۔۵۱

حوالہ جات

۱۔ اکبر نے پینتالیسویں سال جلوس میں آگرے سے کوچ کیا اور گیارہ فرور دین ۴۵ کو برہانپور پہنچے۔ ۱۲ اردی بہشت ۴۶ کو بادشاہ برہانپور سے واپس ہوئے اور ۱۳ اخرداد ۴۶ کو آگرہ پہنچے۔ ۲۰ تاریخ کو فتح پور میں داخل ہوئے (اقبال نامہ ۳، ۴۷۳۔۴۷۷)
آگرہ سے برہان پور ۲۲۸ اکبری کوس تھے۔ اکبری کوس پانچ ہزار گز کا تھا۔ انگریزی میل ۱۱۶۰ گز کا ہوتا ہے اس حساب سے یہ فاصلہ آٹھ سو میل کا ہوا۔

۱۔ ...... عمارت پیش طاق کہ بہ فرمودۂ فردوس مکانی بابر پادشاہ در کوهی کہ موسوم بہ ''سرپوزه'' است، از سنگ بریده اند، و آن طاقیست در غایت ارتفاع و در مدت نہ سال هشتاد نفر سنگتراش هر روز آن جا کار کرده بہ اتمام رسانیده اند، الحق جای نفیس و فرح افزا است، و چون مشرف بر آب ارغنداب است و اکثر باغات و مزروعات آن دیار بر آنست، در ایام بهار محل عبور اکثر مردم می شود، اما از بس بلندی، بر آمدن بر آنجا بسیار دشوار است، بعضی از دهشت نمی توانند آنجا رسید.
و در آنجا کتابہ ای بہ نام حضرت فردوس مکانی بابر پادشاه و میرزا کامران و میرزا عسکری و میرزا هندال – کہ صاحب اهتمام بوده اند- نوشتہ اند و چون حضرت

جنت آشیانی همایون پادشاه آنجا تشریف نداشته اند،
اسم سامی ایشان دران کتابه مذکور نیست، و از
ممالک محرو سهٔ ایشان همین قندهار مرقوم نموده
بودند، کاتب چون آنجا رسید، دید که نام جنت
آشیانی و نام حضرت خلیفه الاهی و ممالک محروسه
حضرت - که هزار هزار برابر قندهار و کابل در تصرف
غلامان این درگاه است - نبود. به خاطر رسید که اسم
سامی ایشان و اسامی شهرها و ممالک محروسه در آنجا
درج باید نمود.
بنا بران، خوش نویس و سنگتراشان را از بکر طلبیده
کتبه در آنجا نوشت، و نام حضرت جنت آشیانی
حضرت شهنشاهی و اکثر شهر های ممالک محروسه
ایشان، از اقصای حدود بنگاله تا بندر لاهری و از کابل
و غزنین تا دکن، همه را داخل ساخته، قریب چهار
ساله آنجا کار کرد، به اتمام رسانید.
الحق مجموعه شده است که خلایق به تماشا میروند،
(معصومی ۱۳۱-۱۳۲

۳۔ چہل زینہ پر قاموس جغرافیائے افغانستان دیکھ
چاہیے، ۳:۸۹۔

۴۔ Travels in the Panjab and Afghanistan By Mohan Lal
Landon 1846.

۵۔ مفتاح، ص ۱۵۵-۱۵۶۔

۶۔ غالباً آخری دفعہ رسالہ تاریخ حیدرآباد دکن میں
حکیم شمس اللہ قادری "میر محمد معصوم نامی"
مقالہ میں ص ۴۳ پر شایع ہوا ہے۔

۷۔ کتبہ میں ہم نے علامتی نشانات دیئے ہیں۔ جنر
ایشیاٹک میں ص ۱۹۵ سے ۲۳۰ تک مضمون ہے

مضمون کا عنوان ہے: La Grande Inscription De Qandahar, Par M. James Darmesteter Fevrier Mars 1890.

۸۔ E.I.M ص ۲۶، سال ۳۰-۱۹۲۹ء، خواجہ محمد احمد، Inscription from Udgir, Bidar Distt,

۹۔ Cunningham's Reports VI-XX, P.16

۱۰۔ ص ۲۰۹، Allore and Rohri T.B.R.A.S. Vol.I, April 1843. اور ملاحظہ کریں Antiquities of Sindh, H. Cousens. P.78 اسی کا پھر حوالہ: حیات معصوم، الوحید سندھ آزاد نمبر، ستارہ سندھ ملہار نمبر، تاریخ معصومی کے ترجمے کے مقدمے میں اور مولانا شفیع کا مضمون اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۲۷ء، ص ۸۹ میں آیا ہے۔ آخری مضمون حامد علی نے ڈان کراچی میں (اگست ۱۹۴۹ء) لکھا۔

۱۱۔ ان کتبوں سے کچھ "انتخابات نادرہ" نامی رسالے میں منشی دیبی پرشاد نے چھاپے تھے۔ سال ۱۹۱۷ء لکھنؤ، ص ۱۲ تا ۱۶ میں اور کچھ میر مراد علی کی کتاب "یادگار مراد علی" (ص ۳۰۸-۳۰۶) سے افسر صدیقی نے رسالہ تنویر، کراچی مئی ۱۹۳۷ء، میں چھاپے تھے۔ میر نے یہ کتبے سرکاری عبارت کے مطابق حکومت ہند کے ریکارڈ سے میرے دوست مالک رام صاحب نے نقل کر کے ۱۱ فروری ۱۹۶۵ء کو بھیجے، یہ سب کتبے راقم نے اپنی کتاب "میرزا غازی ترخان اور اس کی بزم ادب" میں بھی شایع کیے ہیں۔

۱۲۔ تنویر کراچی مئی ۱۹۳۷ء، ص ۲

۱۳۔ Cunningham's Reports VI-XX, P.16

۱۴۔ یہ کتبہ پہلی مرتبہ مسٹر بلاخمن نے ۱۸۷۲ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں (ص ۱۶۰ پر)

شایع کیا۔ تاریخ معصومی کے سندھی ترجمے کے مقدمے میں مخدوم امیر احمد نے ڈاکٹر بلوچ کی نقل سے نقل کیا۔ یہ نقل غلط ہے۔ (ص۱۷) سید عبداللطیف کی کتاب آگرہ ص ۱۴۶ پر اور تزک جہانگیری، لکھنؤ، ص ۵ کے حاشیہ میں بھی شایع کیا ہے۔

۱۵۔ آگرہ، عبداللطیف، ص ۱۴۷۔

۱۶۔ اپی گرافیا انڈو مسلم ۳۴-۱۹۳۳ء، ص ۱۴-۱۵، رسالہ تاریخ حیدر آباد، ج، ا، ش، ا، اور بلاخمن مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۸۷۲ء۔

۱۷۔ Epigraphia Indo - Moslemica, Dr. E. Denison Ross, 1907-8. Some Muslim Inscriptions from Gawaliar State by Ramsing Saksena, P.56.

۱۸۔ Some Inscriptions from Jodhpur State Rajputana P.40-41 & E.I.M 1945-50.

۱۹۔ Some Inscriptions from Jodhpur state Rajputana by Dr. M. Abdullah Chaghtai, E.I. M. 1949-50, P.41

انتخاب نادرہ، منشی دیبی پرشاد، تاریخ معصومی کے دیباچے میں (یو) اور رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن میں ہے۔

۲۰۔ مقالہ کٹھو، عبداللّٰہ چغتائی، مطبوعہ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۴۔

۲۱۔ انتخاب نادرہ، منشی دیبی پرشاد اور رسالہ تاریخ حیدر آباد دکن۔

۲۲۔ رسالہ تاریخ حیدر آباد، ص ۳۹ اور ۱۰-۱۹۰۹ء، E. I.M.

۲۳۔ رسالہ تاریخ حیدر آباد، اور ۱۰-۱۹۰۹ء، E.I.M

The Inscription of Dhar E.I.M and Mandu, Zafar Hassan, P.17

۲۴۔ رسالہ تاریخ حیدر آباد، ص ۴۰، اور ۹-۱۹۱۰ء E.I.M.

The Inscription of Dhar and Mandu, Zafar Hassan, P.26

۲۵۔ E. I. M. 1934-33، ص ۴-۱۵، رسالہ تاریخ نمبر ۱۔

۲۶۔ یہ کتبہ مآثر الامراء میں بھی نقل ہے (۵۳۷:۲)

اس بیت کی نوعیت کا شعر شیراز میں اصفہان کے کتبے میں دیکھنے میں آیا ہے جو کہ پرسی پولس (شیراز) کے ایک پتھر پر ہے۔

مگر صاحبدلی روزی برحمت
کند در کار درویشان دعایی

(تخت جمشید علی سامی، ص، ۹ ۲۴-۳۵۷)

یہ شعر تاریخ بدایونی میں بھی ہے۔ (۳۹۴:۳)

اصفہان میں یہ ایک کتبے پر (۱۰۴۴) لکھا ہے۔

غرض نقشی است کزما باز ماند
کہ هستی رانمی بینم بقایی
مگر صاحبدلی روزی برحمت
کند در کار درویشان دعایی

اصفہان میں دوسرے کتبے پر مندرجہ ذیل مصرع تصرف کے ساتھ ہے:

کند درحق این مسکین دعایی

(گنجینہ آثار، ص: ۳۸۲)

۲۷۔ The Insriptions of Dhar E.I.M and Mandu By Zafar Hassan, P.26-27, 1909-10 E.I.M.

۲۸۔ سال ۴۴ جلوس نکلتا ہے۔

۲۹۔ سال فتح ۱۰۰۹ھ نکلتا ہے۔

۳۰۔ رسالہ تاریخ اور بلیٹن ناگپور میوزیم نمبر ۱، سال ۱۹۲۰ء اور معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۲۱ء۔

۳۱۔ ناگپور میوزیم بلیٹن نمبر ۱، ۱۹۲۰ء، معارف مارچ ۱۹۲۱ء۔

۳۲۔ ناگپور میوزیم بلیٹن نمبر ۱، ۱۹۲۰ء، معارف مارچ ۱۹۲۱ء

۳۳۔ E.I.M ۲۶-۱۹۲۵ء، محمد حمید قریشی، ص ۴ تا ۶۔

۳۴۔ E.I.M ۲۶-۱۹۲۵ء، ص ۳-۴، مقالہ عبدالحمید قریشی پر کتبات آسیر ڈاکٹر داؤد پوتہ کے مقدمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ (یو)

۳۵۔ سلیمہ سلطان بیگم کے والد کا نام میرزا نور الدین محمد اور والدہ کا نام بزرگ بیگم تھا۔ سلیمہ سلطان پہلے بیرم خان خان خاناں کے نکاح میں تھیں، ان کی وفات کے بعد اکبر نے ان کے ساتھ عقد کیا۔ یہ باغ بیگم نے خود لگوایا تھا اور اس میں دفن ہوئیں۔ (تزک جہانگیری، ص ۱۱۴)

۳۶۔ آثار اکبری یعنی تاریخ فتح پور سیکری، محمد سعید مارھروی سنہ ۱۹۱۵ء اور رسالہ تاریخ

۳۷۔ Extract from Report of J. H. Marshall of Archeological Buildings, 1907, P.7 بیانہ کی تاریخ کے متعلق Cunninghams Survey Reports

۳۸۔ Some Unpublished Inscriptions from Jaipur State

by G. Yazdani, E.I. M. 1923-24, P.21.

یہ شعر جیسلمیر کی مسجد پر بھی ہے، ملاحظہ کیجیے جیسلمیر کتبے۔

۳۹۔ Some Inscriptions from Jodhpur State, Rajputana, By Dr. M.A. Chaghtai, E.I. M. 1949-50, P-41

نیز انتخاب نادرہ اور رسالہ تاریخ دکن۔

۴۰۔ کٹھو از عبداللہ چغتائی، مطبوعہ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۲۸ء، ص ۱۶۵، احمد کٹھو کے لیے پڑھیے:

Muslim Monuments of Ahmadabad Through their Inscriptions by Abdullah Chaghtai 1942.

۴۱۔ میں پہلی دفعہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۶ء کو گیا۔ دوسری دفعہ ۱۹۷۶ء میں جانے کا موقع ملا۔ مولوی محمدحسین آزاد نے ایران کے سفر نامے میں اسی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔

۴۲۔ یہ کتبہ راقم الحروف نے تین چار مرتبہ دیکھا، ۲۲ اپریل ۱۹۷۴ء میں روزنامہ ہلال پاکستان کراچی میں اس پر مضمون شائع ہوا۔ اس کے بعد یہی مضمون کتاب ''پیوندهای ایران و پاکستان'' میں بھی طبع ہوا۔ اس کا عنوان تھا ''اصفہان نصف جہان'' سندم سندہ سونہاری''

۴۳۔ مقالہ ڈاکٹر علی اکبر جعفری ''سنگ نوشتہ های میرمعصوم بکری'' رسالہ هنر و مردم۔ سال ۱۵، شمارہ ۱۶۹۔۱۷۰، ص ۱۷۔

۴۴۔ مجلہ یادگار سال پنجم شمارہ ۸۔۹، ص ۹۸۔۹۹، جعفرافیائے بلوچستان۔ نوشتہ شیخ محمود افضل الملک کرمانی، مقالہ ڈاکٹر علی اکبر جعفری، ''سنگ نوشتہ هائے میر معصوم

بکری" ہنر و مردم، سال ۱۵، ش ۱۶۹۔۱۷۰، ص ۲۴۔

۴۵۔ Some Inscriptions from Jodhpur State, Rajputana, By Dr. M. A. Chaghtai, E.I. M. 1949-50, P-42

۴۶۔ مقالہ، کھٹو، عبداللہ چغتائی، مطبوعہ، رسالہ اردو جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۵۔

۴۷۔ Proceedings of the A.S. of Bengal, 1874, Persian Inscriptions of Agra, Sikandra and Narnaul, by H. Blochmann.

۴۸۔ آثار اکبری محمد سعید مارہروی، و رسالہ تاریخ۔

۴۹۔ Some Unpublished Inscriptions from Jaipur State, By G. Yazdani, E.I.M. 1924-23, P-20

انتخاب نادرہ، رسالہ تاریخ

ہمارا خیال ہے کہ نیچے جسے ۱۰۱۴ھ پڑھا گیا تھا وہ دراصل ۱۰۱۳ ہے۔ یہ کتبہ میر نے ایران سے واپسی کے وقت نصب کیا ہے۔ تصویر ملاحظہ کریں۔

۵۰۔ ھتھورام، "تاریخ بلوچستان"۔

۵۱۔ تاریخ افغانستان در عہد گورگانی، ص ۱۹۶-۱۹۷-۳۰۱۔

اضافہ

تاریخ سندھ میر معصوم

تاریخ سندھ کے انگریزی ترجمہ کا ذکر ص ۳۲۶ پر کیا گیا ہے۔ مسٹر ایلیٹ کے ترجمے کے علاوہ بعض مصنفین نے اس کتاب کے اقتباس انگریزی میں ترجمہ کر کے بیان کیے ہیں، جو اس طرح ہیں:

۱۔ ایلیٹ نے تاریخ ہند کی پہلی جلد میں ص ۲۱۵ سے ۲۵۲ تک اقتباس دیا ہے۔

۲۔ قلیچ بیگ نے تاریخ سندھ (کراچی ۱۹۰۲ء) کی جلد اول میں عربوں کی فتوحات سے کلہوڑا دور کی شروعات تک اس کی تلخیص دی ہے۔

۳۔ ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی نے ارغونوں و ترخانوں کی تاریخ (History of the Arghuns and Tarkhan of Sindh) کے عنوان سے ارغونوں اور ترخانوں کے دور کا ترجمہ نہایت تحقیق اور مفید حواشی کے ساتھ انگریزی میں کیا ہے۔ میر معصوم سے جو لغزشیں ہو گئی تھیں ان سب کا نہایت تحقیق سے ازالہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب سندھیالوجی نے ۱۹۷۲ء میں شائع کی۔

ڈاکٹر داؤد پوتہ کے مطبوعہ نسخے میں جو غلطیاں رہ گئی ہیں اسے ڈاکٹر صدیقی نے دوسرے نسخوں کو سامنے رکھ کر تصیح کا اہم کام سر انجام دیا ہے۔

"پرانے سکھر میں معصومی سادات کا قبرستان"

معصومی سادات کا نئے سکھر کے مینارے والے قبرستان کے علاوہ پرانے سکھر میں ان کے محلے کے نام سے

مشرق میں بھی ایک قبرستان ہے جو پرانا نارہ (کینال) یعنی سکھر کینال کے کنارے پر ہے جس پر بیگاری بند بھی ہے۔ دو قبریں پختہ اور خاص ہیں:

۱۔ میر بزرگ ثانی کی قبر پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہے۔

۲۔ بی بی دردانہ کی قبر ہے۔ اس بی بی کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

"میر معصوم کا گھر"

سید قوت علی شاہ صاحب کی روایت ہے کہ ان کے بھائی محمد علی شاہ کا مکان میر معصوم کی حویلی والی سرزمین پر ہے اور مکان کا مردانہ حصہ وہی ہے جہاں اب قوت علی شاہ کی اپنی اطاق ہے۔

سید صفائی کی مسجد بھی اسی اراضی میں ہے جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ میر صفائی اور میر معصوم کے مکانات واقعی اسی جگہ پر تھے۔

"دربیلا اور میر معصوم"

میر کی دربیلہ میں جاگیر تھی جو ۱۰۶۳ھ تک ان کے نام سے مشہور رہی۔ راقم الحروف نے "محکمہ اسناد قدیمہ" کی کتاب "تفسیر واحدی" (۵۔۶۔۱۹۷۲ء) میں خریدی جس پر یہ عبارت ثبت ہے:

"هذه النسخة الشريفة الكريمة المسمى تفسير لامام الهمام الواحدى تغمده الله برحمة، بعون الله و حسن التوفيق . تم وقت الضحى من يوم الثلثاء و اثناء و عشرون من شهر المحرم."

كاتبه و مالكه فقير قاسم بن حسين بن صدر الدين عرف تميم ساكن كند يارو مسكن بدر بيله

– وقد كتبته لاجلی و لنفع غیری– تم هذا فی عهد
سید معصوم بکری و تم فی بلدة المباركة التی
سعدت العلماء و صلحاء المسمی بدر بیله.
(بتاریخ : ١ صفر ١٠٦٣)

داخل کتبخانه شد

ملاحظه

العبارة المذكورة نقلت كماهی كتبت
علی النسخة الخطیة التفسیر الواحدی.

رجال

آ

آخوند محمد اسحاق بکھری ۸۸، ۹۰، ۹۸، ۳۵۲

آغا سلطان میرزا ۲۸۲

آصف خان ۱۱۰، ۱۷۵

آصف خان ثانی ۱۰۲، ۱۰۴

ابراہیم بیگ ۱۴۸

ابوالبقاء امیر خان ۲۵۲

الف

ابرہیم ادھم ۴

ابوالفضل ۶، ۳۶، ۱۱۲، ۱۲۰، ۱۷۴، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۰، ۲۳۲

ابوالفضل بن میر عدل ۳۵۵، ۳۵۷

ابوالحسن (برادر نور جہاں) ۲۳۰

ابوالنبی اوزبک ۲۳۰

ابونصر خوافی ۱۸۳

ابوالقاسم بن اعتماد خان ۱۴۱، ۲۹۷

احمد ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱

احسن کربلائی ۲۴۴

احمد جام زندہ پیل ۱۹۹، ۴۷۵

احمد خان ترخان ۵۵

اختر علی شاہ بن مظہر علی شاہ معصومی ۳۴

ارباب علی شاہ معصومی ۳۴۵

استھہ ۳۱۵

اسماعیل قلی خان ۱۱۲

اعظم خان ۱۳۲

اعتماد خان (صوبیدار گجرات) ۱۰۲

اعتماد خان (گورنر بکھر) ۱۰۲، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۳۲

اعتماد الدولہ ۱۰۴

افضل خان ۱۷۶

اقبال علی شاہ معصومی ۳۴۷

اکبر شہنشاہ ۳، ۱۰، ۳۶، ۶۶، ۸۱، ۸۵، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۴، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۷، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۵۹، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۵، ۳۲۲، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۶۳، ۳۶۸، ۴۴۷، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲،

الغ بیگ ۱۴۸، ۳۲۱

الیاس توپچی ۱۴۸

الھ بردی توپچی ۱۴۸

الھ وردایو شاہ ۳۴۵

امام جار اللہ ۶۳، ۸۹

امام موسیٰ کاظم ۱، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۴۹

امام جعفر صادق ۴۹

امام محمد باقر ۴۹

امام زین العابدین ۴۹

امام غزالی ۲۰۰

امام رضا ۱۹۹، ۲۰۰

امداد ۳۴۷

امید علی شاہ ۱۷

(ب)

بابا اسحاق مغربی ۴۸۰

باباچوچک (اتک محمود بکھری) ۵۵

باباحسن ابدال ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۷، ۸، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۳۱، ۱۶۸، ۱۷۲، ۴۴۹، ۴۶۰، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۱

بابر بادشاہ ۳، ۲۷، ۲۸، ۳۰، ۷۸، ۷۹، ۳۵۳، ۴۴۵، ۴۴۶

بابر احمد (برادر محمود بکھری) ۵۵

باقر علی شاہ معصومی ۳۴۵

باقی بیگ اوزبک ۳۳۴

باقی ترخان ۳۳، ۵۲، ۱۲۴، ۱۳۵، ۱۴۱

بختیار بیگ ۱۴۸، ۱۵۷

بخشی نظام الدین ۸۸، ۹۸

بدایونی، ملا عبدالقادر ۱۰۲، ۱۲۷، ۱۲۸، ۲۴۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۷، ۲۸۴، ۳۴۰، ۳۵۴، ۳۵۵

برٹن ۲۱۲

بسنت رائے ۱۴۸

بقائی مشغولی ۱۲۷، ۳۶۴، ۳۶۵

بکھری بیگم (سلطان محمود) ۹۹

بلقیس بیگم (مریم مکانی) ۲۱۶

بلاخمن ۳۱۷

بنیاد بیگ ۱۲۰

بہادر خان فاروقی ۱۷۵

بہادر قول دار ۱۴۸

بہادر ملک ۱۴۸

بہادر خان ۱۴۸، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۳۳۴، ۴۶۸

بہاؤالدین زکریا ملتانی ۶۰

بیگ محمد توقبائی ۱۲۰، ۱۲۲

بیبی دردانہ ۴۸۵

بیگ خان کابلی ۴۴۹

بیبی فاطمہ ۷

بیم دلپت ۱۴۸

(پ)

پائندہ محمد ترخان ۵۵

پائندہ محمد قریشی ۵۴

پناہ علی شاہ معصومی ۳۴۷

پنوں ۵۳

پرویز شاہ ۴۴۹

پیر علی گوہر شاہ ۲۸۲

پیر علی محمد راشدی ۷۷، ۹۱، ۲۷۴، ۳۱۵، ۳۲۰، ۳۴۵، ۳۷۴

(ت)

تاج شیرازی ۳۶۴

ترخان دیوانی ۹۱، ۹۹، ۱۱۲،

تردی بیگ ۸۰

ترسو خان ۱۱۱

تقی الدین ۳۶۷

تقی اوحدی بلیانی ۲۱۴، ۲۷۰، ۳۷۶

تقی کاشی ۸۵، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۴۵، ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۷۲، ۲۸، ۲۸۳، ۲۸۴، ۳۶۷، ۳۷۴، ۴۳۳

توڈرمل ۲۳۲

تیمور ۶۵

تیمور بدخشی ۱۱۰

(ث)
ثابت علی شاہ معصومی ۴۸، ۳۲۱، ۳۴۴، ۳۴۵
(ج)
جان بیگ ۱۴۸
جانی بیگ ترخان ۵۵، ۹۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۱،
۱۴۲، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۵
جبار بدری ۱۱۳
جگمل (برادر سرزل دیو) ۱۲۱
جلال بخاری اُوچی ۱۵۰
جلال الدین قولاچی ۳۵۶
جوہر خان ۵۵
جہانگیر نورالدین ۱۰۴، ۲۳۰، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۷،
۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۸، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳،
۳۳۶، ۳۶۳، ۴۵۷، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲
جام نظام الدین سموں ۲۹
(چ)
چراغ دہلوی ۱۵۰
چنگیز ۶۵
(ح)
حاتم سنبھلی ۳۵۵
حاکم علی پاشا ۲۰۵، ۳۴۷
حامد علی ۳۵۵
حبیب اللہ کوریجہ ۲۸۱
حسام الدین راشدی ۳۴۵
حسین ۱۸,۱۹,۲۰,۴۹,
حسن علی عرب ۱۴۸۸
حسن علی شاہ معصومی ۳۴۷
حسین خان جاگیردار ۳۵۶
حکیم شفائی ۲۱۴, ۳۶۸
حکیم عین الملک ۳۵۶, ۳۵۹
حکیم یعقوب خان ۳۲۹
حمزہ بیگ ۵۴, ۵۵
حمیدہ بانو ۸۱
حیائی ۱۲۷, ۳٦٦
(خ)
خان خاناں، مرزا عبدالرحیم ۹۲، ۱۲۱، ۱۰۴، ۱۱۴،
۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹،
۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۶۴،
۱۸۰، ۲۵۹، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵
خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش ۹۰، ۱۰۴، ۱۱۱، ۱۱۲،
۱۱۳، ۱۷۵، ۲۳۷،
خاکی بیگ ۱۴۸
خبسہ ۱۱۲
خدابندہ صفوی ۱۶۱
خسرو بن جہانگیر ۲۳۰؛ ۲۳۱، ۲۳۷، ۳۳۰، ۳۳۱،
۳۳۲، ۳۳۳، ۴۴۹
خواجہ ابوالقاسم ودیواں گجرات ۱۱۹
خواجہ ابراہیم حسین ۳۵۸
خواجہ باقی ۴۶، ۴۷، ۵۵
خواجہ حسام الدین ۱۴۸
خواجہ حسن ۴۵۰
خواجہ حفری ۱۴۸، ۳۱٦
خواجہ شمس الدین ماحولی ۵۵
خواجہ عبداللہ انصاری ہراتی ۳۵۳
خواجہ غیاث الدین علی آصف خان ثانی ۱۰۲
خواجہ محمد علی چشتی مودودی ۳۳۶
خواجہ محمد حسین ۵۵، ۳۱۴

خواجہ محمد مقیم بخشی ۱۴۸، ۳۱۴
خواجہ محمد ھاشم قندھاری ۱۶۸، ۳۱۴
خواجہ ناصر ۱۱۰
خواجہ نظام الدین احمد بخشی ۳۷، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲،
۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۲، ۲۶۸،
۲۶۹، ۲۷۷، ۱۲۲، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴،
۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۵
خوازم شاہ ۱۷، ۱۸
خیام ۱۹۹
(د)
دانیال مرزا ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۴۴۹، ۴۷۰
داؤد خان ۱۵۷
درویش محمد انبار ۶۰
درویش محمد ۵۵
دریا خان ۱۵۷
دولت خان ۵۴
دولت خان لودھی ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۵
(ڈ)
ڈاکٹر داؤد پوتا ۱۶، ۳۶، ۴۴، ۷۷، ۲۴۲، ۲۴۵،
۲۷۶، ۲۷۸، ۲۸۱، ۲۸۲، ۳۷۵، ۴۸۴،
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۷۴
ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی ۴۸۴
(ذ)
راجا بیربر ۲۳۲
راجا توڈرمل ۱۱۱
راجا علی خان فاروقی ۱۷۴
رائے درگاہ ۱۲۳
رائے زادہ بہلول ۵۸
رائے سرجن ۱۱۳
رائے مان سنگھ ۱۰۹، ۱۴۹، ۲۳۱، ۲۳۷
رستم سلطان ۱۴۸
رسول بخش شاہ بن علی ثابت علی شاہ ۳۴۵
رحمان دار قانفانان ۳۶۳
رکن عالم ملتانی ۶۰
راجا نارائنداس ۱۰۹، ۱۱۰
روضہء دھنیؒ ۸۷
(ز)
زلیخا ۲۵۰، ۲۷۲، ۲۷۳
زینت بیگم ۲۱۶
زین خان کوکہ ۱۱۲
زینک ترخان ۵۵
(س)
سردار خان ۳۳۴
سرخ بدخشی ۱۱۲
سرنال دیو (والی سروہی) ۱۲۱
سبکت گین ۳۵۴
سکمینا ۳۵۴
سکندر بیگ ترکمان ۲۰۷
سکندر علی شاہ معصومی ۷۴، ۷۵
سعید چغتائی ۲۳۳
سلطان احمد شاہ (بانی احمد آباد) ۱۱۷
سلطان بیگم ۳۱۶
سلطان حسین بہادر ۱۶۴
سلطان حسین مرزا بایقرا ۲۷
سلطان حسین مرزا صفوی ۱۶۴
سلطان خلیل ۴۸۳

سلطان زین العابدین کشمیری ۳۵۸
سلطان سنجر سلجوق ۲۱۲
سلطان علی ارغون ۵۳
سلطان علی ارغون ۵۳
سلطان قلی بیگلار ۵۶
سلطان محمد ۴۸۳
سلطان محمد ۴۸۳
سلطان محمد مہر دار ۵۴
سلطان مقیم بیگلار
سلطان مودود ۳۳۶
سنبل (ملازم شاہ بیگ) ۲۸، ۲۹
سیدی علی رئیس ۳۷۵
سلیم (جہانگیر) ۱۷۵، ۱۷۶، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳
سلیم سلطان بیگم ۲۴۰، ۲۴۲
سلطان محمود شاہ سوم (مقلب سلطان مظفر)
۱۱۷، ۱۱۸
سلطان محمود (والی احمد آباد) ۱۴۱
سلطان محمود بکھری ۳، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۴۵،
۴۶، ۵۲، ۵۳، ۵۸، ۶۰، ۶۲، ۶۶، ۷۳، ۸۸، ۹۱،
۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۱۷، ۱۳۵، ۱۶۲، ۲۹۴، ۳۴۹، ۳۵۲
سید ابراہیم (جد میر کلاں) ۴۹
سید النبی طالب محمد (جد میر کلاں) ۴۹
سید احمد ۱۶، ۱۷
سید امام الدین ۱۵، ۱۷
سید امیر انصاری ۱۰
سید برکون بن میر کلاں ۴۸
سید بندہ علی ۱۴۸
سید بہاؤالدین بخاری ۱۴۸، ۱۵۷
سید بیگ بن معصوم بیگ صفوی ۱۶۲
سید ثعلب (جد میر کلاں) ۴۹
سید جعفر ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۴۹
سید جلال بخاری ۱۲۰
سید حسین زنجیر پا ۷، ۸، ۹، ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰،
۲۱، ۲۲، ۲۶، ۴۴۹
سید درویش ۱۴۸
سید رضا ۱۶، ۱۷، ۲۰
سید شمس الدین ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱
سید شیر مرتضیٰ ۱۵، ۱۷
سید طالب بن میر کلاں ۴۸
سید عبدالجلیل (شاہ مقصود) ۴۸۳
سید علاؤالدین ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱
سید علی ۱۵، ۱۷
سید علی شاہ ولد حکم علی شاہ معصومی ۳۴۷
سید علی شیرازی ۳۸
سید عین الدین ۷، ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۱۶۸
سید لطیف ۴۶۰
سید محمد ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۴۹
سید محمد بزرگ ۱۵، ۳۲۷، ۳۲۸
سید محمد شیر قلندر ۹، ۱۰، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲،
۲۶، ۳۶، ۴۴، ۱۶۸، ۱۷۲، ۳۲۰، ۳۲۸، ۴۴۹،
۴۶۰، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۱
سید مغفور (جد میر کلاں) ۴۹
سید میر شاہ ۱۷
سید میر علی ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۱۴۸
سید میر کلاں کھابڑوئی
۳۵، ۳۶، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹

سید موسیٰ اصغر ۱۹
سید ہارون ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹
سید ہیبت اللہ ۴۹

(ش)

شاہ اسماعیل ثانی ۱۶۱
شاہ اسماعیل صفوی (شاہ ایران) ۲۷، ۲۸
شاہ بیگ ارغون ۳، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۴۶، ۵۶،
۵۷، ۷۹، ۱۵۰
شاہ بیگ خان کابلی ۱۴۸، ۱۵۱
شاہ بیگ (مغلیہ گورنر قندھار)
۶۶.۵۸، ۱۶۵، ۱۶۹
شاہ جہاں ۲۳۰، ۲۳۱، ۴۷۰، ۴۸۱، ۲۶۱
شاہ حسن ارغون ۹، ۳۰، ۳۲، ۴۵، ۵۶، ۶۳، ۶۶،
۷۳، ۷۸، ۸۹، ۳۴۹
شاہ حسین میر ۱۶۱
شاہ حسین نکودری ۴۶، ۵۴
شاہ خیر الدین جیلانی ۳۲۷
شاہ رخ زا (والی خراساں) ۱، ۴، ۶، ۷، ۲۱، ۲۲
شاہ سلیم ۴۴۹
شاہ شجاع ۶
شاہ شمس تبریز ۱۸
شاہ صفی صفوی ۴۸۳
شاہ طہماسپ صفوی ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۴
شاہ عباس اول ۸۵، ۸۶، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۳، ۲۰۴،
۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۴۶
شاہ عباس صفوی ۸۵، ۲۰۸، ۲۱۳
شاہ عباس قندھاری ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۸۳
شاہ عبدالطیف بھٹائی ۵۲، ۵۳
شاہ عبدالکریم بلڑی ۳۸
شاہ قاسم انوار ۱۹، ۱۹۹
شاہ قطب الدین ۳۲
شاہ قلی ۱۰۱، ۱۱۲، ۳۵۲،
شاہ محمد کلاتی ۱۶۱
شاہ محمود ملی ۲۹۴
شاہ نعمت اللہ ولی ۲۱۵
شجاع شیرازی ۳۶۴
شرف الدین پاشا ۲۰۵، ۲۰۸
شریف خان ۱۶۵
شریف خان ۱۶۵
شریف لاہوری ۲۴۳، ۲۴۵
شکراللہ شیرازی ۶۲، ۶۳
شکیبی ۳۶۳، ۳۶۴
شمس الدین ابوعلی نجمی ۱۶۸
شمشیر بیگ ۱۴۸
شہباز الدین احمد خان نیشاپوری ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲،
۱۰۴، ۱۱۹
شہباز علی بن میر بزرگ ثانی ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۴۴،
۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷
شہریار ۲۳۰
شیبانی خان ۱۸۳، ۱۸۵
شیخ ابراہیم بخشی ۱۱۲
شیخ اسحاق فاروقی بکھری ۱۰۰، ۳۵۱
شیخ بنجو ۳۵۵
شیخ جمال بختیار ۱۱۳
شیخ حمید الدین ناگوری ۲۱۷، ۲۲۷، ۴۶۳، ۴۶۲، ۴۷۳
شیخ دربیلائی ۸۹، ۹۰، ۹۲

شیخ زین العابدین تادیبدائی ۱۹۹
شیخ سعدی ۳۵۲
شیخ عبداللہ ۶۵۵؛۳۵۵
شیخ عبداللہ حیدر آبادی ۳۵۵
شیخ عیسیٰ سندھی جنداللہ ۳۸،۶۵
شیخ فرید بخاری ۱۷۵،۱۷۶،۱۷۹
شیخ فرید بکھری ۳۷،۹۰،۱۰۰،۱۰۱،۲۵۳،۲۵۴،
۲۵۵،۲۶۹،۲۷۰،۳۲۹،۳۳۰،۳۵۱،۳۵۲،۴۴۸
شیخ مبارک ناگوری ۳۵۵
شیخ مبارک ۳۵۵
شیخ محمود غزنوی ۱۲۴،۳۵۶
شیخ محمد (شیخ السلام ٹھٹہ) ۶۳
شیخ یعقوب صیرفی ۳۵۹
شیر خان فولادی ۱۱۸،۱۱۹،۱۲۱،۱۴۸
شیر شاہ سوری ۷۸،۷۹
شیرویہ خان ۱۱۳

(ص)

صابر علی شاہ معصومی ۷۴
صادق علی شاہ کھابڑوئی
صالحہ بیگم (والد مجاہد خان) ۶۰
صدر الدین ۴۸۵
صرفی ساؤجی ۱۲۷،۳۶۶
صفدر خان ۱۷۶
صفر بیگ ۱۱۳

(ض)

ضیاءالدین کاشی ۱۸۳،۱۸۴

(ط)

طہماسپ اول ۲۴۶

(ع)

عادل شاہ فاروقی ۴۶۷؛۴۶۹
عباس علی شاہ معصومی ۷۴،۳۷۴
عبدالباقی نہاوندی ۱۰۲
عبدالرحمان بن ابوالفضل ۱۷۶،۱۸۰
عبدالرحمان بن کمال الدین ۱۷
عبدالحئی حبیبی افغانی ۲۷۴،۴۸۳
عبدالخالق گیلانی ۷۲،۹۲
عبدالغفور ابن مولوی احمد ۱۷
عبدالغنی ۱۴۸
عبداللطیف ۵۲،۱۴۸
عبداللہ خان اوزبک ۱۶۲،۱۶۳،۱۶۴،۱۶۵
عبداللہ خان ثانی ۲۴۶
عبداللہ یزدی ۹۲
عبدی رازی ۱۲۷،۳۶۶
عتابی تکلو، حسین بیگ ۲۱۴،۳۶۹
عرفی ۳۶۳،۳۶۴
عزت علی کابلی ۱۴۸
عسکری مرزا ۳۵۳،۴۴۵،۴۴۷
عطار، فرید الدین ۱۹۹
علی بن حامد کوفی ۲۷۹
علی حسن ارغون ۵۴
علی رضا آگاہ ۲۰۰
علی محمد کوکلتاش ۵۴
علی مراد اوزبک ۱۱۰
علی مردان خان بہادر ۱۴۸
علی مردان شاہ معصومی ۳۴۴
عنایت علی شاہ معصومی ۳۴۵

عہدی شیرازی ۱۲۷
عیسیٰ ترخان ۳۲، ۳۳، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۶۵، ۱۱۷، ۳۴۹
عیسیٰ زمیندار ۱۱۳
غازی بیگ ترخان ۳۳۲، ۳۵۲، ۳۶۳، ۳۶۹، ۴۸۲
غلام علی شاہ (مترجم معصومی) ۲۸۲
علام شاہ معصومی ۳۴۶
(ف)
فاضل کوکلتاش ۵۳
فتح ولد جانی بیگ ترخان ۱۵۲
فرخ بیگ ۱۴۸
فردوسی طوسی ۲۰۰
فریدون برلاس ۱۴۸
فیضی ۱۳۹، ۲۳۲، ۳۵۵، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۶
فقیر قاسم ۴۸۵
فقیر محمد ترخان ۵۵
فیروز تغلق ۱۵۰
قاسم کوکو ۱۴۸
قاضی ابوالمعالی بخارائی ۳۵۵
قاضی ڈتہ سیوھانی ۶۳، ۸۸
قاضی شرف الدین ۸۸، ۸۹
قاضی صدرالدین ۸۸
قاضی عبداللہ ۶۵
قاضی علی بن اسماعیل ۳۱۶
قاضی فخر الدین ۳۱۶
قاضی قاضن ۳۸، ۱۲۳
قرا بیگ ترخان ۱۴۸
قربان علی معصومی ۳۴۷
قزا خان ۳۳۴

قطب الدین خان ۱۹، ۲۱، ۱۰۹
قلندر لعل شہباز ۴۴، ۴۷، ۴۸، ۴۹
قلی محمد ۱۴۸
قلیچ بیگ مرزا ۴۸۴
قوت علی شاہ معصومی ۷۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۴۸۵
(ک)
کامران میرزا ۴۴۵، ۴۴۶
کامی ۳۶۴
کرنس ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۵
کلیم ۳۶۳، ۳۶۴
کنگری ۸۷، ۸۸، ۹۰
کوکو ترخان ۵۵
کھائی سادات ۳۵، ۴۸
(گ)
گوردھن راول ۱۴۸
(ل)
لطفی منجم ۱۲۷، ۳۶۶
لیلیٰ ۲۵۰، ۲۷۲
(م)
مالک رام ۳۱۹
محب ترخان ۵۵، ۶۰
محب علی خان ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۱۱، ۱۱۲
محب علی خان بن میر خلیفہ ۹۹
محمد ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱
محمد بن سبکتگین ۵
محمد حسین شیخ ۱۱۹
محمد خان شیبانی ۲۷، ۲۸
محمد خان نیازی ۱۴۸، ۱۵۱

محمد رضا بن عبدالوسیع ۲۸۱
محمد رضا فکری ۲۱۴، ۳۶۹
محمد زکریا ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۸۸، ۳۲۹
محمد زمان باقی چہاردانگی ۱۴۸
محمد شجاع ۳۷، ۳۸
محمد شیرازی ۳۶۴
محمد صادق خان ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۳۵، ۱۳۶
محمد صادق خان بخشی ۱۱۲
محمد علی شاہ معصومی ۴۸۵
محمد علی شاہ ولد حکم علی شاہ معصومی ۳۴۷
محمد غوث گوالیاری ۴۶۱
محمد قلی تنگری بردی ۱۴۸
محمد مقیم بن امیر ذالنون ۳۶۴
مخدوم اشرف ۳۵۵، ۳۵۶
مخدوم امیر احمد ۲۸۲
مخدوم بلال ۶۳، ۸۸، ۸۹
مخدوم رکن الدین ۶۴
مخدوم عبدالعزیز ابہری ۸۸
مخدوم فخر پوتہ ۸۸
مخدوم فضل اللہ ۶۴
مخدوم قاضی عثمان دربیلائی ۶۴، ۹۱، ۹۲، ۱۵۰
مخدوم میران ۶۴
مخدوم نوح ۳۸
مخصوص خان ۱۱۲
مراد بن اکبر بادشاہ ۲۳۱
مراد بیگلار ۵۵
مرادیاب خان ولد نور محمد ۳۲۹
مرشد قلی ۱۴۸
مرید خان سرمدی ۱۴۸
مطربی قندہاری ۳۷۷
مطب خان ۱۱۳
مظفر خان ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۱۱
مظفر علی شاہ معصومی ۳۴۶
معصوم کابلی ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳
مقصوص بیگ ۱۴۸
ملا احمد ٹھٹوی ۱۶۳، ۲۷۰
ملا امین (خوافی) ۱۲۷
ملا حالتی ۱۲۷
ملا محمد ساکن کنگری ۸۷، ۹۰
ملا محمد صدر مدرسی ۸۸
ملا محمد ۱۴۸
ملک قمی ۳۶۵
ملک محمد کھوکھر ۵۴
ملک مقرب خان ۱۷۶
ملک یاقوت ۱۷۶
شاہ ابن حامد ۳۵۵
منور علی شاہ معصومی ۳۴۶
مولانہ جامی ۲۵۰، ۲۷ب، ۳۵۰
مولانا روم ۳۵۲
مولانا ضیاء الدین ۶۴
مولانا عبداللہ مفتی ملتانی ۶۴
مہاراجہ اول ۱۷۲
میر ابوتراب ۱۱۹
میر ابوالخیر ۴۶
میر ابوالفتح ۵۴
میر ابوالقاسم بن سید صفائی ۳۴۱، ۳۴۲

میر ابوالقاسم نمکین ۱۵۷، ۱۵۸، ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۵۲، ۲۶۱، ۳۰۷، ۳۱۶، ۳۲۶
میر ابوالمظفر ۱۱۳، ۱۲۲
میر ابو مسلم
میر احسان علی بن میر لطیف اللہ ۳۲۷، ۳۲۸
میر ارباب علی شاہ ۳۱۰
میر اسد اللہ ثانی ۲۸۱، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹
میر امانی ۱۲۷
میر بزرگ ثانی بن سید علی شیر ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۴۸۵
میر بزرگ ول میر معصوم ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۸۶، ۱۷۲، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۹، ۲۳۹، ۲۴۴، ۲۶۴، ۲۹۸، ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۲، ۳۴۴، ۳۴۶، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۵۲، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۲، ۴۸۳
میر تقی ۱۷، ۱۸
میر جعفر علی شاہ معصومی ۳۱۰
میر جملہ ارغون ۵۴
میر حبیب اللہ ابواسحاق ۱۲۰، ۱۲۲
میر حمید بن محمود ساربان ۴۶، ۵۵
میر حسین شاہ ۳۱۰
میر خسرو بن سید طالب ۴۸
میر دوست میر آخوند ۵۴
میر سفر ارغون ۵۴
میر سلطان ارغون ۵۴
میر سطان قلی بیگ ۵۴
میر سید قاسم ۵۴
میر سید صفائی ۱۰، ۱۵، ۱۷، ۲۰، ۲۱، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۴۴، ۵۲، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۶۶، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۲۹۲، ۲۹۷، ۲۹۹، ۳۰۱، ۳۱۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۴، ۳۴۶، ۳۴۹، ۴۶۰، ۴۶۸، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۴، ۴۸۵
میر سید محمود (میر عدل) ۳۶
میر شاہ محمود ارغون ۵۴
میر شرف الدین ۱۲۰
میر شریف وقوعی ۱۲۷
میر صالح ۱۹، ۱۲۰
میر عباس علی معصومی ۳۴۴، ۳۴۵
میر عبدالرزاق ۵۴
میر عبدالفتاح (برادر محمود بکھری) ۵۹
میر عدل امروہوی
میر عزت اللہ ۳۲۷، ۳۲۸
میر علی شیر قانع ٹھٹوی ۱۷، ۳۵، ۲۶۳، ۲۷۱، ۲۷۹، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۵، ۳۵۱
میر عزیز اللہ بن سید محمد بزرگ ۳۲۷، ۳۲۸
میر عظیم علی شاہ ۳۱۰
میر علی ارغون ۵۴
میر علی اکبر شاہ ۳۱۰
میر علی مراد خان ۱۷۲، ۱۷۵
میر عماد ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰
میر عنایت علی شاہ ۳۱۰، ۳۲۷، ۳۲۸
میر عیوض ۳۶۴
میر علی محمد شاہ (راشدی) ۱۶
میر غوث علی شاہ ۳۱۰

میر فاضل ۳، ۶، ۳۰، ۳۷، ۳۸، ۳۲۶
میر فرخ ارغون ۵۴
میر فیض علی شاہ ۲۱۰
میر قاسم کبیک پوش ۵۴
میر کبیک ارغون ۵۴
میر کرم شاہ ۳۲۷، ۳۲۸
میر کوچک ۵۵
میر گھیسو خان ۱۰۲
میر گلاب شاہ ۳۲۷، ۳۲۸
میر لعل شاہ ۳۱۰
میر لطف اللہ بن سید محمد بزرگ ۳۲۷، ۳۲۸
میر مرتضیٰ ۱۰، ۱۸، ۲۰
میر معصوم بکھری ۱، ۲، ۳، ۷، ۸، ۹، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸،
۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷،
۳۸، ۴۴، ۴۵، ۴۷، ۴۸، ۵۹، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۷۲،
۷۳، ۷۷، ۷۸، ۸۱، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹،
۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴،
۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶،
۱۲۷، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۷،
۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۲،
۱۷۵، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۵، ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۵،
۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۷،
۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸،
۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۳، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۱،
۲۷۲، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۸۸،
۲۹۲، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۹، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۷،
۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷،
۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۲۹،
۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۶، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۴،
۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵،
۳۵۹، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۹، ۳۷۴، ۳۷۵،
۳۷۶، ۴۳۳، ۴۳۸، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۵،
۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳،
۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰،
۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶
میر محمد زکریا بن میر بزرگ ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۶
میر محمد فاضل بن میر صفائی ۳۰۸، ۳۴۱
میر محمد قلی ۵۴
میر محمد علی شاہ ۸۵، ۲۷۴، ۳۱۰،
میر محمد مسکین ترخان ۵۵
میر محمد ساربان ۵۴
میر مراد علی ۳۱۹، ۴۵۸، ۴۵۹
میر مظفر ۴۸
میرزا ابوالخیث بخاری ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲
میرزا احمد نیشاپوری ۲۱۴
میرزا بیگ سالار قلی ۱۴۸
میرزا بیگ قاشقال ۱۱۳
میرزا پائندہ بیگ ۱۵۲
میرزا حکیم ۱۶۳
میرزا رستم صفوی قندھاری ۱۶۴
میرزا شادمان ۵۵

میرزا شاہ حسن ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۹، ۱۱۸
میرزا شاہ مسعود ۴۶
میرزا صائب ۳۶۸
میرزا غالب ۱۵۲
میرزا فولاد خان ۱۶۳
میرزا قاسم ۵۴، ۵۵
میرزا قندھاری بن میر بزرگ ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۳۵
میرزا محمد ۱۴۸، ۱۵۱
میرزا محمد مقیم ۱۱۰
میرزا مظفر صفوی قندھاری ۱۶۴، ۱۶۵
میرزا منوچہر بیگ ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۸، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۸
میرزا نورالدین محمد ۳۲۹
میرک یوسف ۱۵۸، ۱۵۲، ۱۵۷، ۲۵۸
(ن)
ناصرالدین خلجی ۴۶۱
نامدار شاہ ۴۴۹
نائب علی شاہ معصومی ۳۴۵، ۳۴۶،
نصراللہ ۲۰۷
نظام الدین علی خلیفہ بابر ۲۵۹
نظام الدین ہروی ۱۶۶۸۶۸۵، ۲۴۸
نظامی گنجوی ۲۷۱، ۲۷۰
نظیری ۳۶۳، ۳۶۴
نواب علی ۱۸۹
نورالدین ۱۸
نور جہاں ۲۳۰
نور محمد ۱۴۸
نور محمد بھٹی ۲۷۷
نور علی شاہ معصومی ۱۶، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۴۵
(و)
وارث علی شاہ معصومی ۳۴۵، ۳۴۷
وریل شاہ کھابڑوٹی ۴۸
وزیر خان ۱۰۱
والہ داغستانی ۲۷۲
وقوعی قبریزی ۲۰۵، ۳۶۴
وقوعی نیشاپوری ۳۶۶
(ی)
یار محمد ترخان ۵۵
یادگار محمد کوتوال ۵۵
یادگار علی سلطان روملو ۱۶۳، ۱۸۳
یزد 215
یوسف ۲۵۰، ۲۷۲، ۲۷۳،
یولقی بیگ ۱۳۹، ۱۴۰

☆

اماکن

(آ)

آسیر ۱۴۲، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۴، ۲۳۲، ۳۱۱، ۴۴۳، ۱۷۴، ۴۴۸، ۴۶۸، ۴۷۰، ۴۷۱

آذربائیجان ۲۰۴

آگرہ ۸۰، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۹۷، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۷، ۲۳۹، ۲۴۳، ۳۱۱، ۳۳۱، ۳۵۶، ۳۶۷، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۸، ۴۶۰، ۴۷۲، ۴۷۹

(الف)

اٹک ۱۲۸، ۳۲۲، ۳۵۹، ۴۴۸

اجمیر ۳۵۵، ۴۴۸

اجین ۱۷۷، ۱۷۸، ۴۴۸، ۴۶۱، ۴۶۶

احمد آباد ۱۱۸، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۸، ۳۵۳، ۳۵۹، ۴۴۸

احمد نگر ۱۷۹، ۴۶۹

ارغنداب ۹، ۲۶، ۳۶، ۱۶۸

اصفہان ۲۰۴، ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۹۰، ۳۱۱، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۶، ۴۴۳، ۴۷۶، ۴۷۹، ۲۱۳

افغانستان ۲۴۶، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۴۹، ۴۴۴

الور (اروڑ) ۵۷، ۲۶۱، ۳۱۶، ۴۵۱

الٰہ آباد ۱۲۴

انٹرپور ۱۵۲

اوچ ۵۸، ۷۹، ۱۵۷، ۴۴۸

ایدر ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۰۲، ۴۴۸

ایران ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۹۰

ایران ۱۹، ۸۵، ۷۸، ۱۱۴، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۹، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۳۰، ۲۴۰، ۲۴۵، ۲۴۹، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۴۹، ۳۵۳، ۳۶۸، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۵، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۳

(ب)

باغبان ۲۹، ۵۹

ببرلو ۲۶۱، ۲۶۲

بخارا ۱۶۲، ۳۵۰

بدایوں ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۹

بدخشان ۱۶۲

بروجرد ۲۰۴

برہانپور ۶۵، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۷، ۴۴۳، ۴۴۸، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹

بڑودہ ۴۴۸

بساور (ضلع بدایوں) ۳۵۶، ۳۵۷

بغداد ۳۵۰

بکھر ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۷، ۴۵، ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۶، ۷۲، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۹، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۲، ۱۸۶، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۵، ۲۱۰، ۲۱۶، ۲۳۷، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۸۰، ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۱۷، ۳۲۷، ۳۳۱، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۳، ۴۴۲، ۴۴۵، ۴۴۸، ۴۸۱

بلخ ۵، ۱۶۲

بلوچستان ۱۹۹، ۲۱۵، ۲۱۶، ۳۴۹، ۴۷۷، ۴۷۸

بمبئی ۲۸۱، ۲۸۲

بمبھر ۳۵۷، ۳۵۸

بنگال ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۳۶، ۲۴۶، ۲۸۱، ۴۴۵، ۴۴۷

بہار ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۳۶، ۴۴۸

بہاولپور ۲۸۲

بھٹی بیانہ (بٹی کلہوڑاں) ۱۷۸، ۴۴۸، ۴۷۲

بیدر ۴۵۰

(پ)

پاٹ ۸۱، ۸۹

پٹیالہ ۳۵۶
پنجاب ۱۳۹، ۱۷۹، ۲۳۷، ۳۳۳، ۳۴۹
پنجوائی (نزد قندھار) ۲
پیرگوٹھ ۸۷، ۸۸

(ت)

تائباد ۴۷۵
تبریز ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۹۰
تتہ ۱۳۹، ۱۷۹، ۴۴۸
تربت احمد جام ۱۹۹، ۴۷۵
ترکستان ۲۱۰
ترکی (روم) ۱
ترمذ ۲۶
توران ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۴۹

(ٹ)

ٹانڈہ ۱۱۳
ٹلٹی ۵۷
ٹوڈہ (گاؤں) ۳۵۵
ٹھٹہ (تتہ) ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۴۵، ۴۶، ۵۶، ۵۷، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۱۱۷، ۱۳۹، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۷۳، ۲۳۷، ۲۶۳، ۳۱۰، ۳۲۹، ۳۳۵، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۶۴، ۴۴۸

(ج)

جودھپور ۴۴۸، ۴۵۸
جونپور ۴۴۸
جہلم پل ۳۲۲
جیپور ۴۷۳، ۴۸۲
جیسلمیر ۱۴۹، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۸۶، ۱۹۸، ۲۳۸، ۳۱۹، ۴۴۸، ۴۵۱، ۴۵۸

(چ)

چہارباغ بیرلوے ۷۹
چانڈکا (لاڑکانہ) ۱۳۵
چہل زینہ (نزد قندھار) ۳، ۴۴۴، ۴۴۵

(ح)

حاجی پور (پاٹنہ) ۱۱۱، ۱۱۲، ۴۴۸
حجاز مقدس ۷
حیدرآباد ۲۴۴
ہرات ۵، ۹، ۲۸، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۹، ۳۶۹، ۴۷۵، ۴۸۳
ہرمز ۱۸۳، ۴۴۷
ھمدان ۲۰۴

(خ)

خاش ۴۷۷
خراسان ۱، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۲، ۳۵، ۴۴، ۵۶، ۶۱، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۵، ۲۰۹، ۲۴۰، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۷۲، ۲۷۶، ۲۸۴، ۴۷۲
خیرپور (میرس) ۲۸۲

(د)

دادو ۲۹
دانیش (خاندیش) ۴، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۸، ۲۰۷، ۲۴۶، ۴۶۰، ۴۶۶، ۴۶۸، ۴۷۲
دربیلہ ۸۹، ۱۳۵، ۱۵۰، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۰، ۴۸۵
دکھن ۴، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۰، ۲۰۷، ۲۳۱، ۲۹۰، ۳۵۸، ۳۶۵، ۳۶۶، ۴۴۵، ۴۴۷، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۴، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۷۰، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۸۰
دمشق ۳۵۰
دولت آباد ۲۰۴
دہلی ۱۵۶، ۱۶۱، ۲۹۱، ۳۱۱، ۴۴۸
دھار ۱۷۷، ۴۶۴، ۴۶۵
دیپال پور (مالوہ) ۱۰۹

(ڈ)

ڈیرہ غازی خان ۳۳۲، ۴۸۲

(ر)

رنتھنبور ۳۵۵، ۴۴۸
ریگستان (نزد سمرقند) ۳۲۱، ۴۴۲

رے ۲۰۴
(ز)
زنجان ۲۰۴
زمین داود ۹، ۲۷
(س)
ساپان ۱۷۹
سادہ بیلا ۳۱۴، ۳۱۶، ۳۱۸
سارنگ پور ۴۴۸، ۴۶۶
سبزوار ۱، ۱۹۹
سپروان ۱۶۸، ۳۲۰
سجستان ۵
سراوان ۲۱۵، ۴۷۷، ۴۷۸
سرکیچ (نزد احمد آباد) ۱۲۲
سروہی ۱۲۱، ۴۴۸
سعدل پور ۱۷۷، ۴۶۵
سکھر ۱۶، ۳۴، ۶۲، ۱۵۵، ۲۱۶، ۲۴۵، ۲۵۷، ۲۸۹،
۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۶،
۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۳، ۳۳۶،
۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۴۸۴، ۴۸۵،
سکھر پرانا ۲۳، ۷۷، ۱۰۰، ۲۷۴، ۳۲۰، ۳۲۷،
۳۴۴، ۳۴۷، ۴۸۴
سلطانیہ ۲۰۴
سمرقند ۱۶۲، ۳۲۱، ۳۵۰
سنندج ۲۰۴
سندھ ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۴۴،
۴۵، ۴۶، ۴۷، ۵۲، ۵۳، ۵۷، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴،
۶۵، ۶۶، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۱۱۴،
۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸،
۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۵،
۱۵۸، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۸، ۱۹۹، ۲۰۶،
۲۱۶، ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۴۵، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۸،
۲۷۷، ۲۷۹، ۲۹۰، ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۲۱، ۳۲۹، ۳۳۳،
۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۴، ۳۶۳،
۳۶۴، ۳۷۴، ۴۴۳، ۴۸۴
سید پور ۳۳۶
سیور ۵۷، ۵۸،
سوہن ۳۲، ۳۵، ۳۶، ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۸۰، ۸۸،
۸۹، ۱۴۷، ۱۵۷، ۲۳۳، ۳۵۰، ۴۴۸
سیوی (سبی) ۲۸، ۲۹، ۳۷، ۱۱۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸،
۱۶۵، ۱۷۳، ۳۱۱، ۳۴۰، ۳۴۱
(ش)
شادی آباد (مانڈو) ۱۷۷، ۱۷۸،
شال (کوئٹہ) ۲۸، ۲۹، ۳۳۶
شکار پور ۳۲۲، ۳۴۵
شمس آباد ۴۴۸
شاہ کا گوٹھ (نئوں ڈیروں) ۴۷۴
(ص)
صفہ صفا (ستیوں کا آستانہ) ۳۱۶
(ع)
عجوان ۲۹۰
عراق ۲۴۰، ۲۵۰، ۴۷۲، ۴۷۳
عطاپور (نزد بدایوں) ۳۵۹
علی پوتہ (گوٹھ) ۴۵
عمر کوٹ ۸۱، ۳۶۳، ۴۴۸
(غ)
غزنی ۱۶۵، ۳۱۱
(ف)
فتحپور ۱۲۴، ۱۷۷، ۱۷۸، ۴۴۸، ۴۶۰، ۴۷۲
فراہ ۱۹۹، ۳۱۲
فرغانہ ۲۷، ۲۸
(ق)
قزوین ۱۸۳، ۲۰۴، ۳۶۹
قلعہ اختیار الدین ۲۸
قم ۲۰۴

قندھار ۱، ۲، ۳، ۷، ۹، ۱۰، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰،
۳۲، ۴۴، ۸۱، ۹۲، ۱۱۴، ۱۲۳، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۴،
۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۸۳، ۱۸۵،
۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۹، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۱۴،
۲۶۲، ۲۶۳، ۲۸۰، ۳۱۱، ۳۱۴، ۳۱۹، ۳۲۰، ۴۴۶،
۴۴۷، ۴۴۹، ۴۷۵، ۴۸۲، ۴۸۳

(ک)

کابل ۵، ۹، ۲۷، ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۱۱۱، ۱۶۳، ۱۶۴، ۲۰۶،
۲۳۰، ۲۷۴، ۲۹۰، ۴۴۵، ۴۴۷
کاشان ۷۸، ۱۸۳، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۱۲، ۲۴۹، ۲۶۷
کاکڑی ۱۳۵، ۲۵۷، ۲۵۹
کربلا معلیٰ ۳۶، ۴۴، ۲۰۵
کراچی ۴۸۴
کرمان ۲۱۵
کشمیر ۱۳۶، ۱۶۳، ۲۰۷، ۲۹۰، ۳۵۷، ۳۵۸، ۴۴۷،
کلکتہ ۳۸۱
کنڈیارو ۴۸۵
کنگری (پیر گوٹھ) ۸۷
کونج تنگیز ۲۱۱
کومک (ایرانی بلوچستان) ۲۱۶، ۴۷۸
کوئٹہ ۲۶۳، ۳۳۶
کیچ ۱۵۸

(گ)

گجرات ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲،
۱۰۳، ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵،
۱۲۷، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۵۶، ۱۶۳، ۱۷۴، ۲۰۶، ۲۴۶،
۲۵۹، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۸، ۲۸۰، ۳۲۲، ۳۴۱،
۳۵۲، ۳۵۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۷۶،
گرجستان ۲۱۰
گنجابہ ۱۵۷
گوالیار ۱۸۰، ۱۹۷، ۴۴۸، ۴۶۲
گوشت (ایرانی بلوچستان) ۲۱۵، ۴۷۷

(ل)

لالنگ ۱۷۶، ۱۷۹
لاہور ۷۹، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰،
۱۶۳، ۱۷۴، ۱۸۴، ۲۵۹، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳،
۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۸، ۳۶۴، ۳۶۶، ۴۴۸، ۴۶۸،
۴۶۹، ۴۷۰
لاہری بندر ۱۸۳، ۴۴۵، ۴۴۷
لنگر (نزد قندھار) ۱، ۴، ۷، ۸، ۵۸، ۱۶۸، ۱۹۹
مالوہ ۴۶۵
مالوگڑھ ۱۷۹
ماوراء النہر ۵، ۲۷، ۲۴۵، ۲۴۶، ۳۲۱،
مدھا کر (گوٹھ) ۱۷۸
مرادآباد ۳۲۹
مراغہ ۲۰۴
مستونگ ۳۳
مشہد و مقدس ۴، ۱۹۹، ۲۰۴، ۴۷۵
مکلی ۵۶، ۱۴۲
ملتان ۵۶، ۵۹، ۶۰، ۷۹، ۱۴۱، ۳۴۱، ۴۴۸
میانج ۲۰۴
میر پور ماتھیلہ ۹۹

(ن)

ناگور ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۷۸، ۲۷۲، ۶۴۳، ۴۶۴، ۴۸۰، ۴۸۴
نقجوان ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۸
نیشاپور ۱۹۹
نیل کنٹھ (مانڈا) ۴۶۵، ۴۶۶

(و)

وزیرآباد ۳۲۲

☆

PLAN OF MASOOM SHAH JO MINARO AT SUKKUR

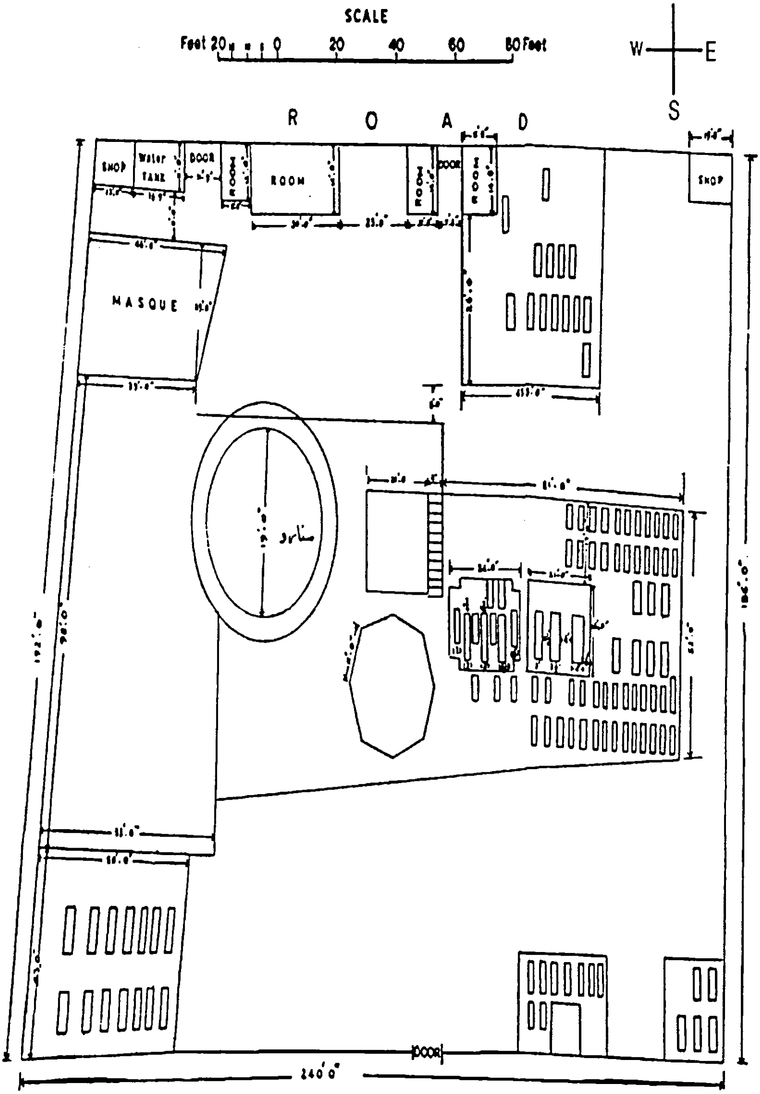

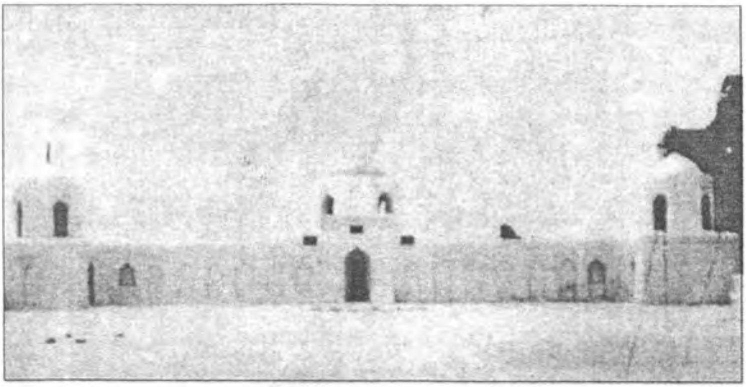

روہڑی کی ایک پہاڑی پر میر معصوم شاہ کی تعمیر کردہ عید گاہ

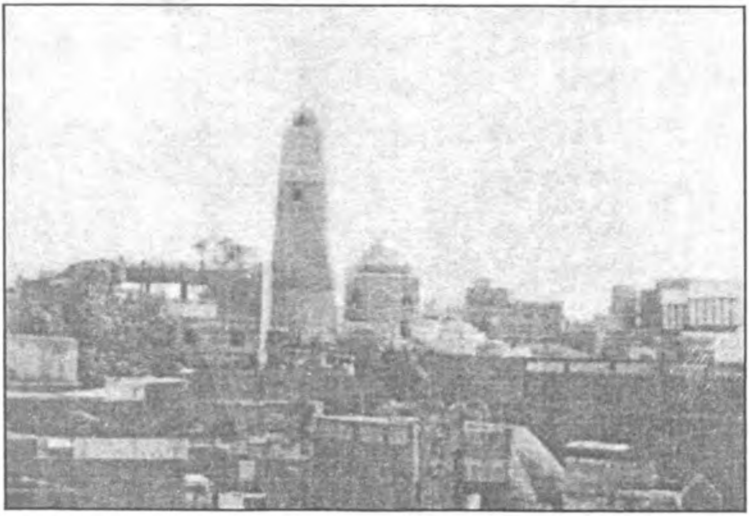

شہر کے بیچ میر معصوم شاہ کے مینار کا خوبصورت منظر

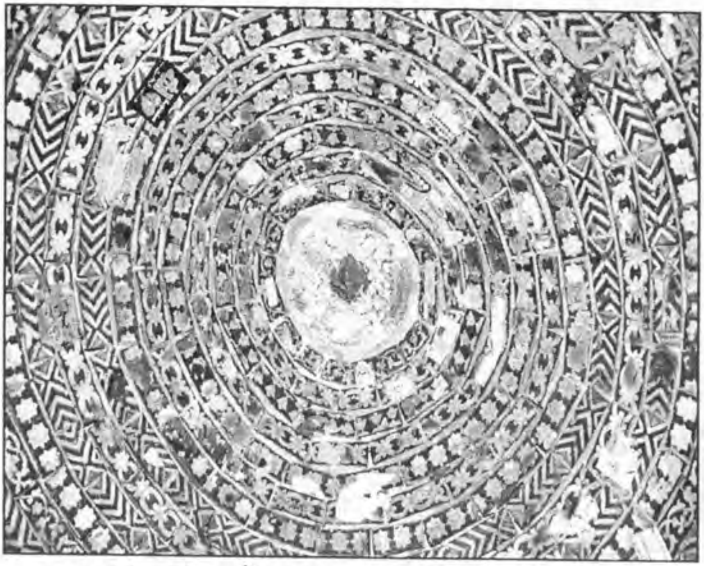

میر معصوم کے مینار کی چھت کی گُل کاری کا نمونہ

گنبد کا بالائی حصہ

(١١٩) جيپور نرانه کلان، کتبه نمبر ۵۳

(۱۱۷) خانقاه حمیدالدین ناگوری، کتبہ نمبر ۴۹

(۱۱۸) خانقاه بابا اسحاق مغربی (ناگور) کتبہ نمبر ۵۰

(۱۱۵) خانقاہ حمیدالدین ناگوری، کتبہ نمبر ۴۲

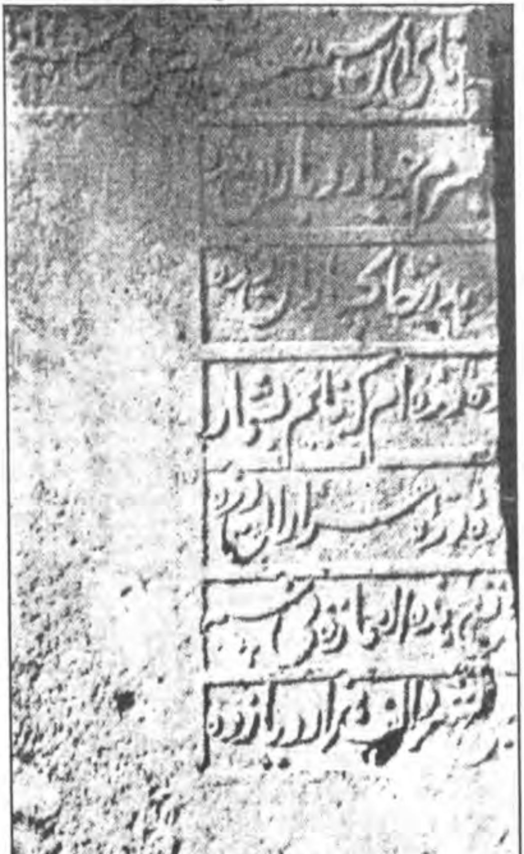

(۱۱۶) شاہ جو گوٹھ کتبہ نمبر ۴۴

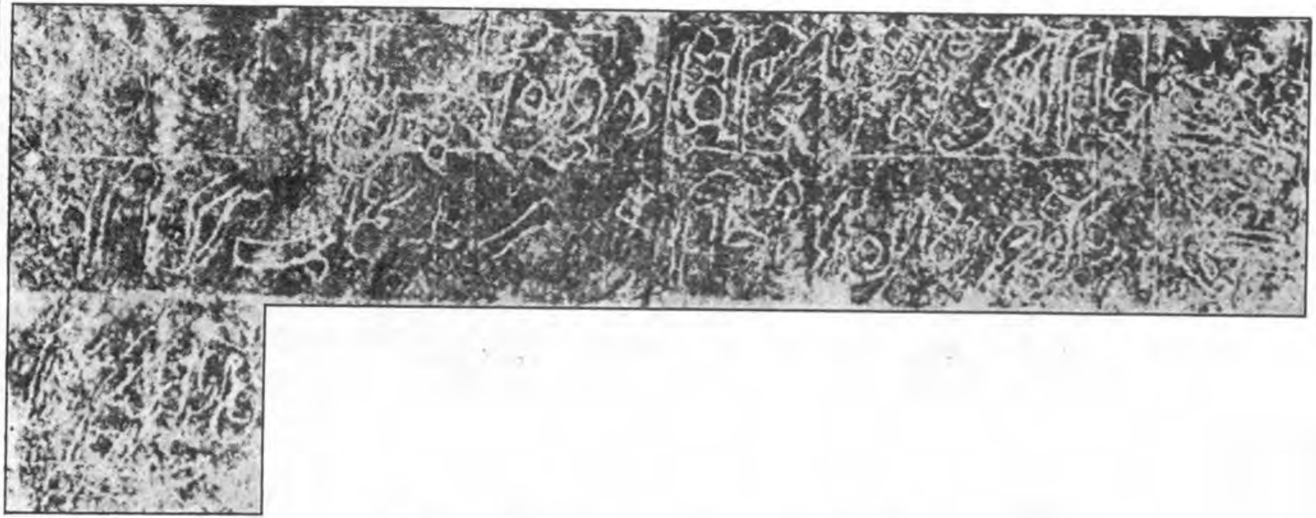

(۱۱۴) جیپور میوزیم (نرانه تالاب) کتبه نمبر ۴۱

(۱۱۳) قلعه اسیر داخلی دروازه، کتبه نمبر ۳۷ ب

(۱۱۲) قلعه اسیر داخلی دروازه، کتبه نمبر ۳۷ الف

(۱۱) مقبره عادل شاه، برہان پور کتبه نمبر ۳۶ (حصه ۳)

(۱۰۹) مقبره عادل شاه برہان پور، کتبه نمبر ۳۶ (حصه ۱)

(۱۱۰) مقبره عادل شاه، برہان پور کتبه نمبر ۳۶ (حصه ۲)

(۱۰۸) جامع مسجد برہان پور، کتبہ نمبر ۳۵

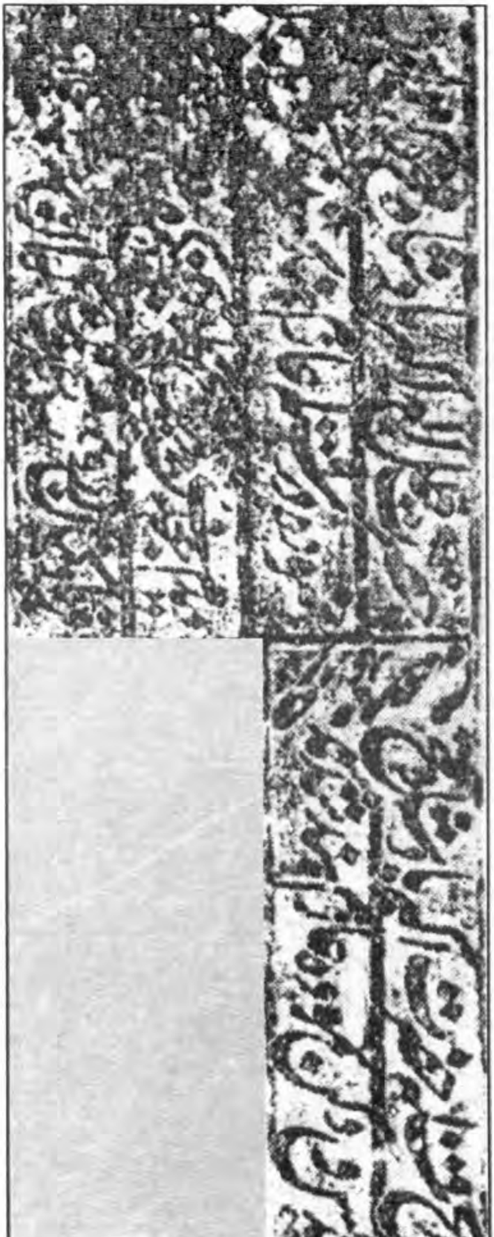

(۱۰۷) مانڈو- نیل کنٹھ، کتبہ نمبر ۳۴

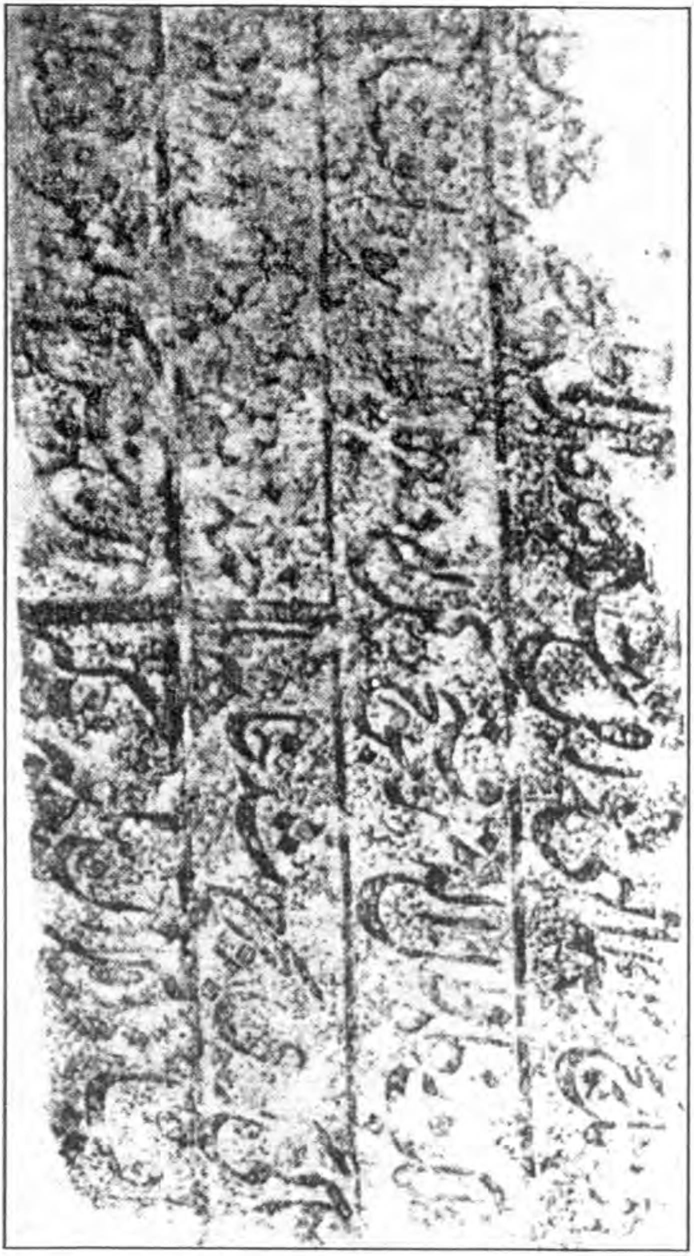

(١٠٦) مانڊو- نيل ڪنٺه، ڪتبو نمبر ٣٣

(۱۰۵) سعدل پور، کتبه نمبر ۳۱

(۱۰۴) ناگور، کتبه نمبر ۲۸

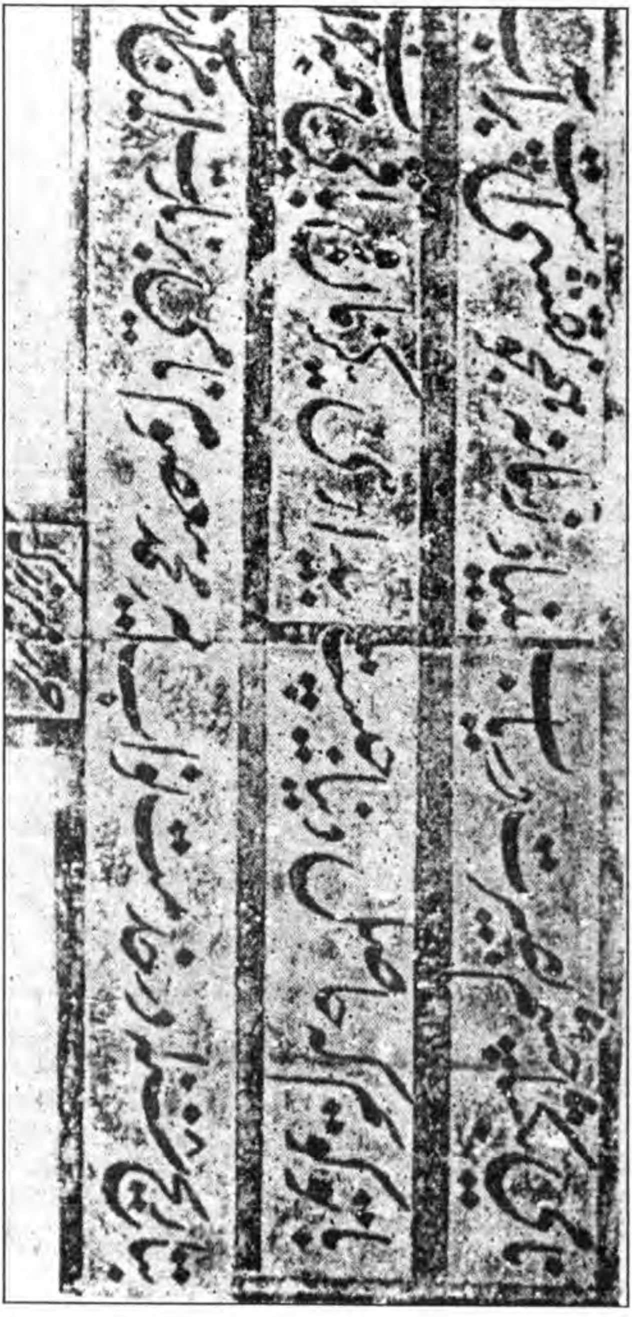

(۱۰۳) خانقاه حمیدالدین ناگوری، کتبه نمبر ۲۷

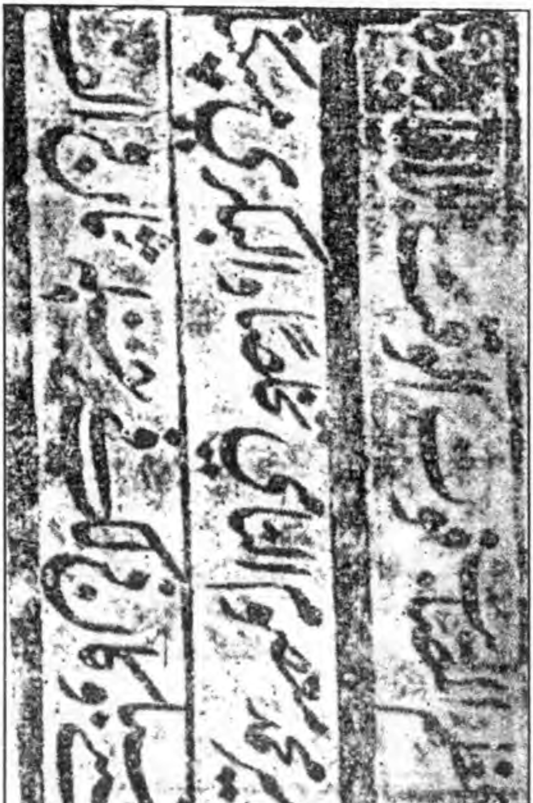

(۱۰۲) خانقاہ حمیدالدین ناگوری، کتبہ نمبر ۲۶

(۱۰۱) در گاه محمد غوث گوالیار، کتبہ نمبر ۲۵

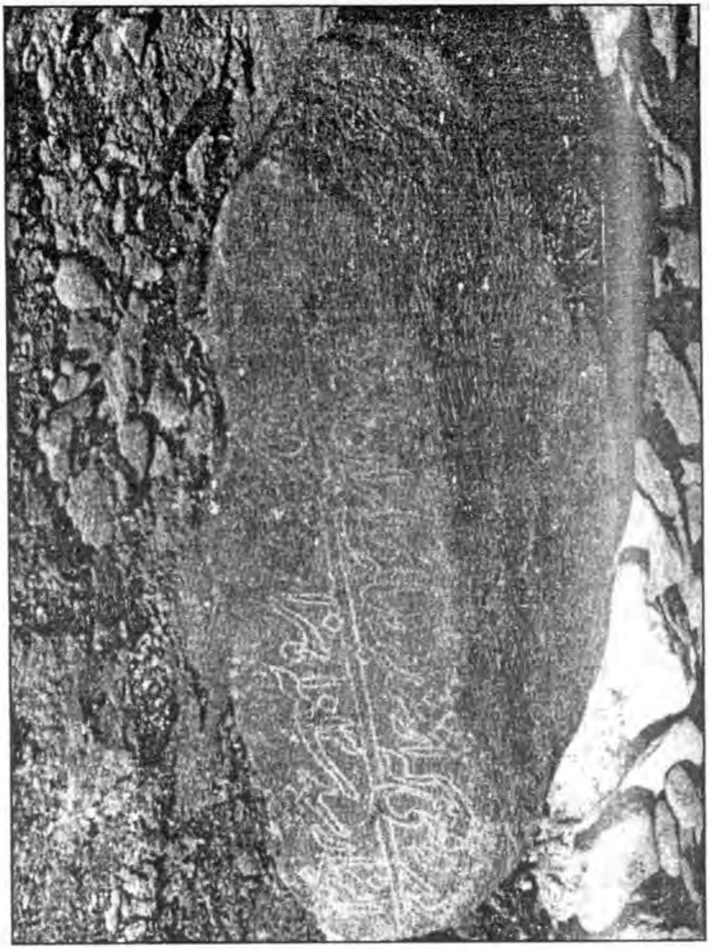

(۱۰۰) گونشت والا کتبه

(۹۹) گوشت (ایران) کا کتبہ

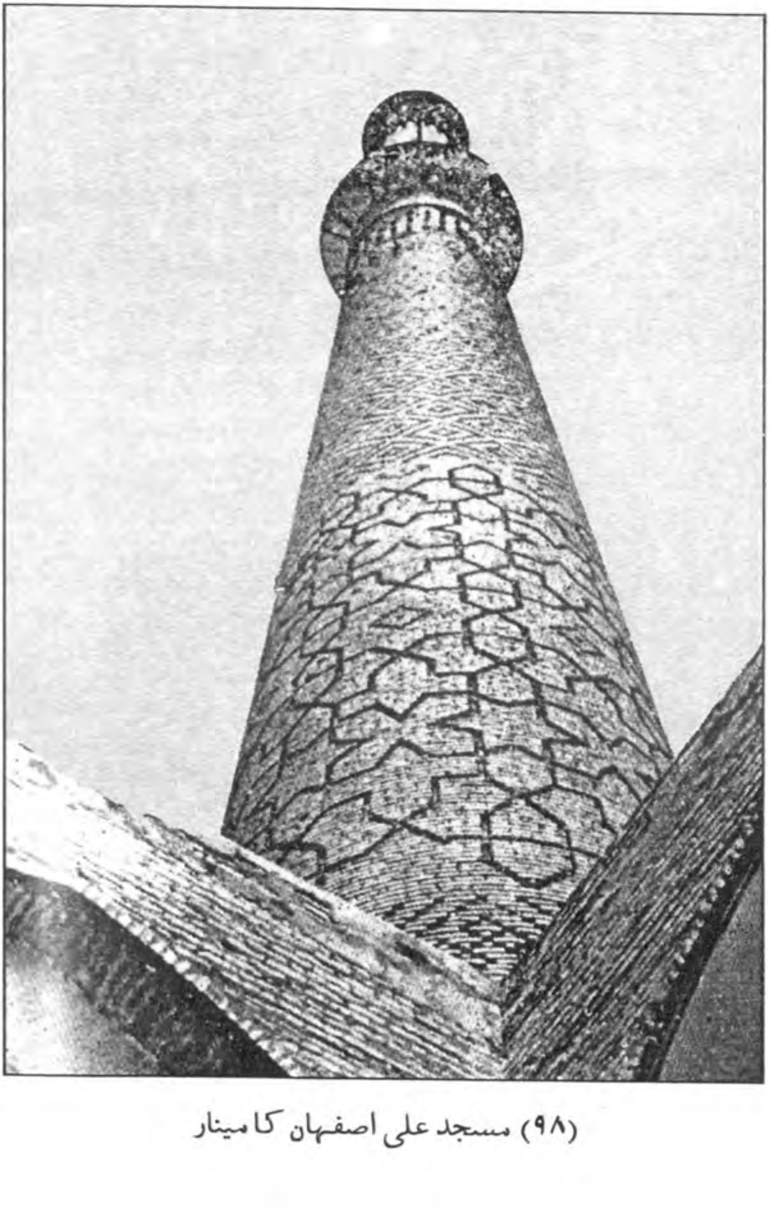

(۹۸) مسجد علی اصفہان کا مینار

(٩٧) مسجد علی اصفہان والا کتبہ

(۹۶) حضرت احمد جام کا کتبہ

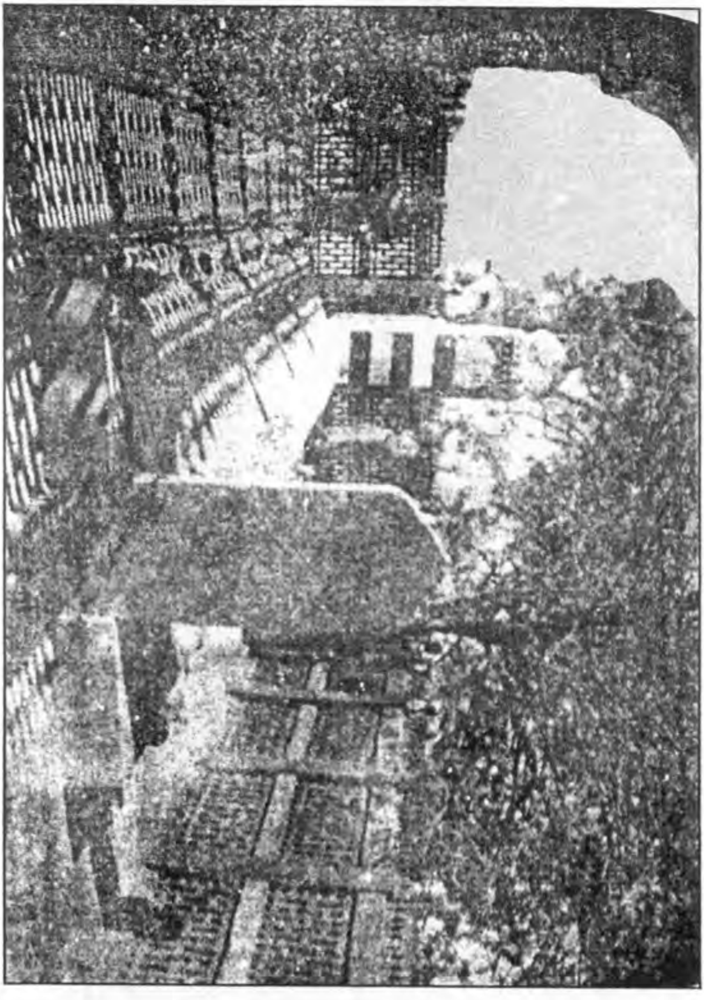

(۹۵) بابا حسن ابدال کا مزار

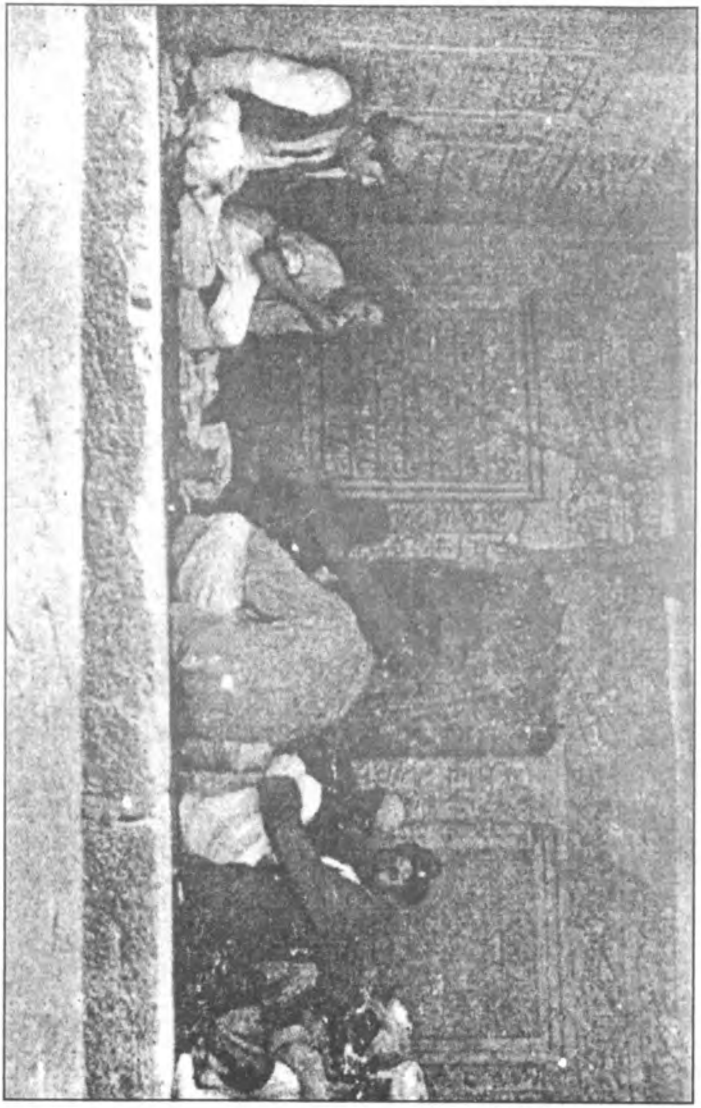

(۹۳) چہل زینہ کی نشست گاہ کتبے والی

(۹۳) چهل زینه کا کتبه

(۹۲) چهل زينه کا کتبه

(٩١) چهل زينه کا کتبه

(۹۰) چہل زینہ کا کتبہ

(٨٩) چهل زينه کا کتبه

(٨٨) چهل زينه کا کتبه

(۸۷) چہل زینہ کا کتبہ

(٨٢) چہل زینہ کا کتبہ

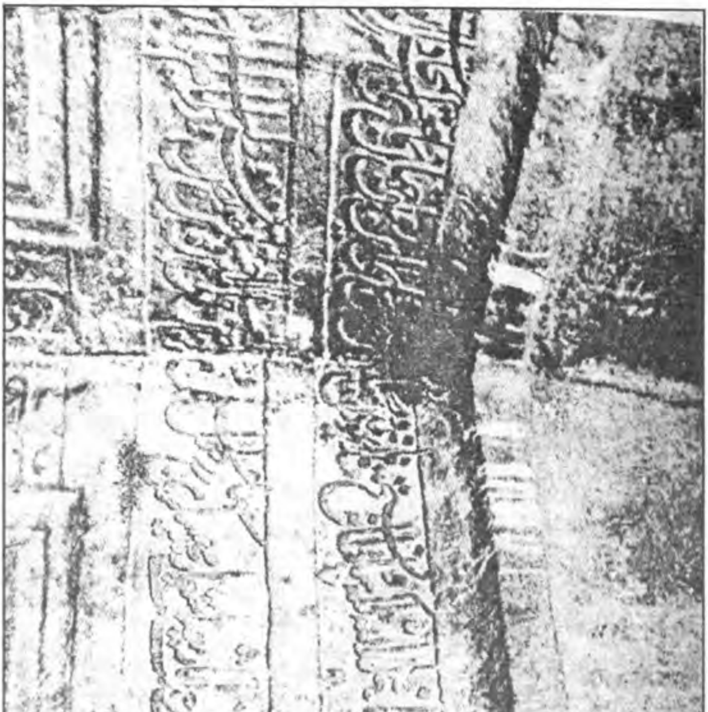

(۸۵) چہل زینہ کا کتبہ

(۸۳) کتبہ چہل زینہ

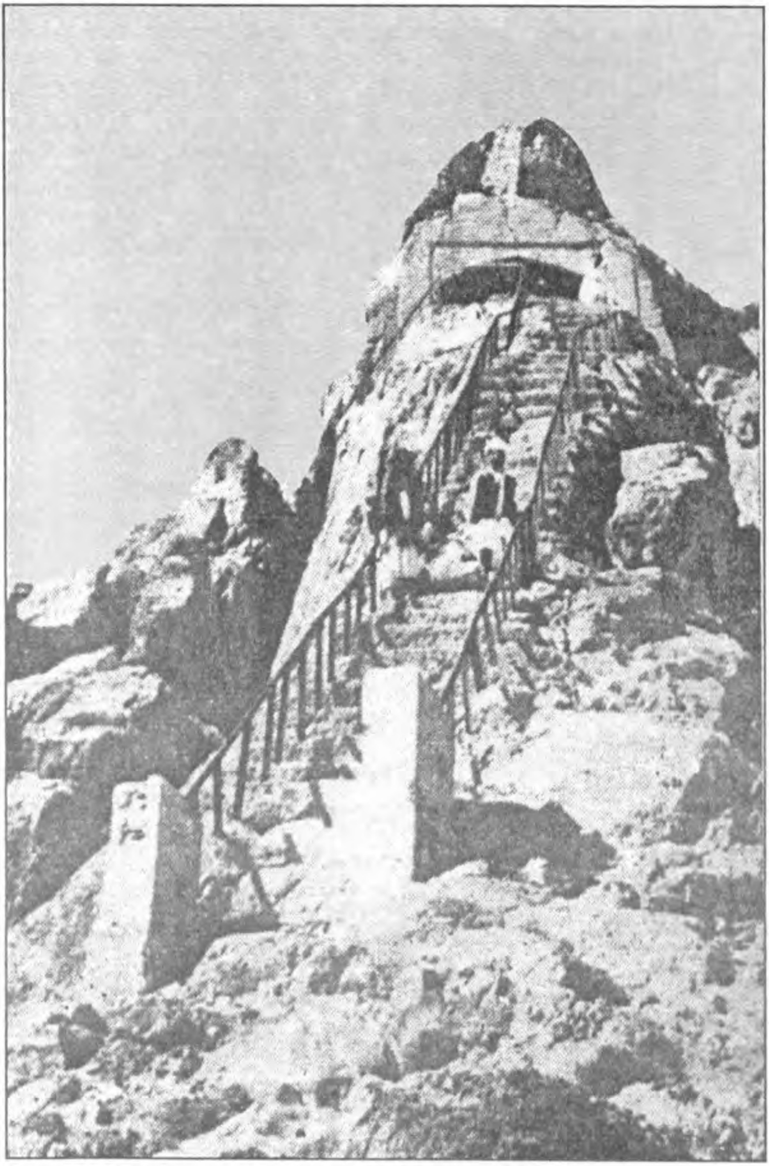

(۸۳) چہل زینہ کی سیڑھی

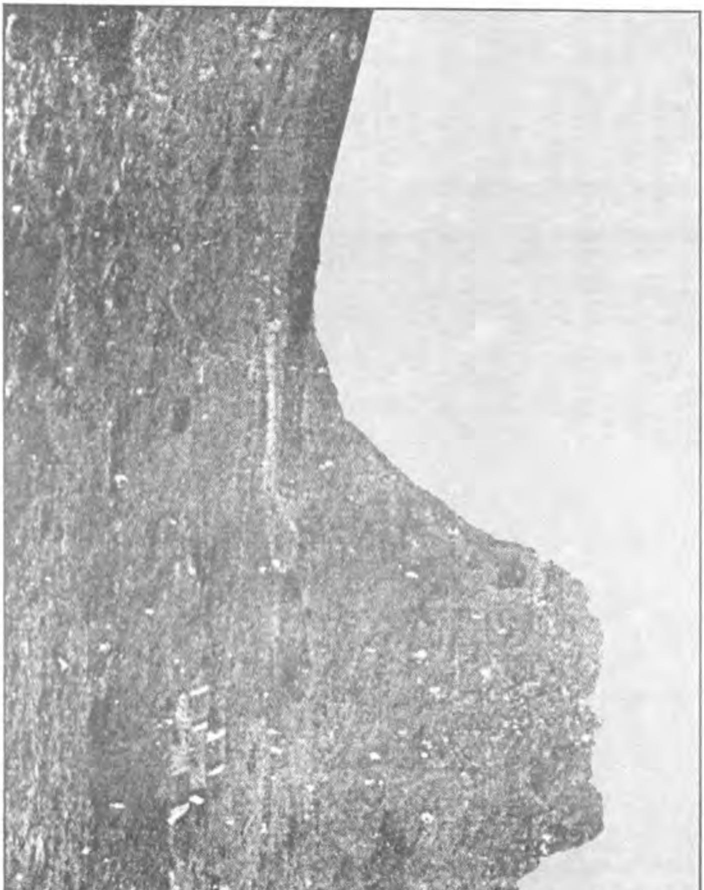

(۸۴) چهل زينه والي پهاڙي

(۸۱) میرزا کریا کا مزار پرانے سکھر کے قبرستان میں

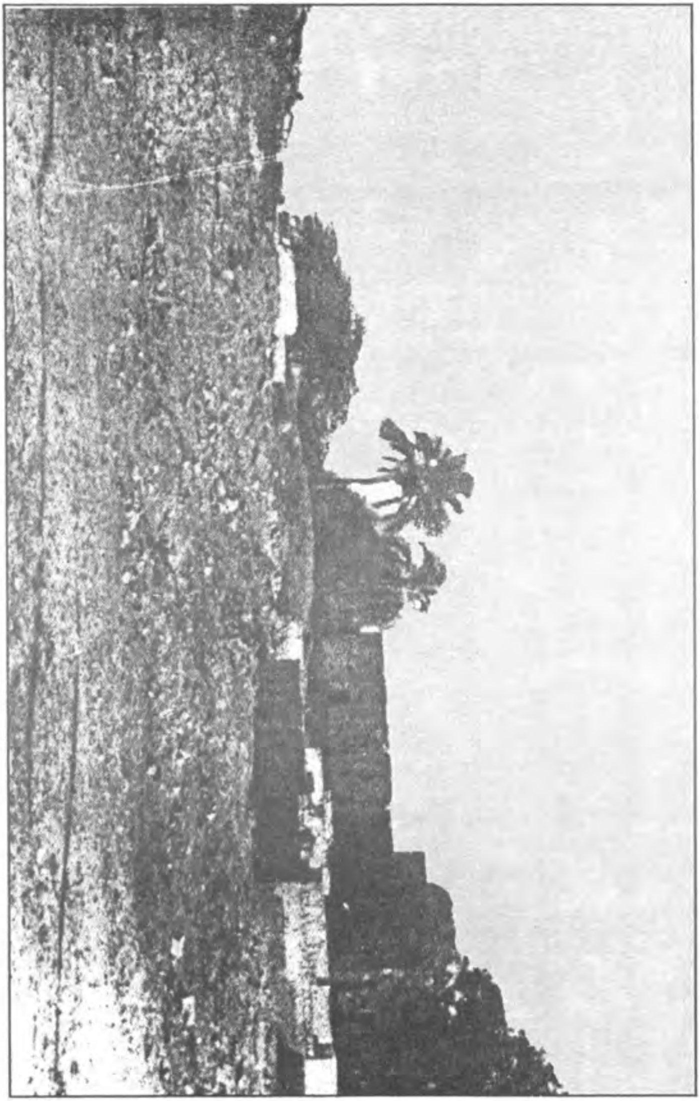

(۸۰) پرانے سکھر کا قبرستان

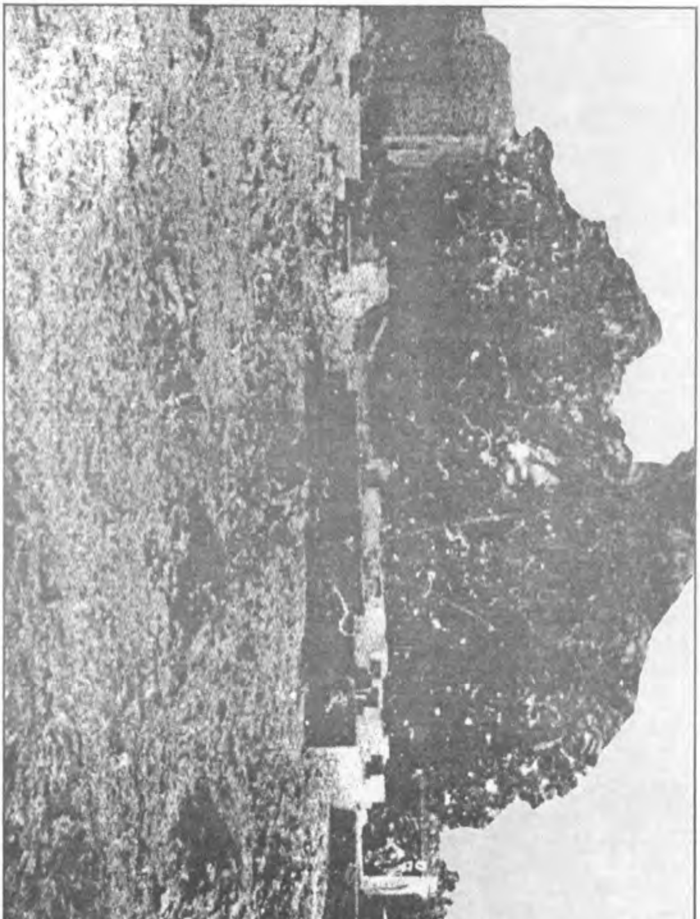

(۷۹) پرانے سکھر کا قبرستان

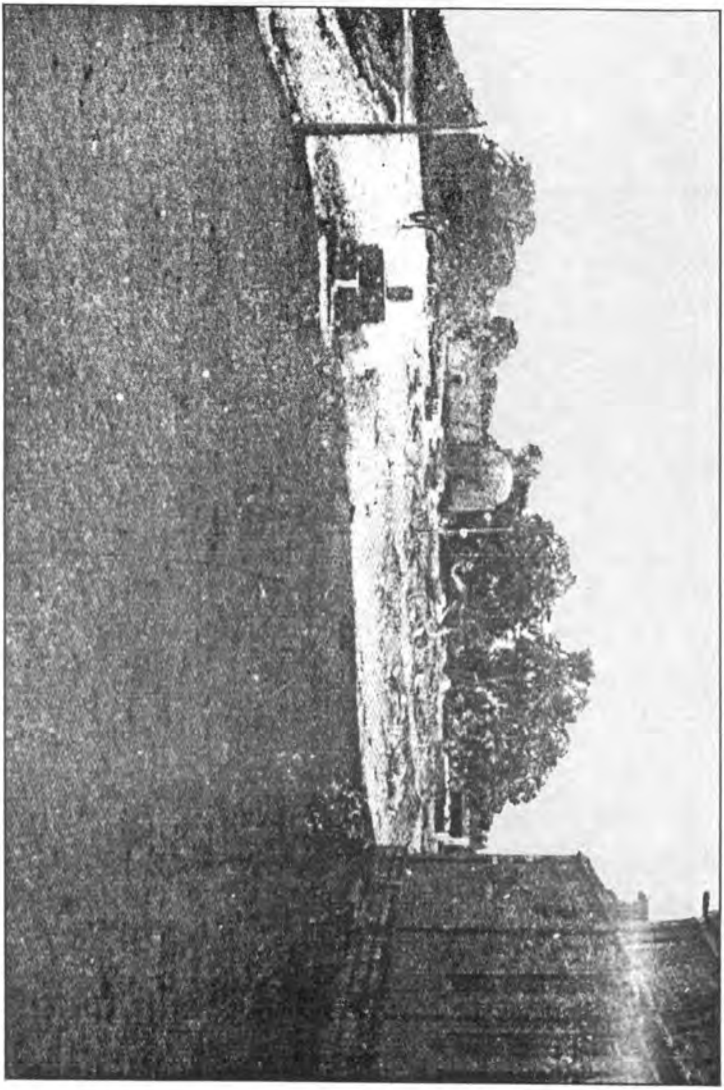

(۷۸) پرانے سکھر کا قبرستان

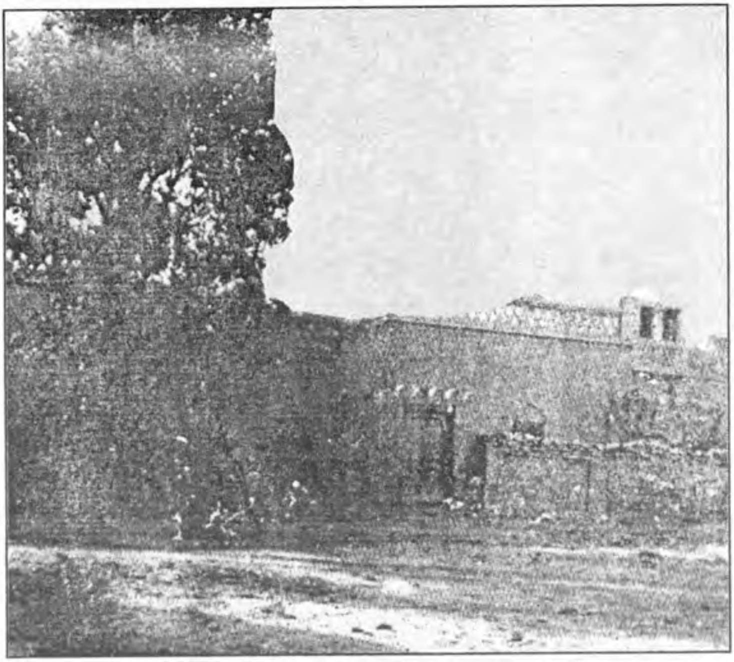

(٧٦) میر صفائی کی مسجد پرانہ سکھر

(٧٧) پرانے سکھر کا قبرستان

(۷۵) اروڑ والا کتبہ

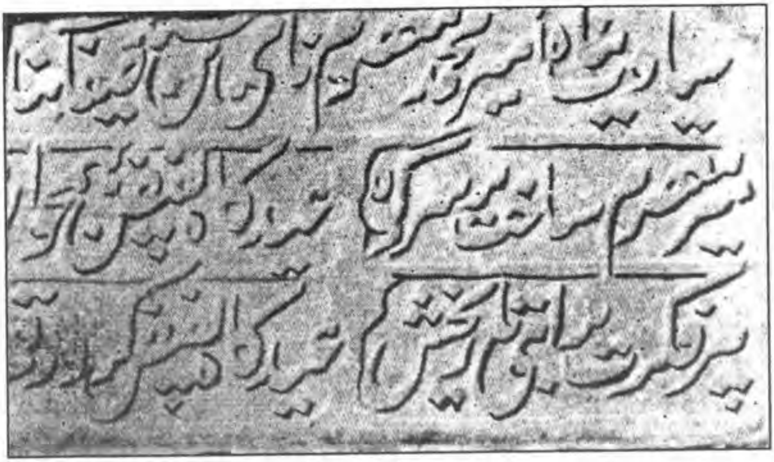

(۷۳) عید گاہ کا کتبہ

(۷۴) اروڑ والا پیل کتبہ

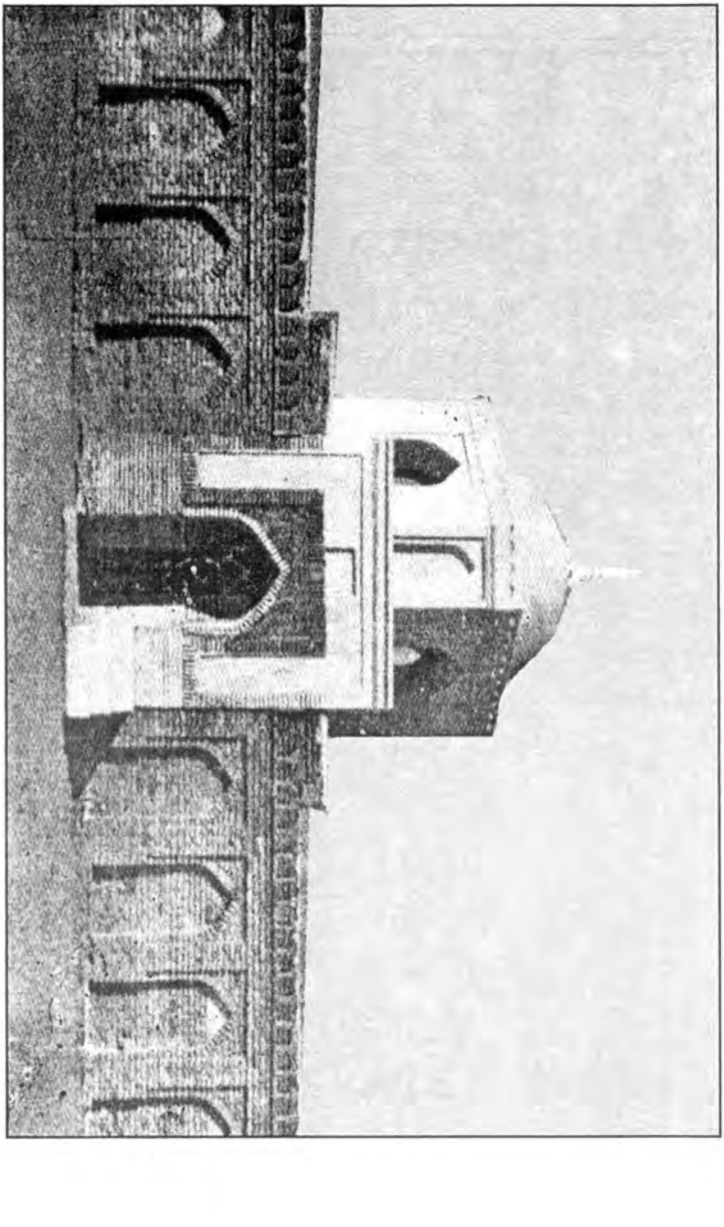

(۴۲) عیدگاہ کا محراب۔ روہڑی

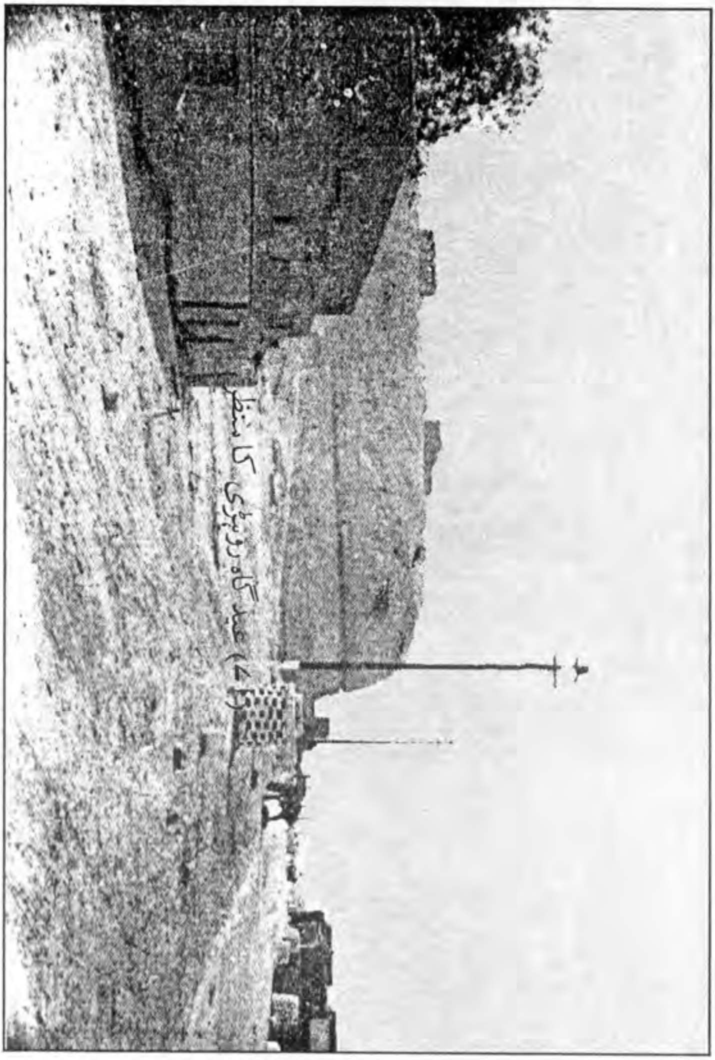

(۱۷) عید گاہ روہڑی کا منظر

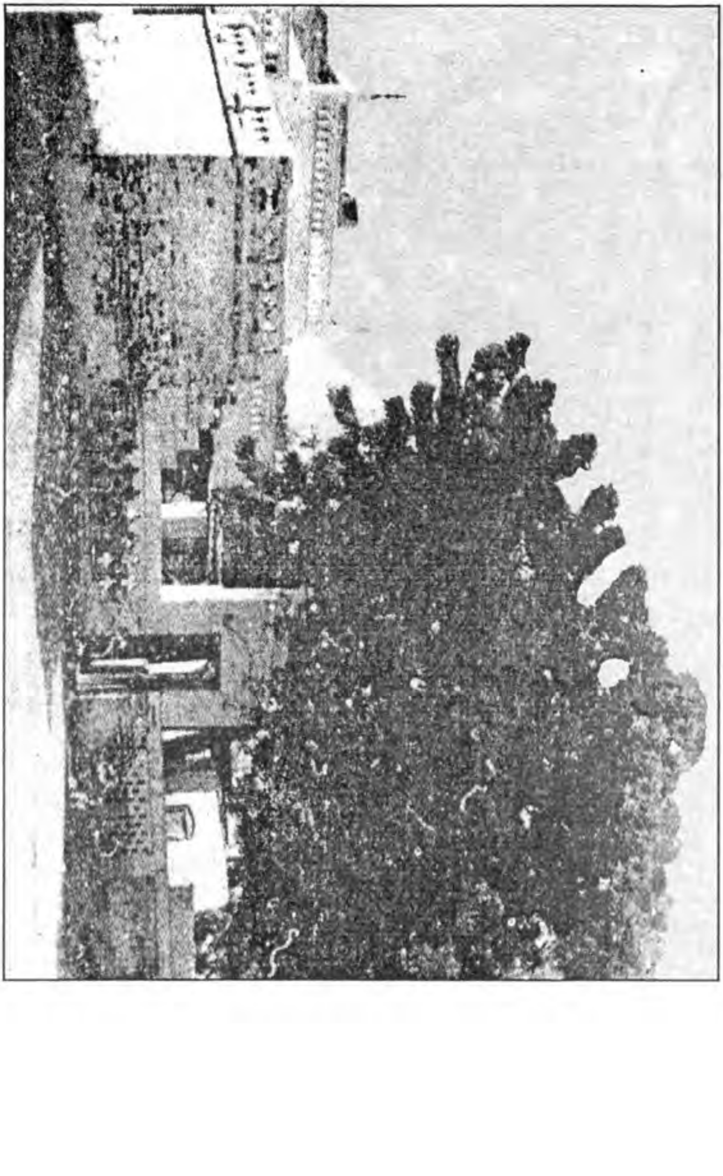

(۷٠) مسجد سید صفائی هفت چاه سکهر

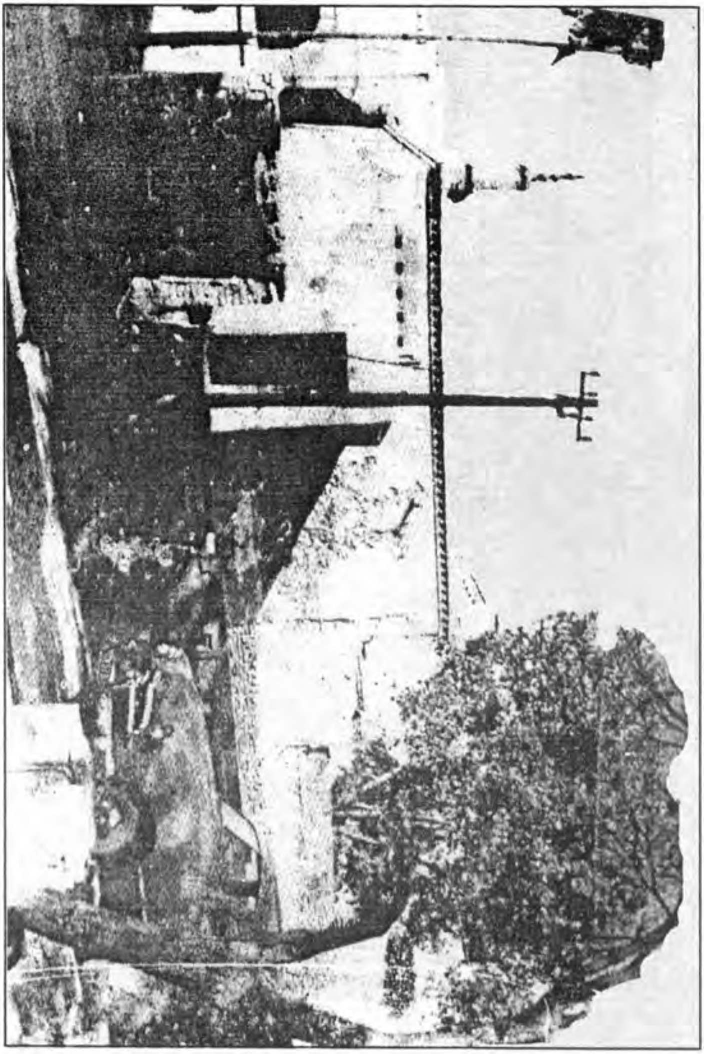

(٦٩) ہفت چاہ- سکھر

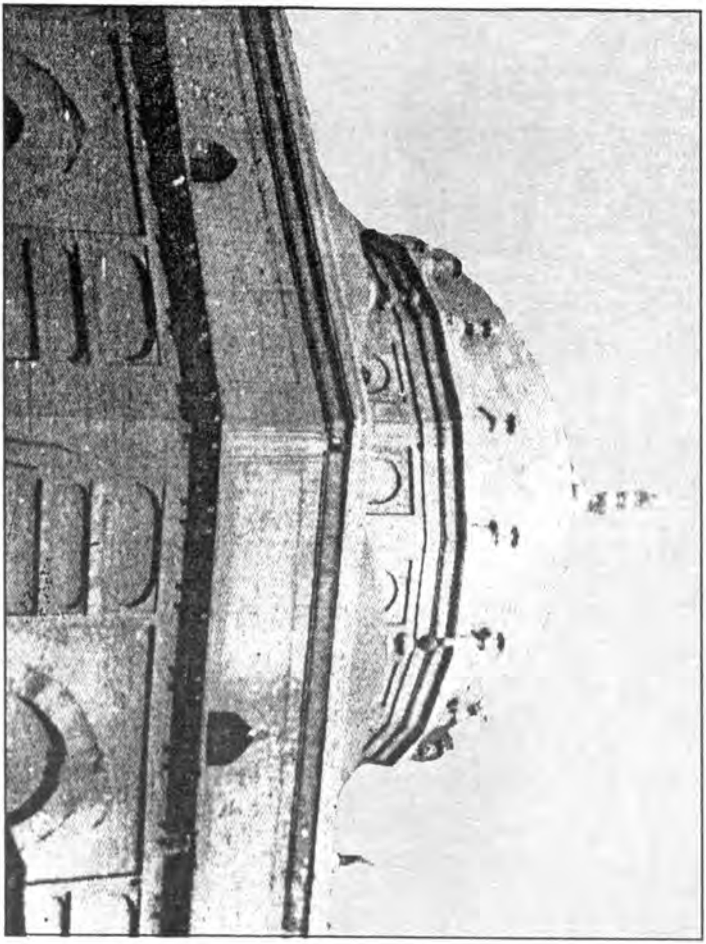

(٦٨) پشت پہلو عمارت- سکھر

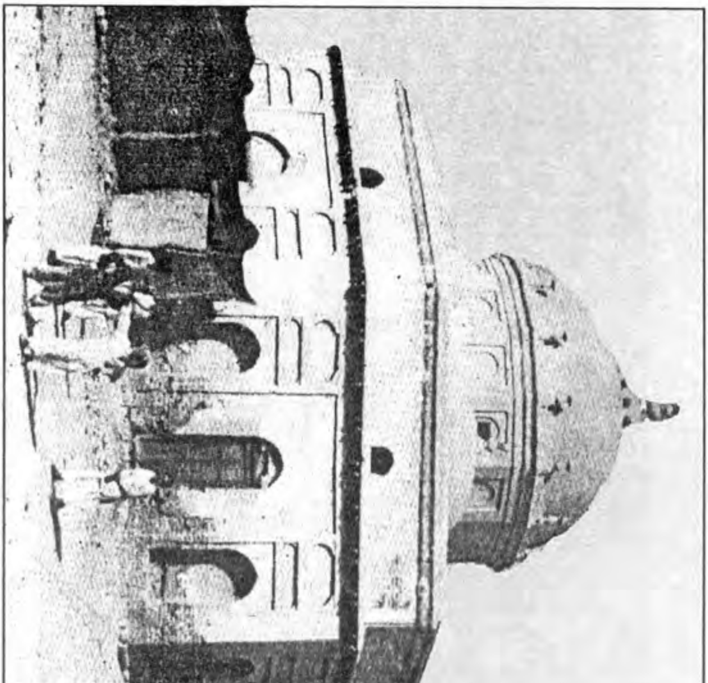

(١٤) پشت پہلو عمارت۔ سکھر

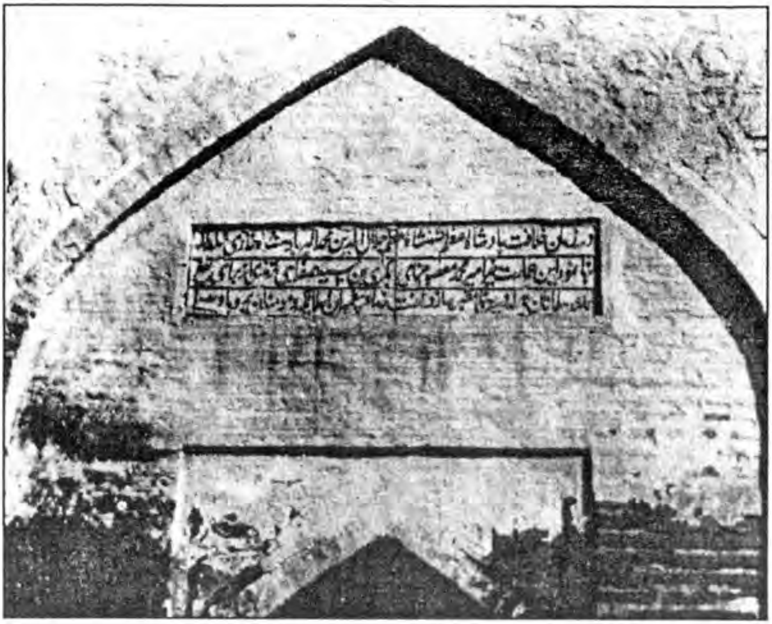

(۶۴) منزل گاہ کی عمارت کا کتبہ

(۶۵) منزل گاہ کی عمارت کا کتبہ

(۶۶) منزل گاہ کی عمارت کا کتبہ

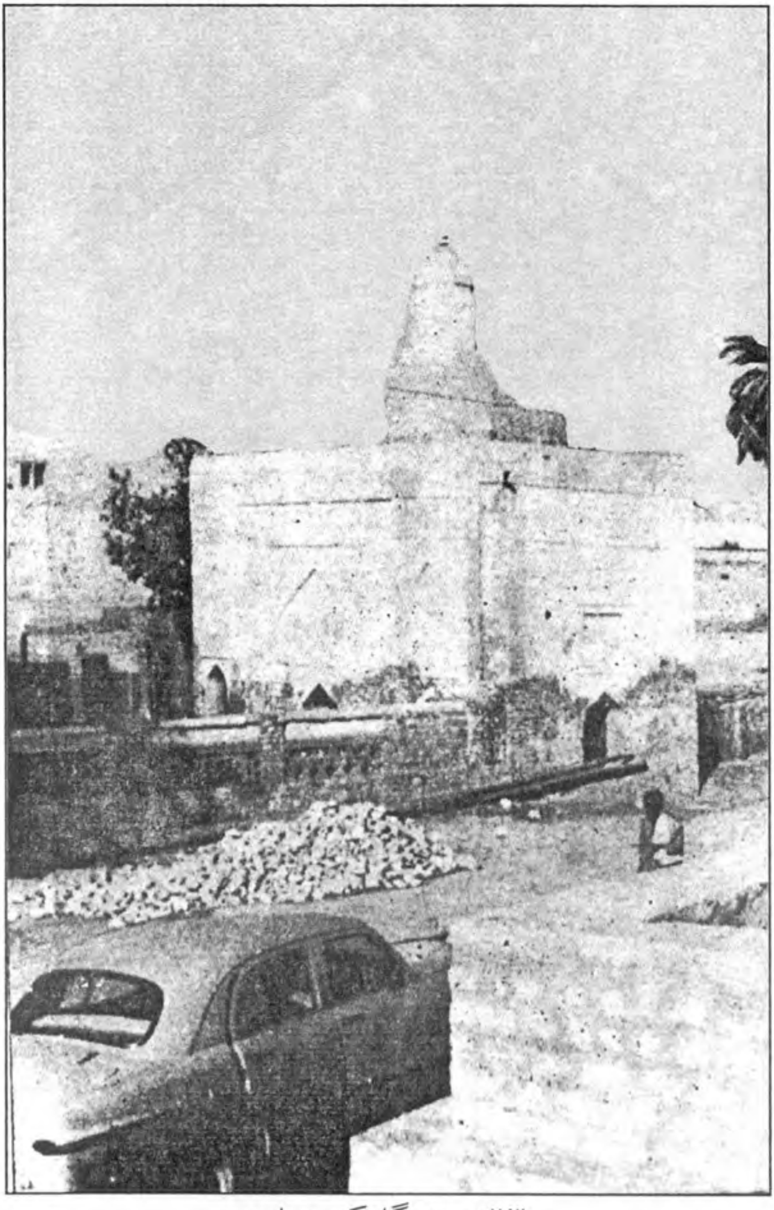

(۶۳) منزل گاه کی عمارت

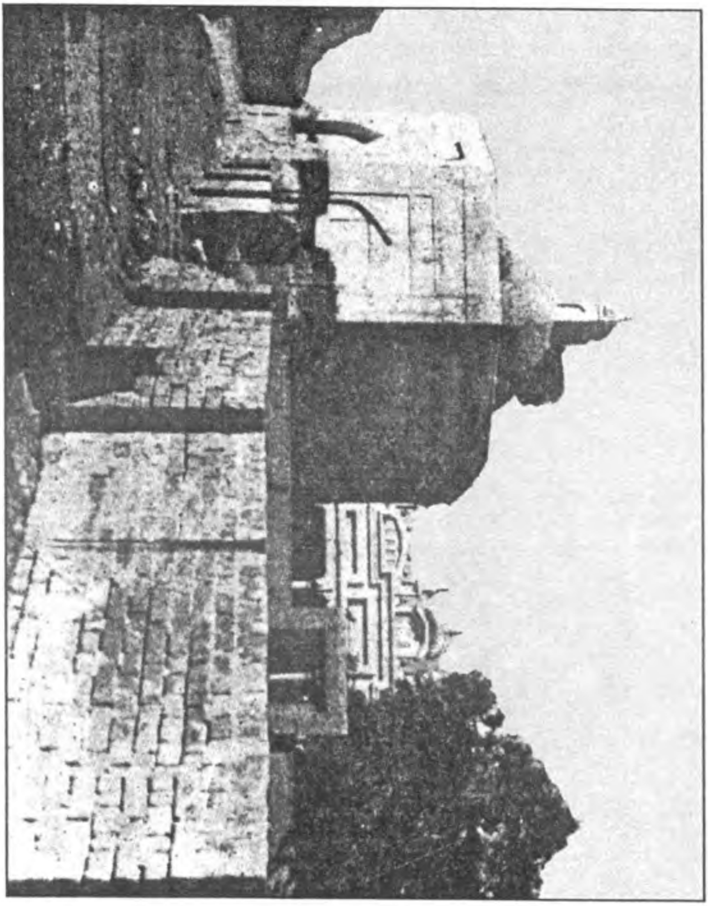

(۶۲) منزل گاه کی عمارت

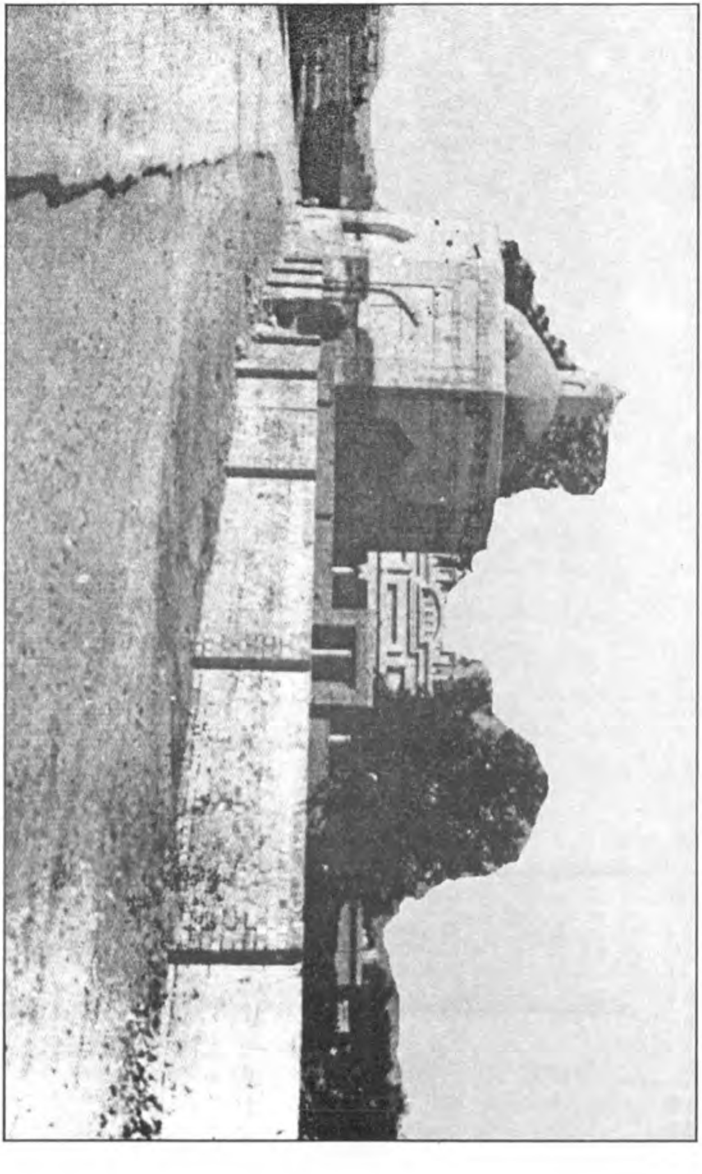

(۲۱) منزل گاہ کی عمارت

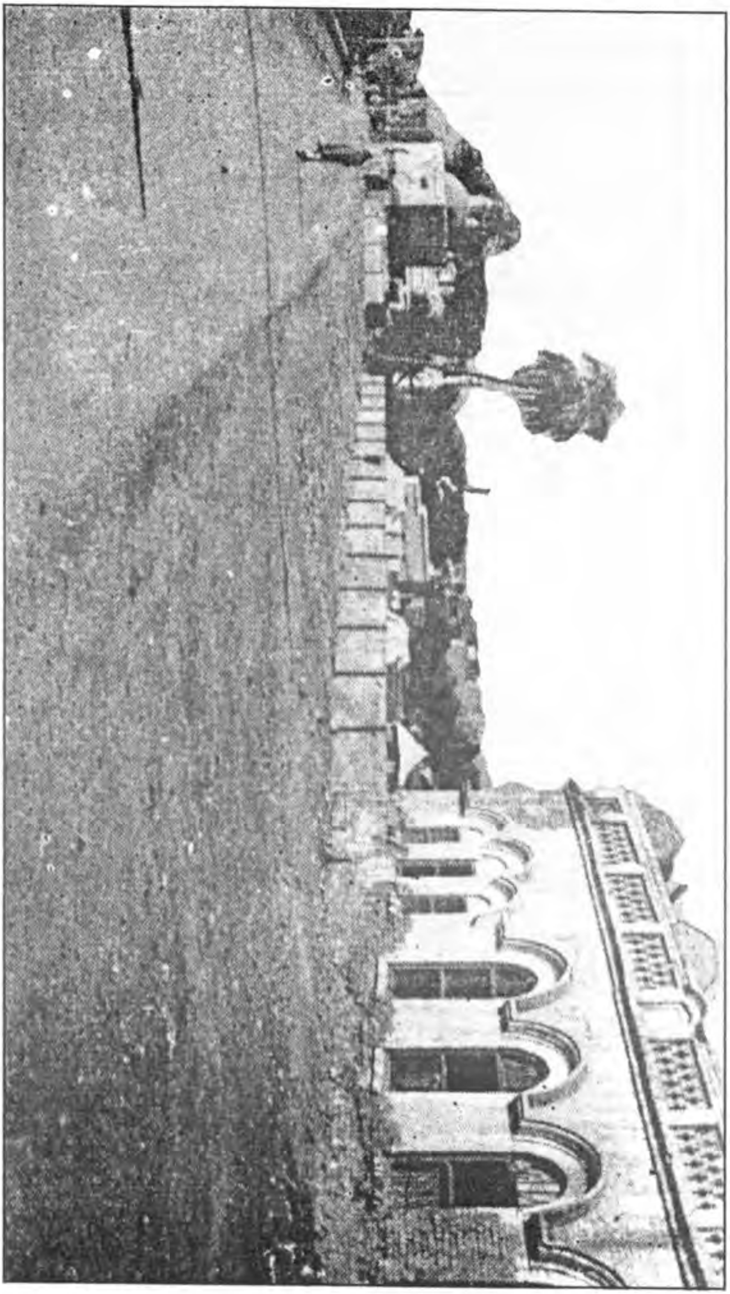

(٦٠) منزل گاہ کی عمارات

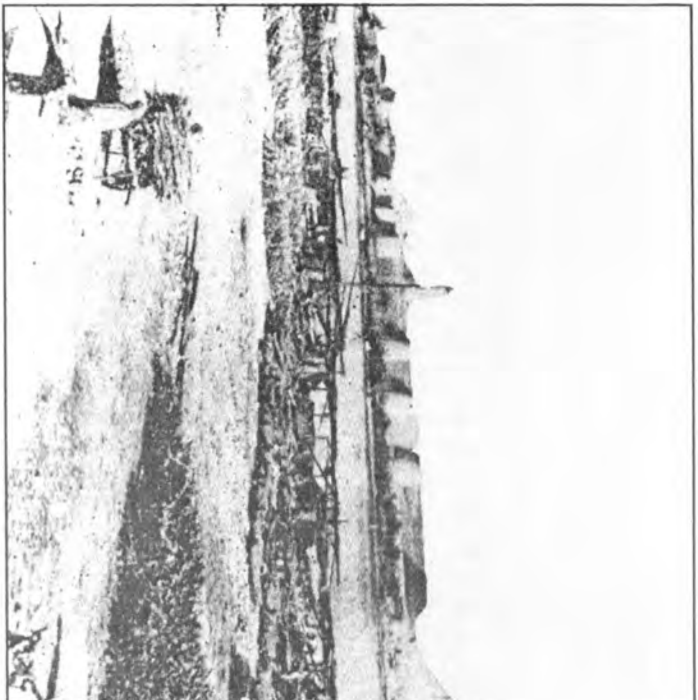

(۵۹) بکھر کے قلعہ کا منظر منزل گاہ سے

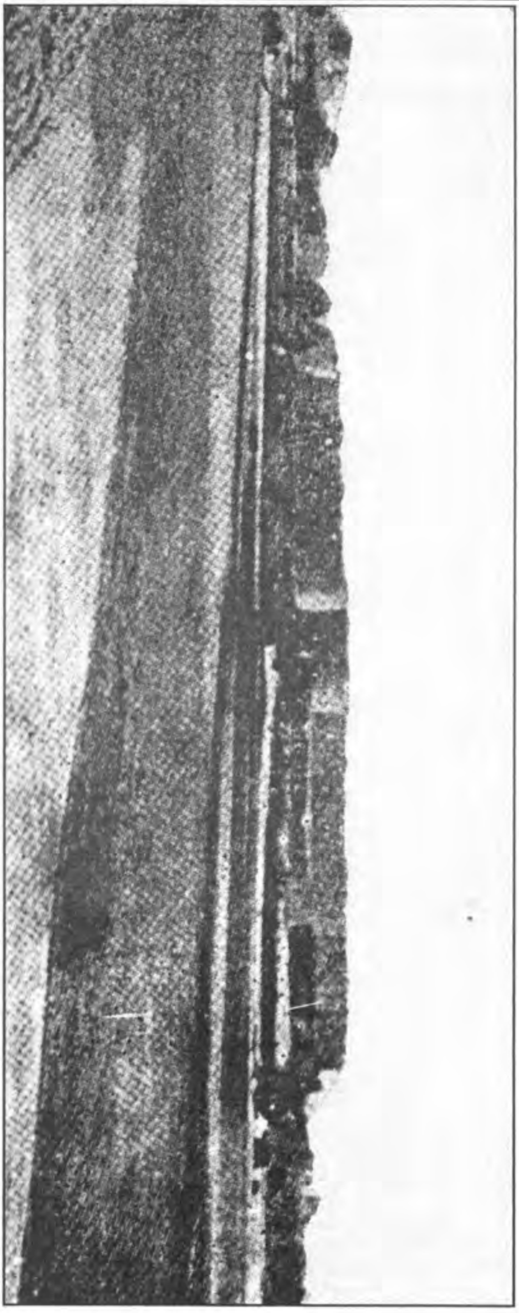

(۵۸) بکھر کا قلعہ ۱۷۰ برس قبل

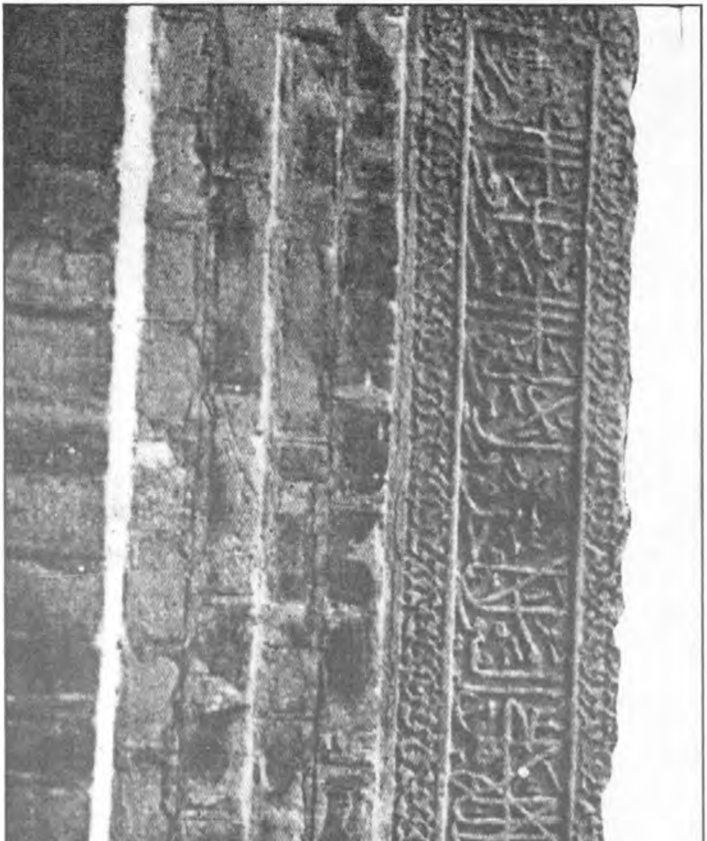

(۵۸) قبر پر آیة الکرسی کی کندہ کاری

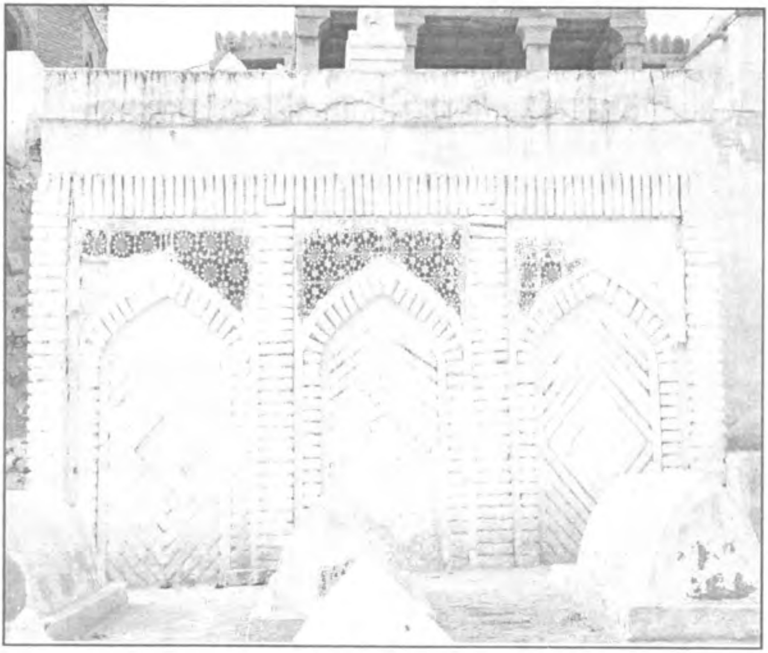

(۵۶) قبروں کے چبوتروں کی ساخت

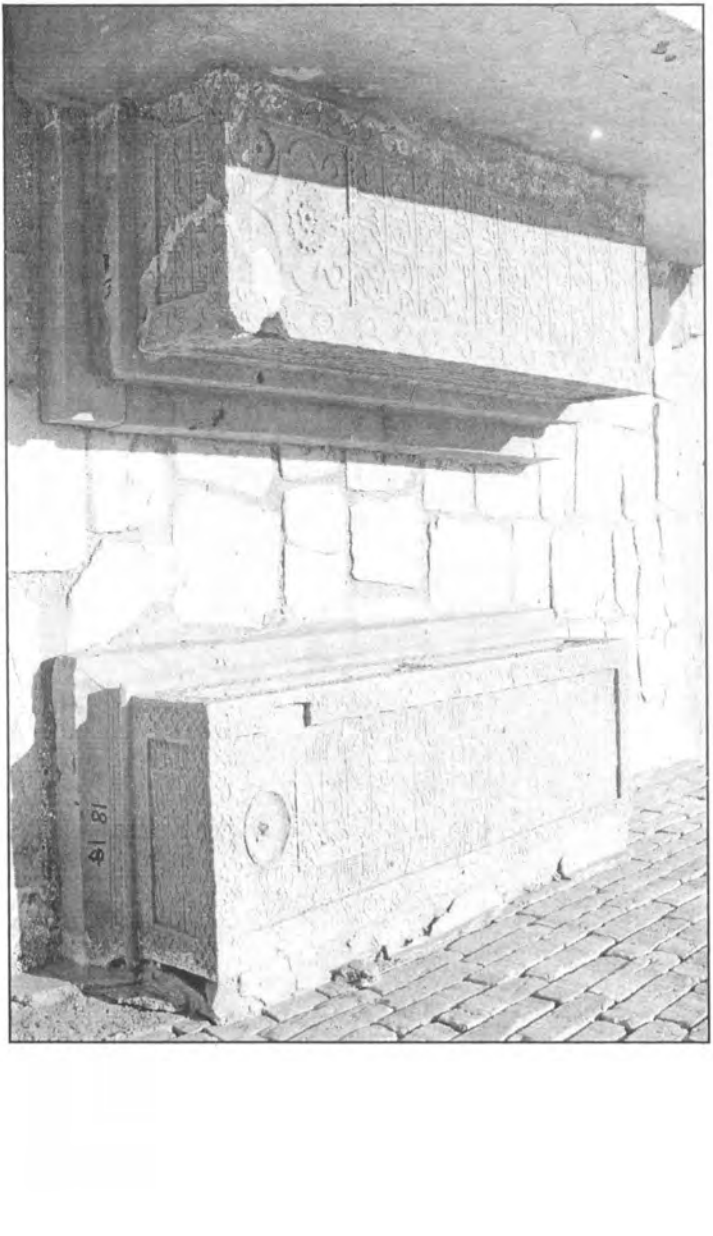

(۵۵) پتھر سے بنی ہوئی قبریں

(۵۴) چونرے والی چھتری کا کتبہ

(۵۳) جونے کی بنی ہوئی چھتری پر کاشی کا کتبہ

(۵۲) میر معصوم کے مزار پر تاریخی کتبہ

(۵۱) میر معصوم کے مزار کی پائنتی کا تاریخی کتبہ

(۵۰) میر معصوم کا مزار

(۴۸) میر معصوم کا مزار

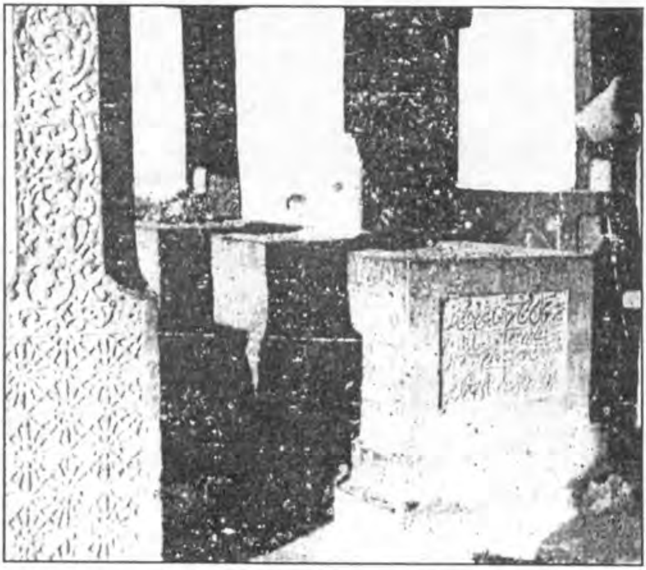

(۴۹) میر معصوم کا مزار

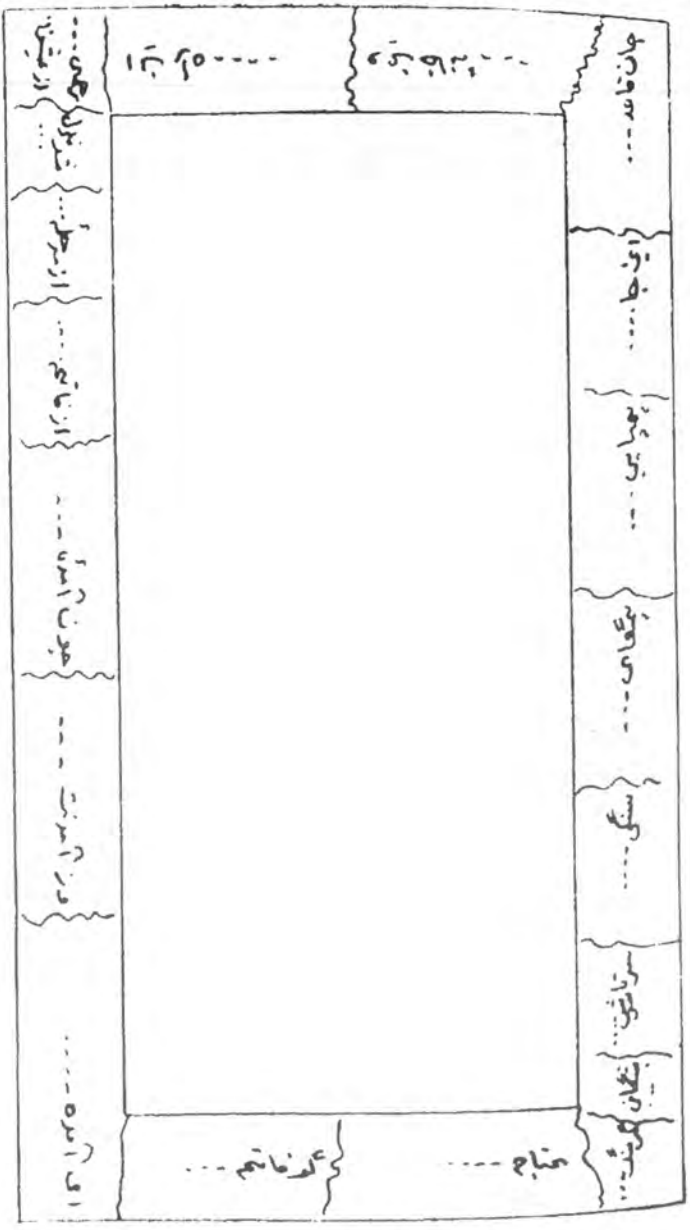

(۴۷) میر صفائی کی قبر کے نچلے حصے والے کنارے

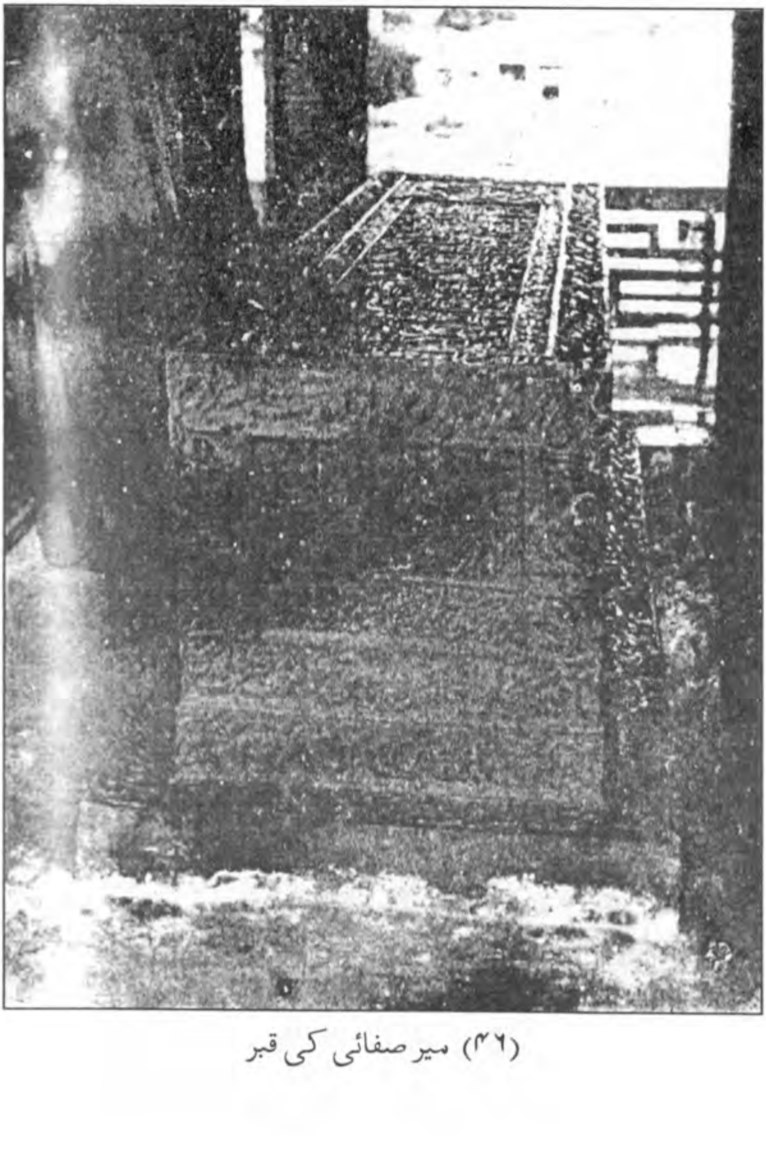

(۴۶) میر صفائی کی قبر

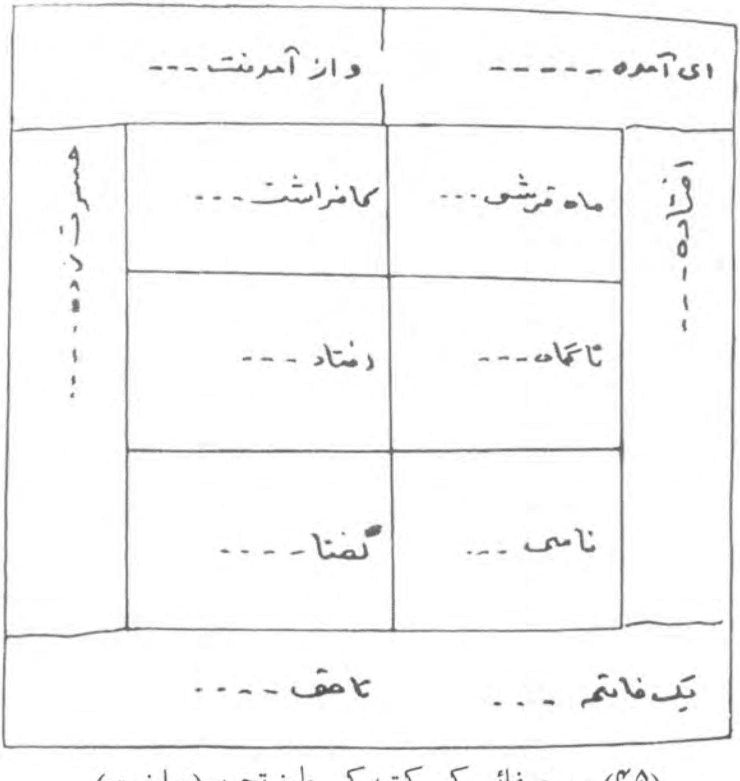

(۴۵) میر صفائی کے کتبہ کی طرز تحریر (ساخت)

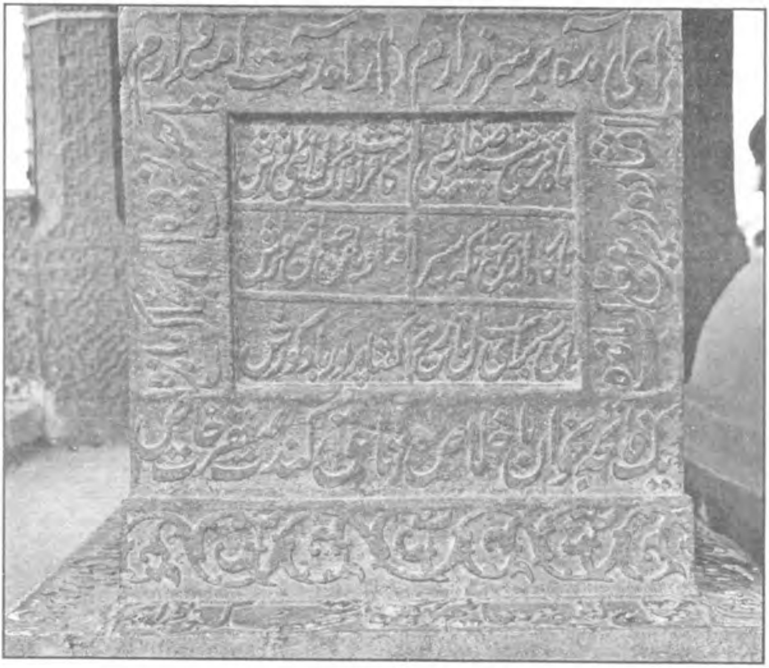

(۴۴) میر صفائی کی قبر

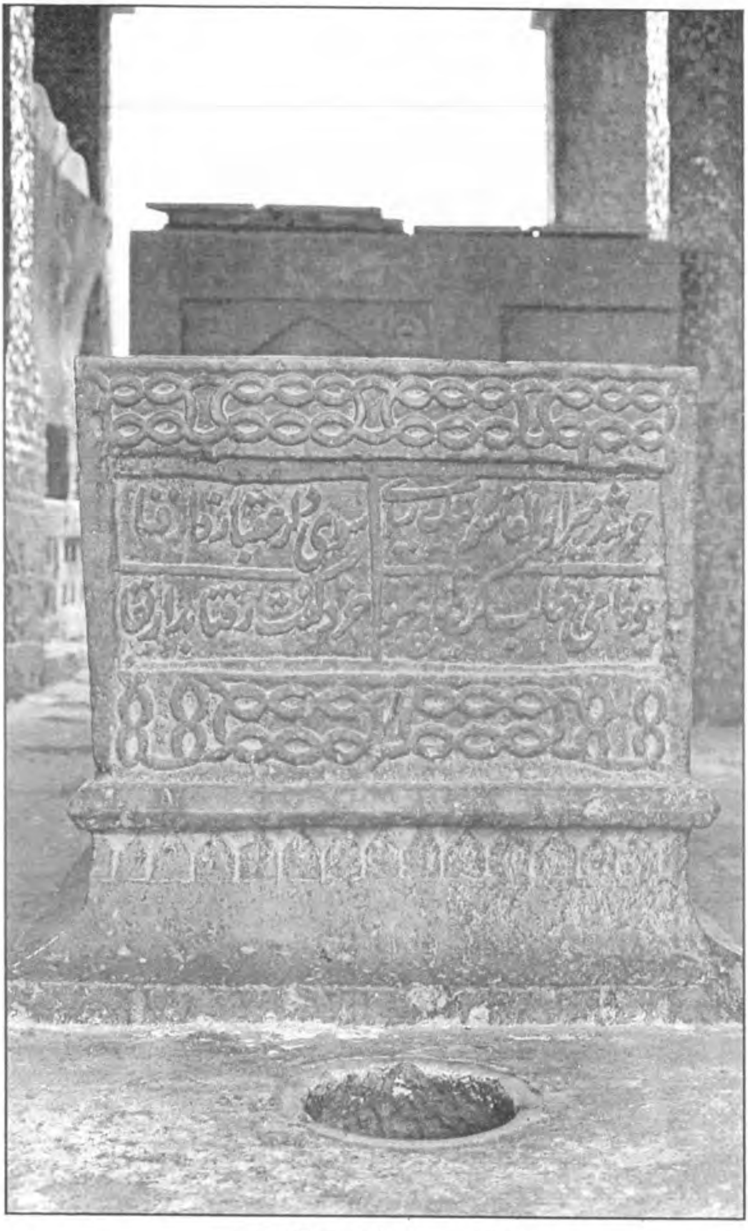

(۴۳) میر ابوالقاسم کی قبر

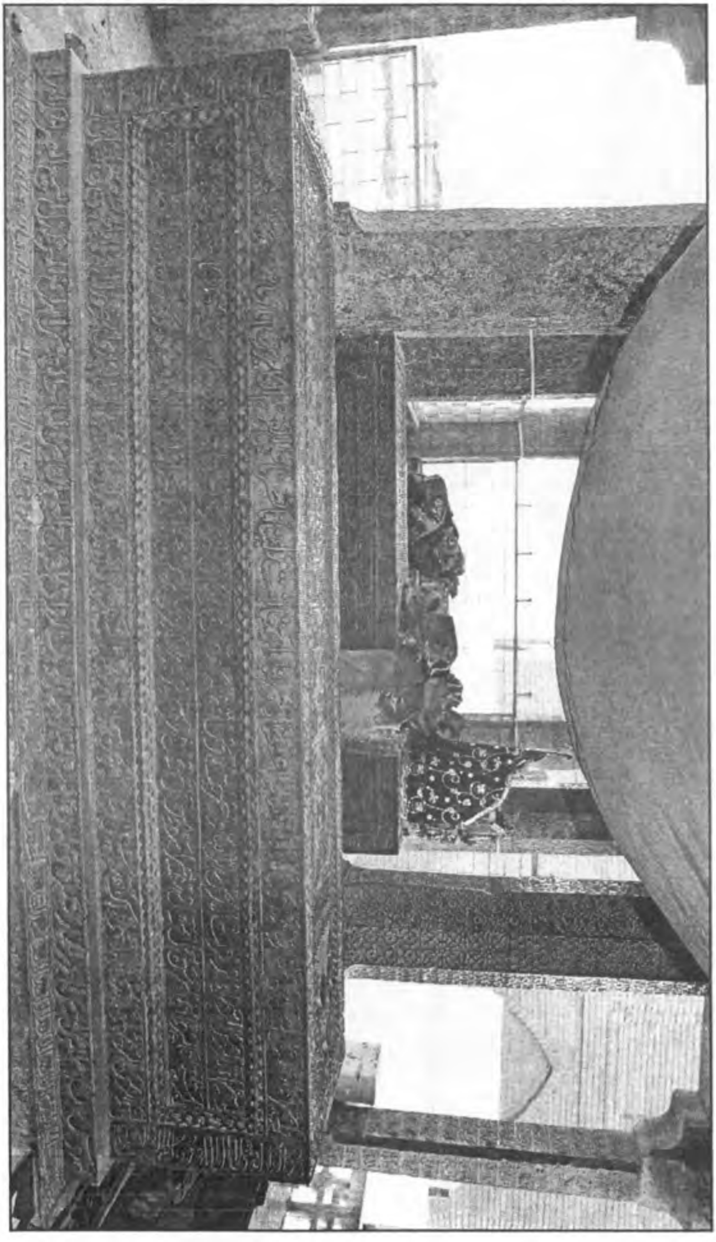

(۳۲) میر معصوم اور سید صفائی کی قبریں

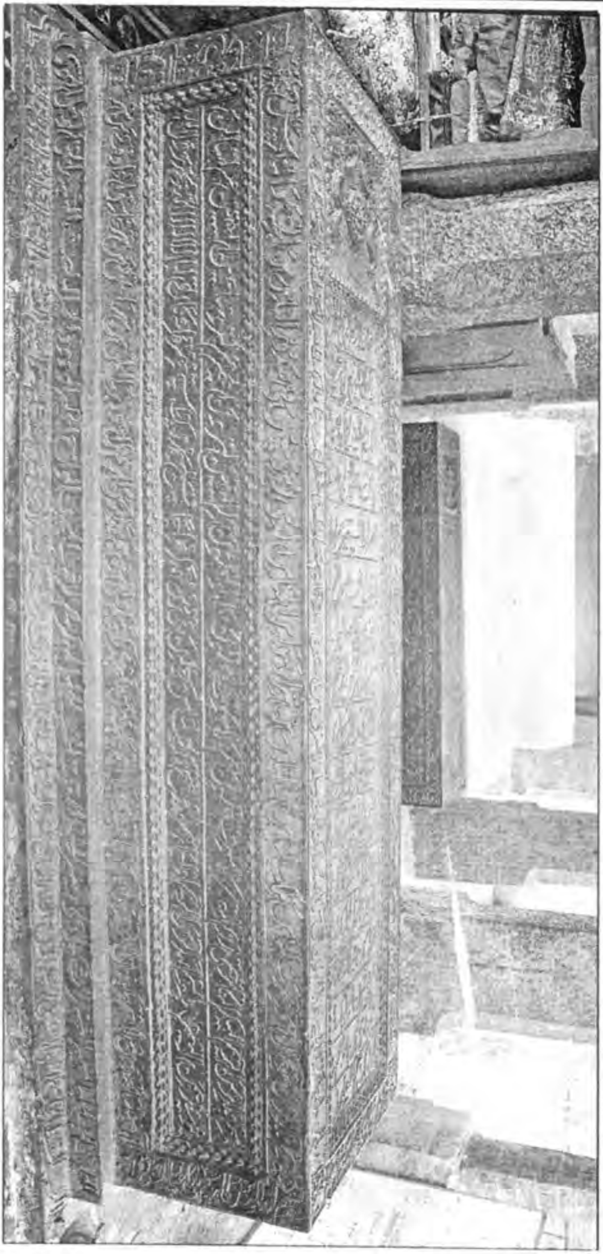

(۳۱) قبروں پر کندہ قرآنی آیات

(۳۹) میر معصوم کی قبر کی چھت اور اس پر کندہ کاری

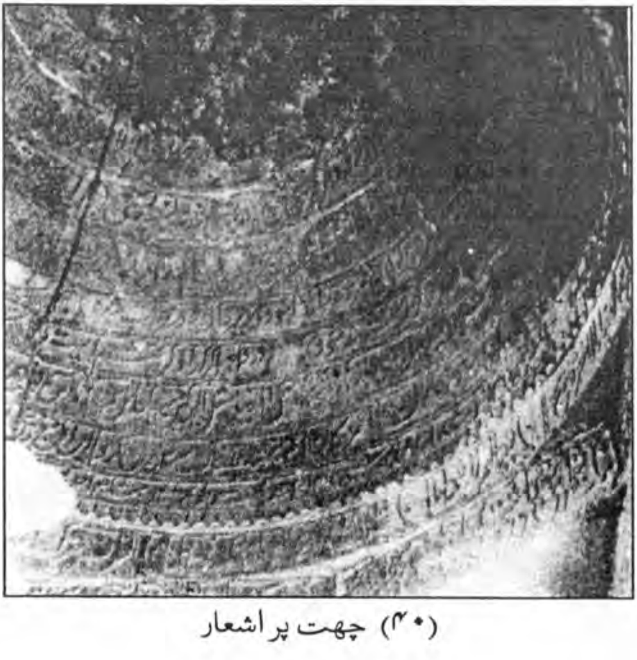

(۴۰) چھت پر اشعار

(۳۸) ایک ستون پر کندہ کاری

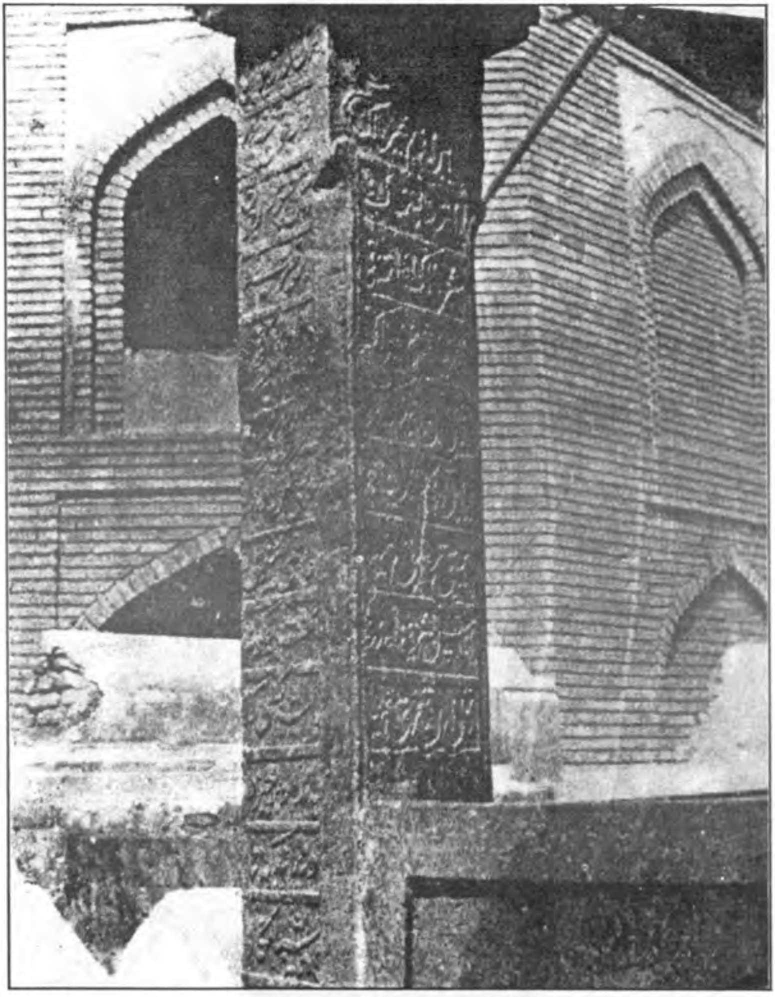

(۳۷) ستونوں پر کندہ کاری

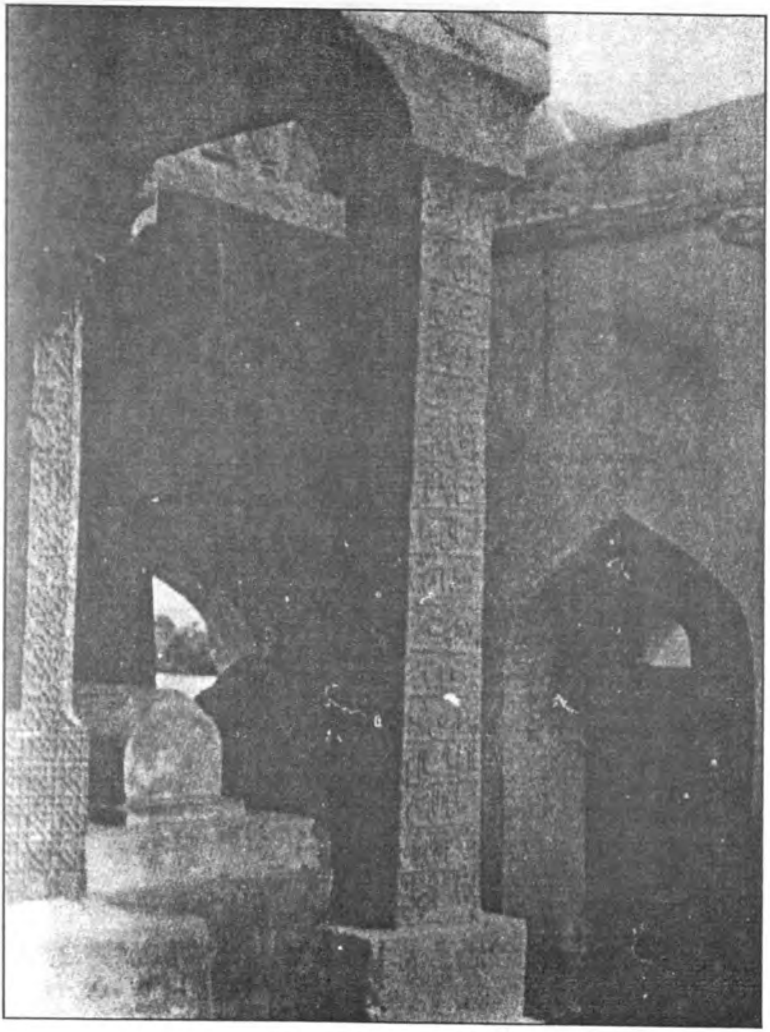

(۳۶) ستونوں پر کندہ کاری

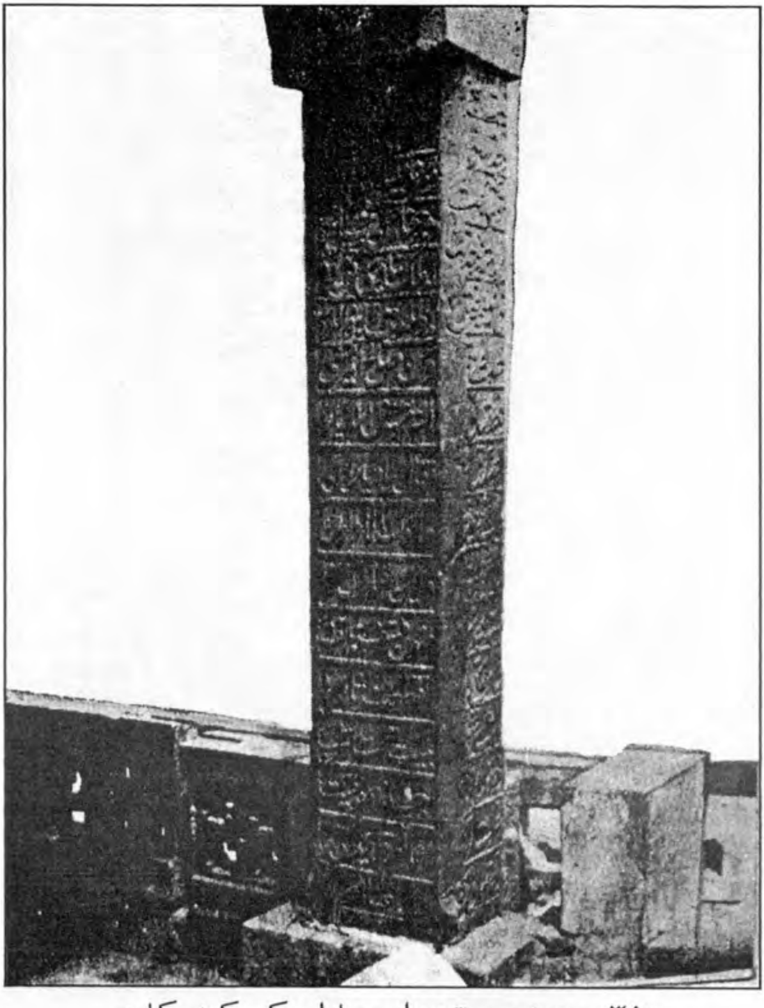

(۳۵) ستونوں پر نقشہ اور عبارات کی کندہ کاری

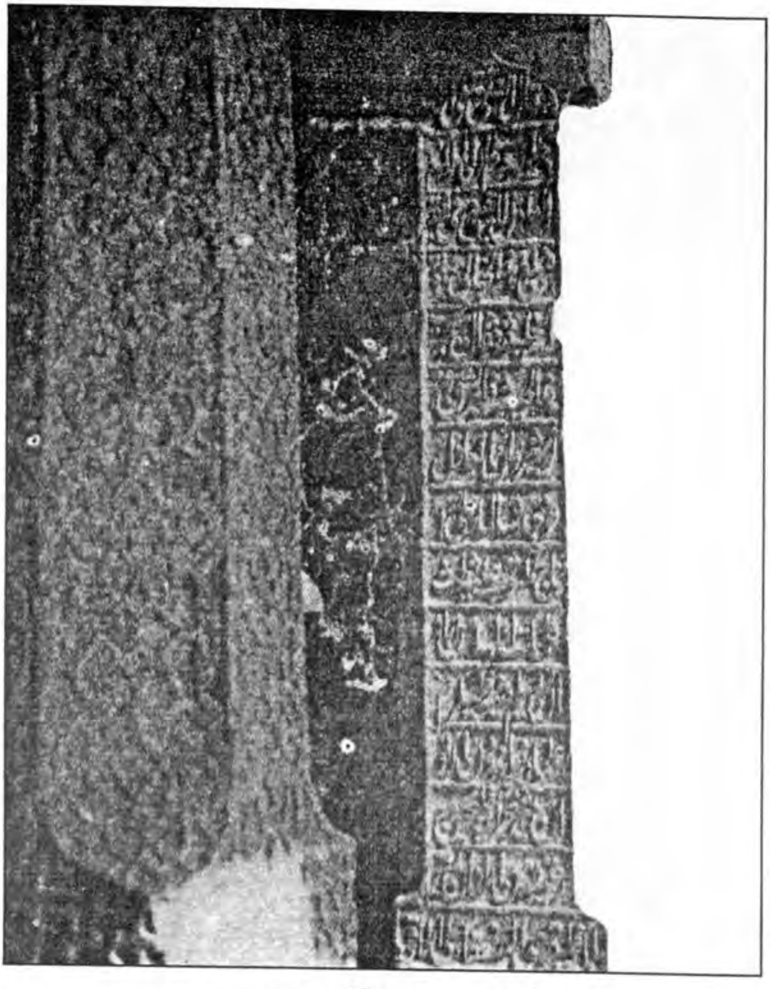

(۳۴) ستونوں پر کندہ تحریریں

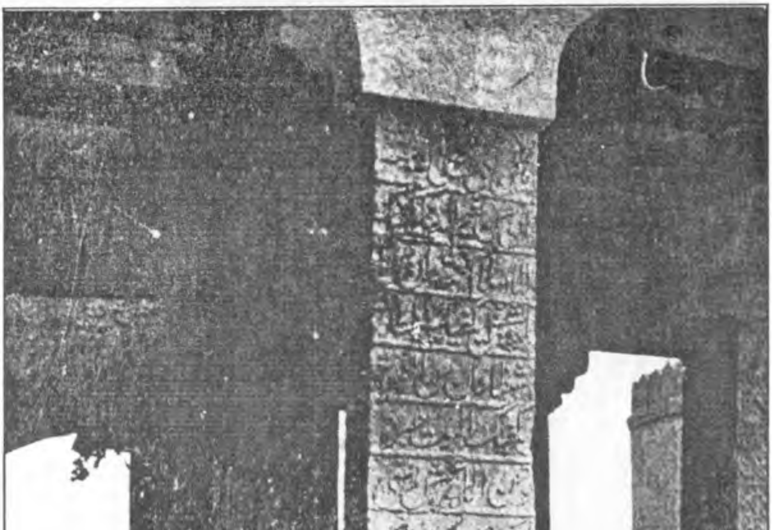

(۳۳) ستونوں پر کندہ تحریریں

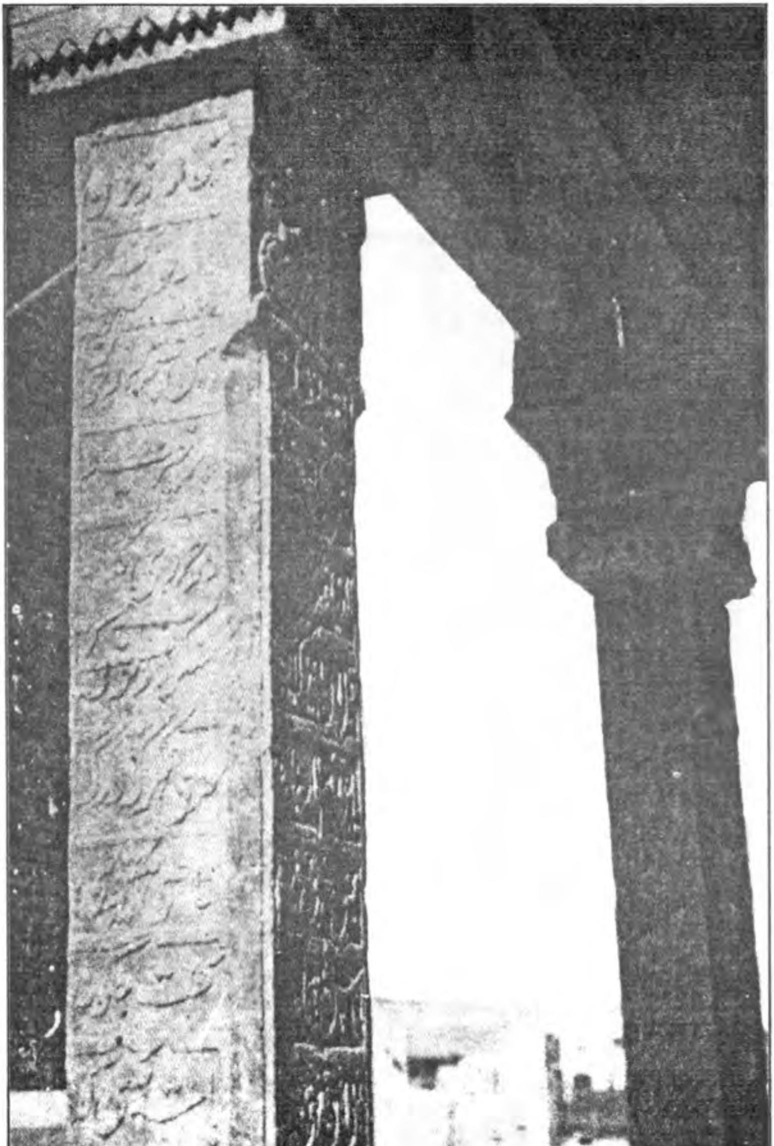

(۳۲) ستونوں پر کندہ تحریریں

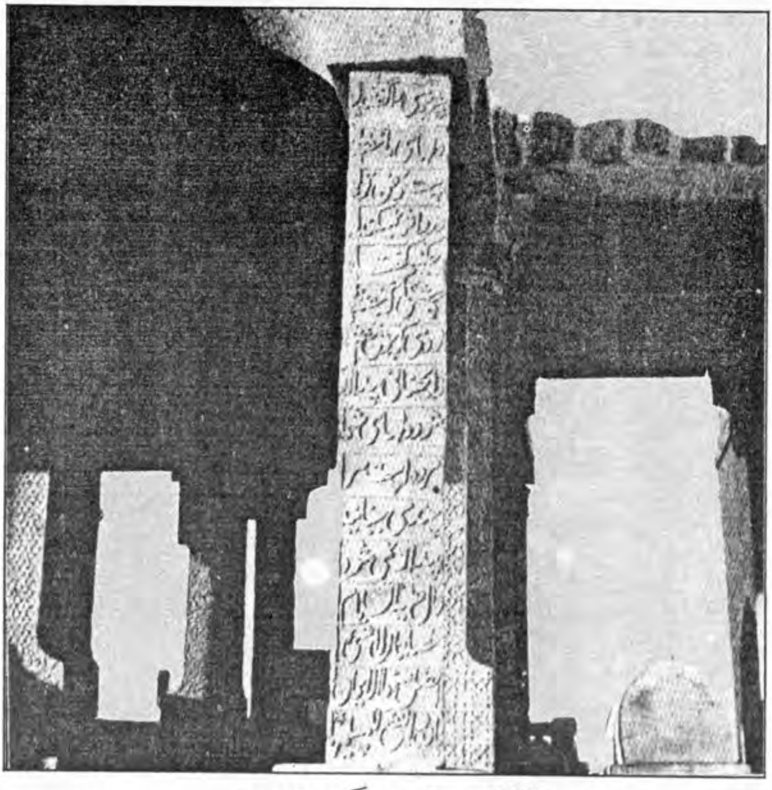

(۳۱) ستونوں پر کندہ تحریریں

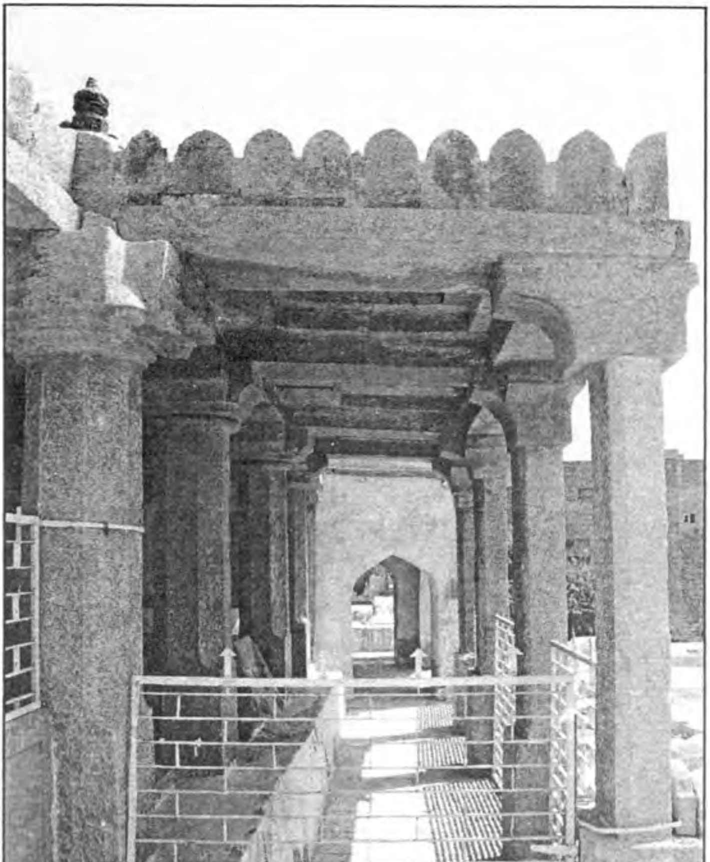

(۳۰) ستونوں پر کندہ عبارات

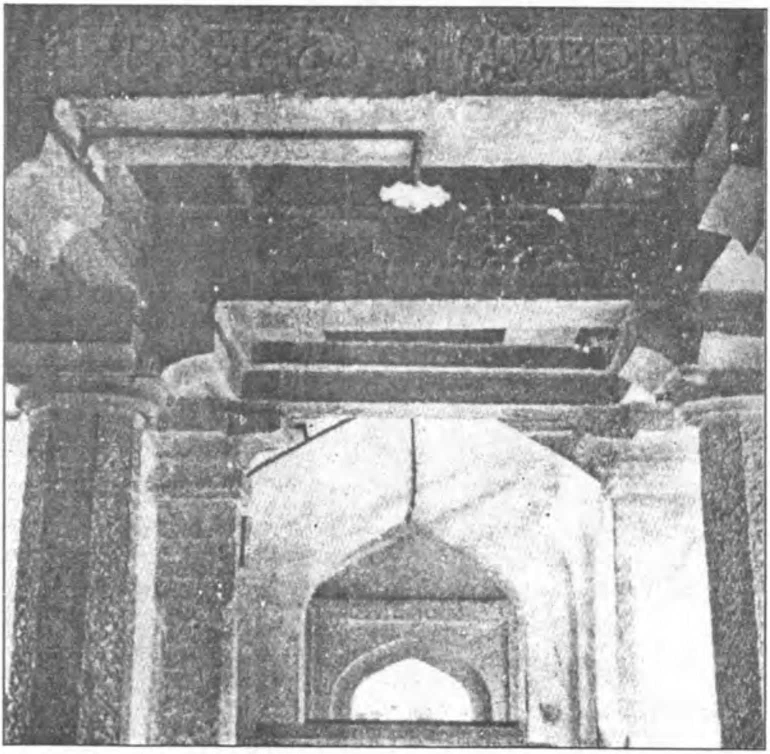

(۲۹) چھت اور ستون پر نقاشی اور کتباب

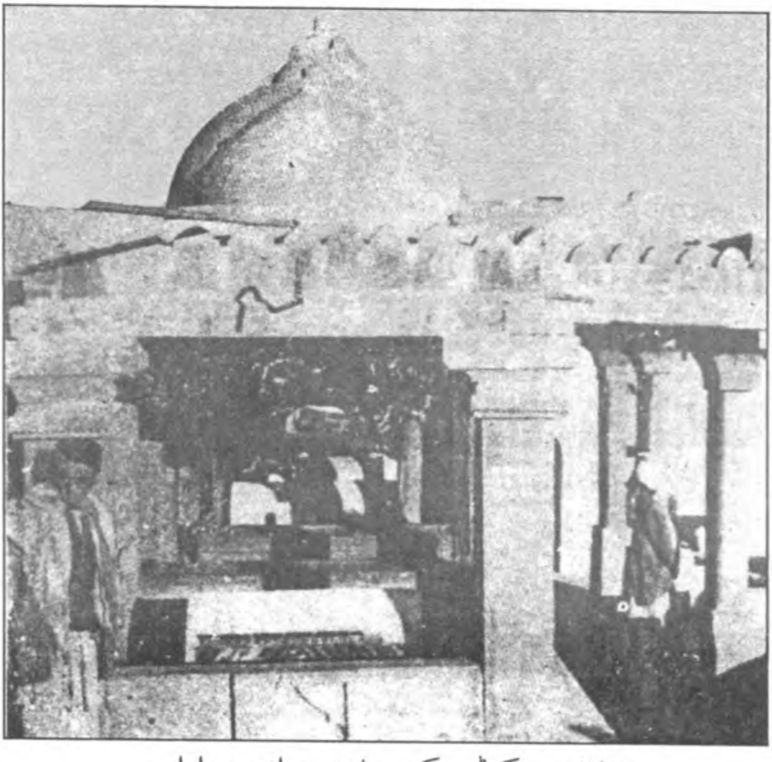

(۲۸) چوکنڈی کی ساخت۔ اندر مزارات

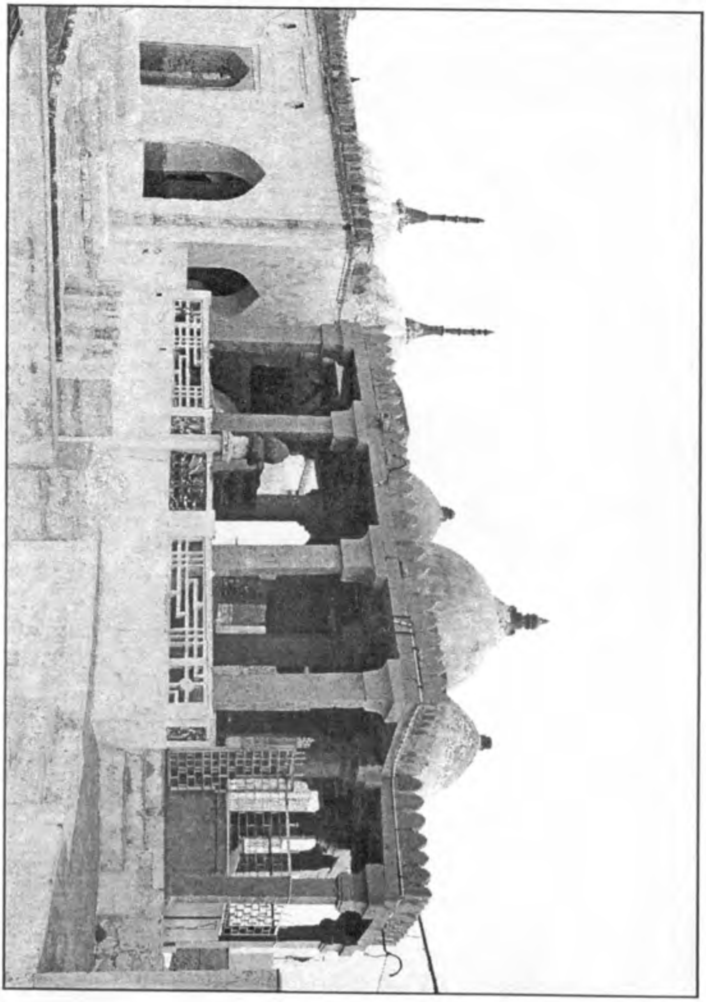

(۲۷) قبروں کی چوکنڈی، عمارت سرکوہ

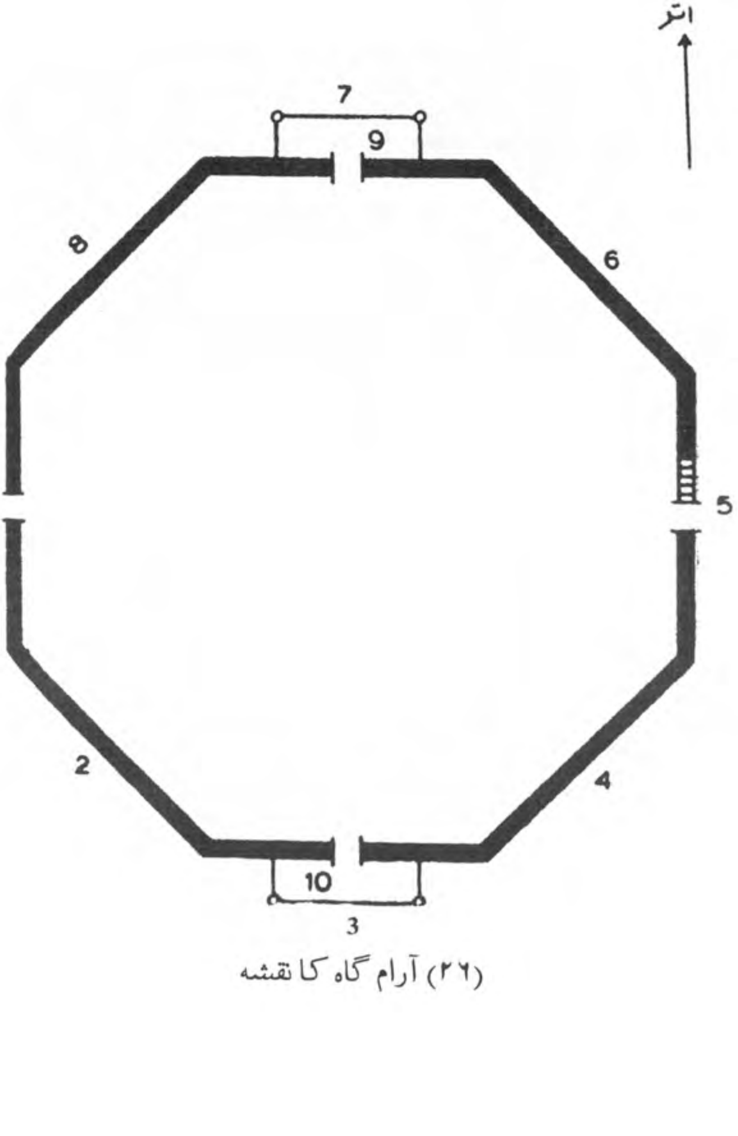

(۲۶) آرام گاہ کا نقشہ

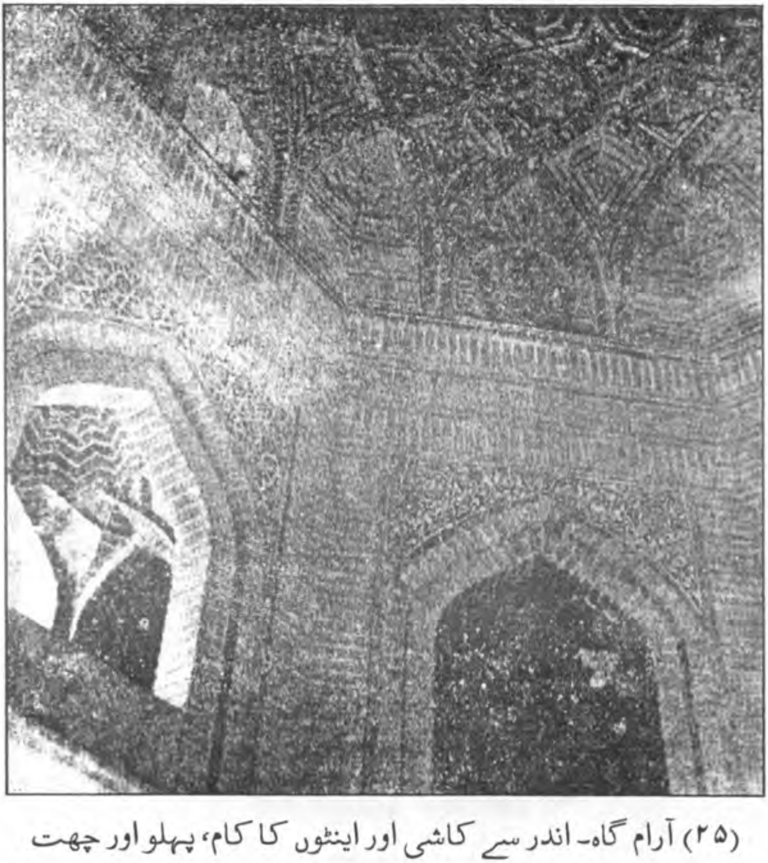

(۲۵) آرام گاہ۔ اندر سے کاشی اور اینٹوں کا کام، پہلو اور چھت

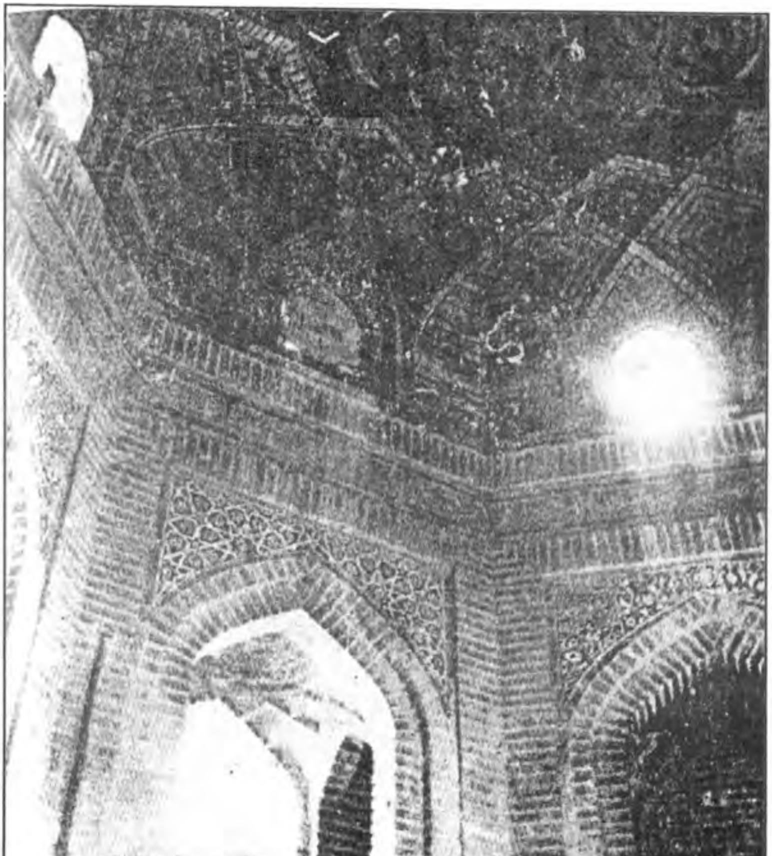

(۲۴) آرام گاہ۔ اندر سے کاشی کا کام، چھت اور پہلو

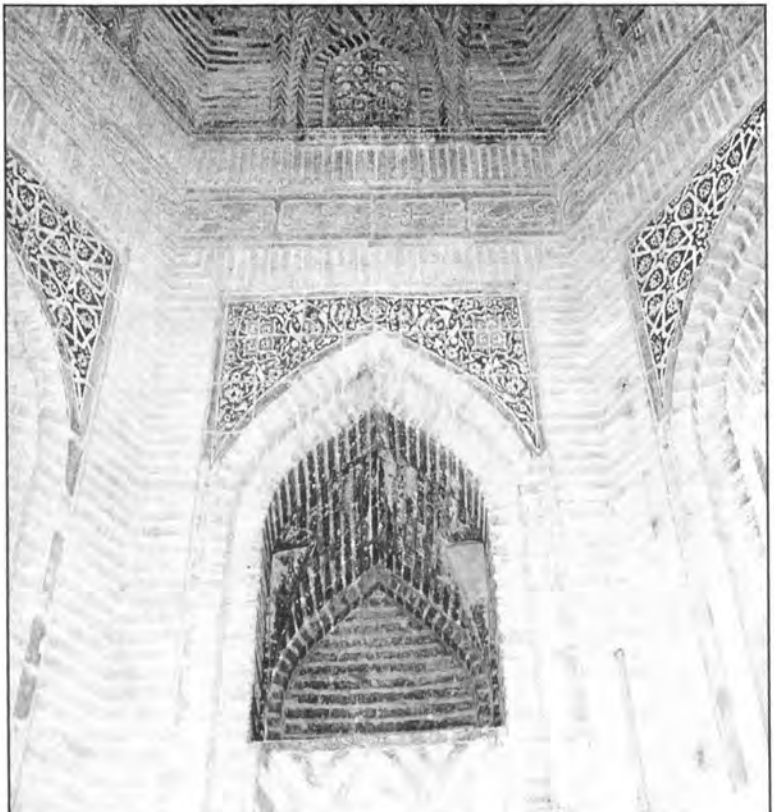

(۲۳) آرام گاہ۔ اندر سے کاشی اور اینٹوں کا کام

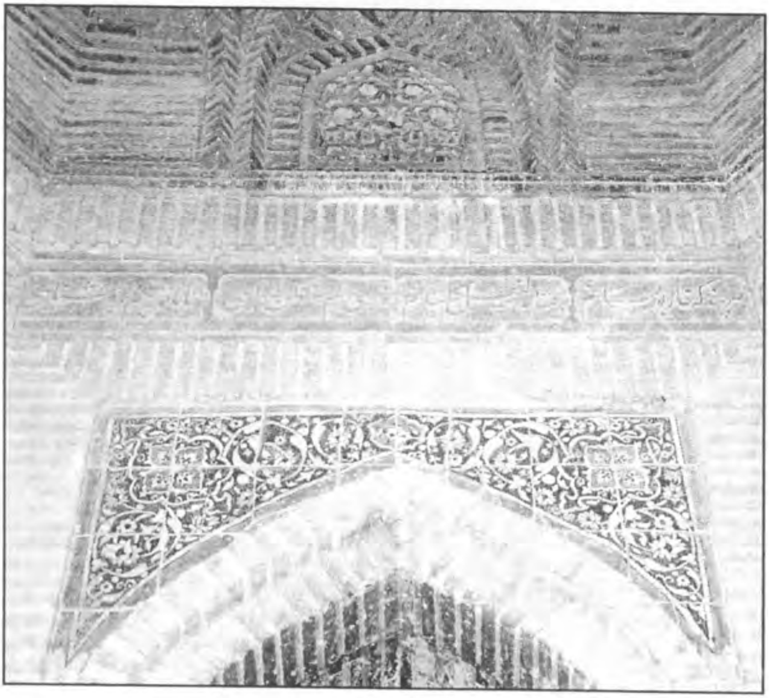

(۲۲) آرام گاہ۔ اندرونی کاشی اور اینٹوں کی ساخت

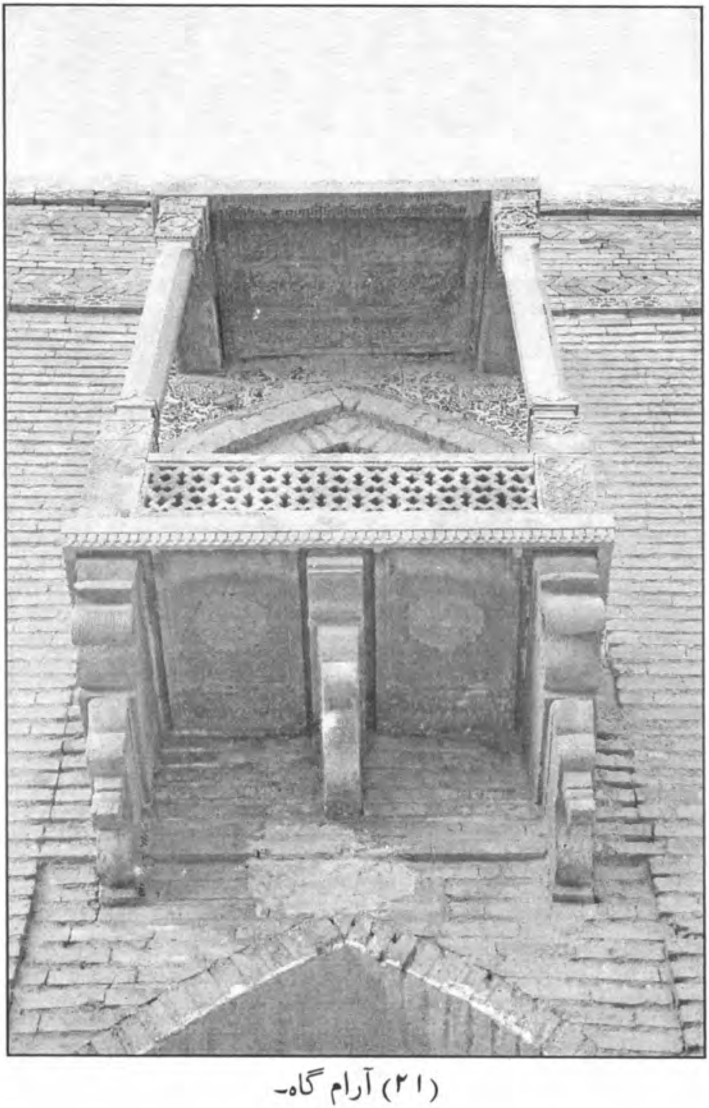

(۲۱) آرام گاہ۔

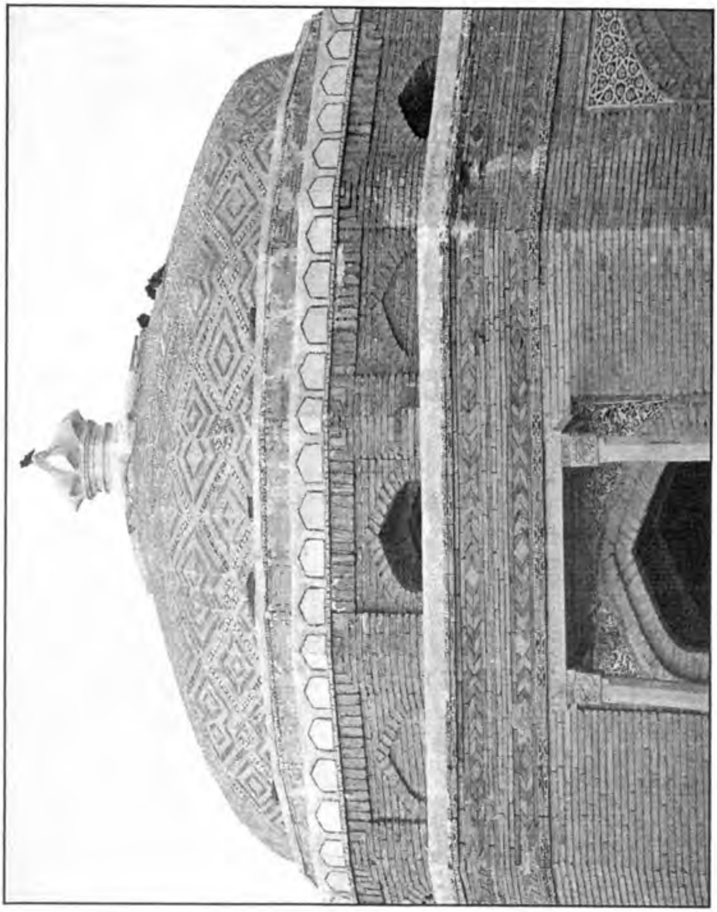

(۲۰) آرام گاہ۔ مکان بافیض

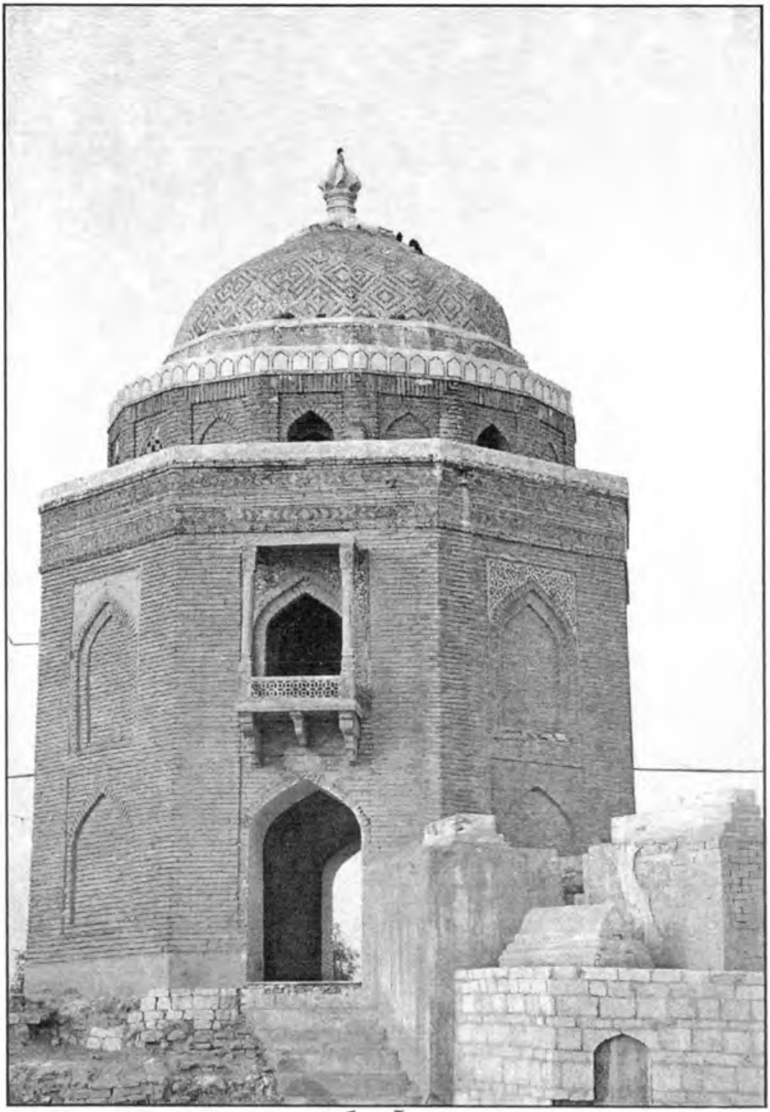

(۱۹) آرام گاہ۔

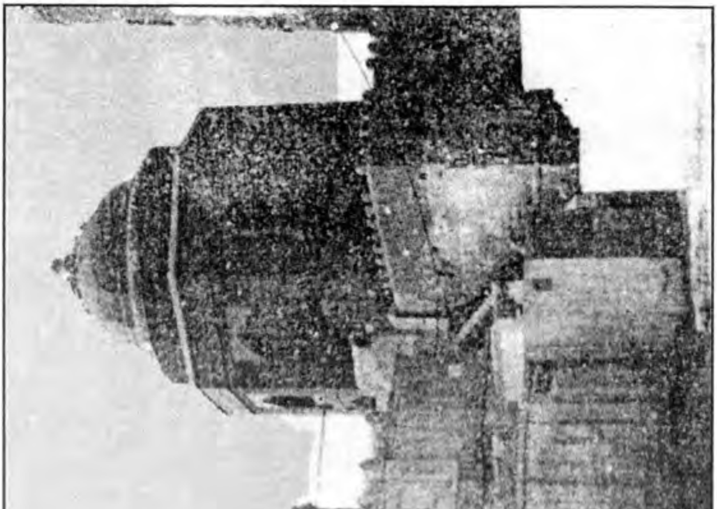

(۱۸) چوکنڈی، آرام گاہ، قبروں کے چبوترے

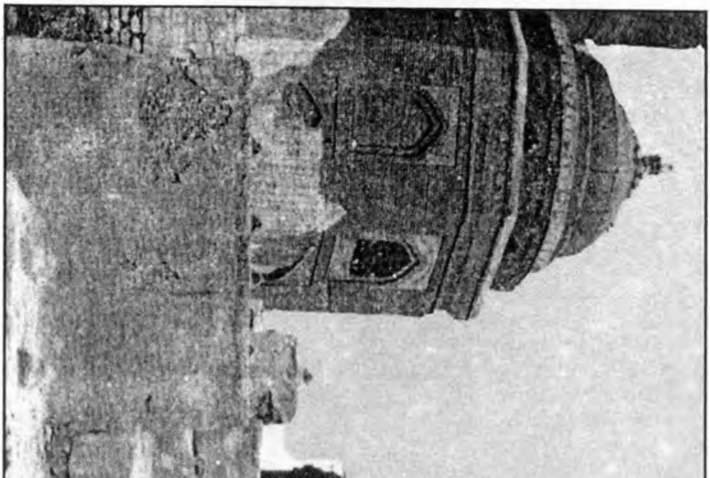

(١٧) چوکنڈی- مینار اور آرام گاہ

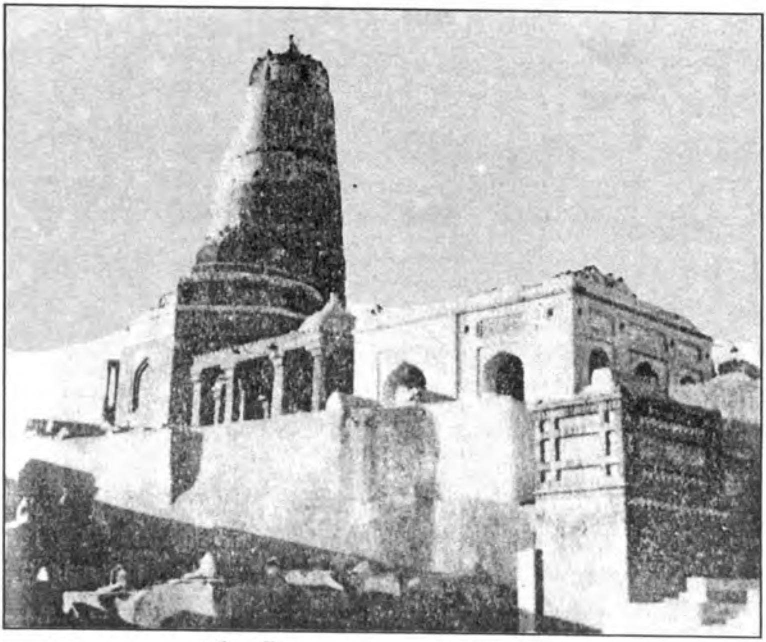

(۱٦) چوکنڈی۔ مینارہ اور آرام گاہ

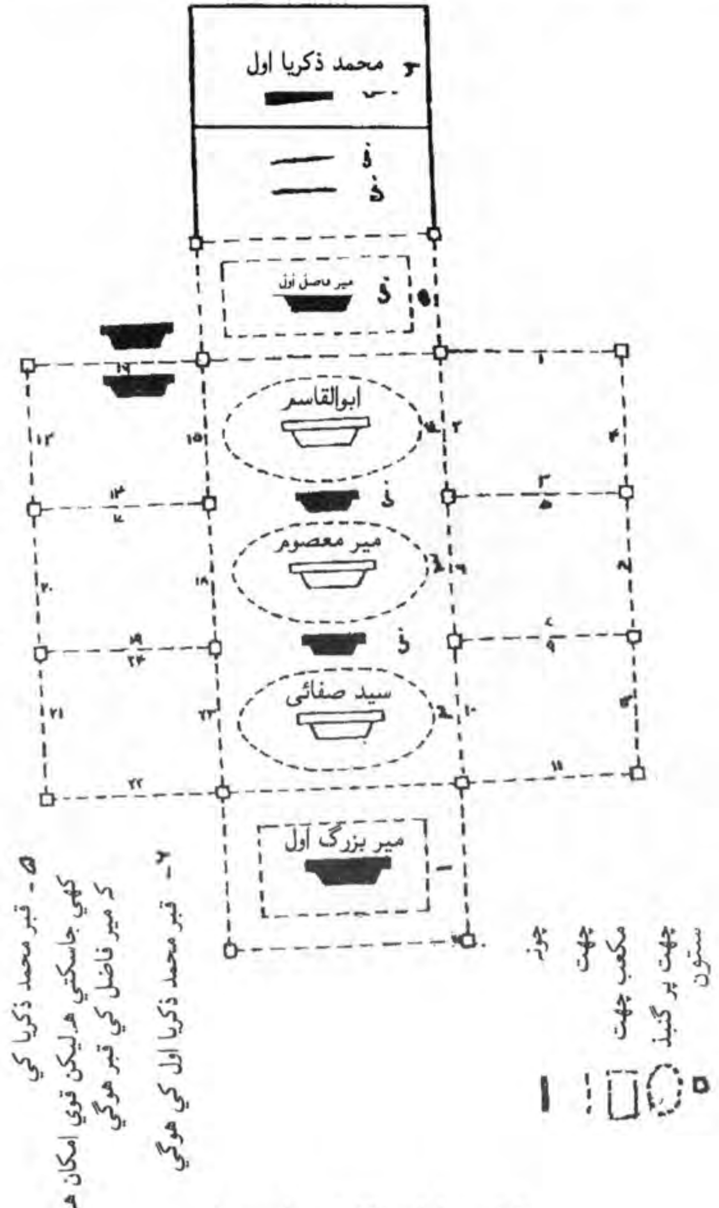

(۱۵) مزارات کا نقشه اور نشان

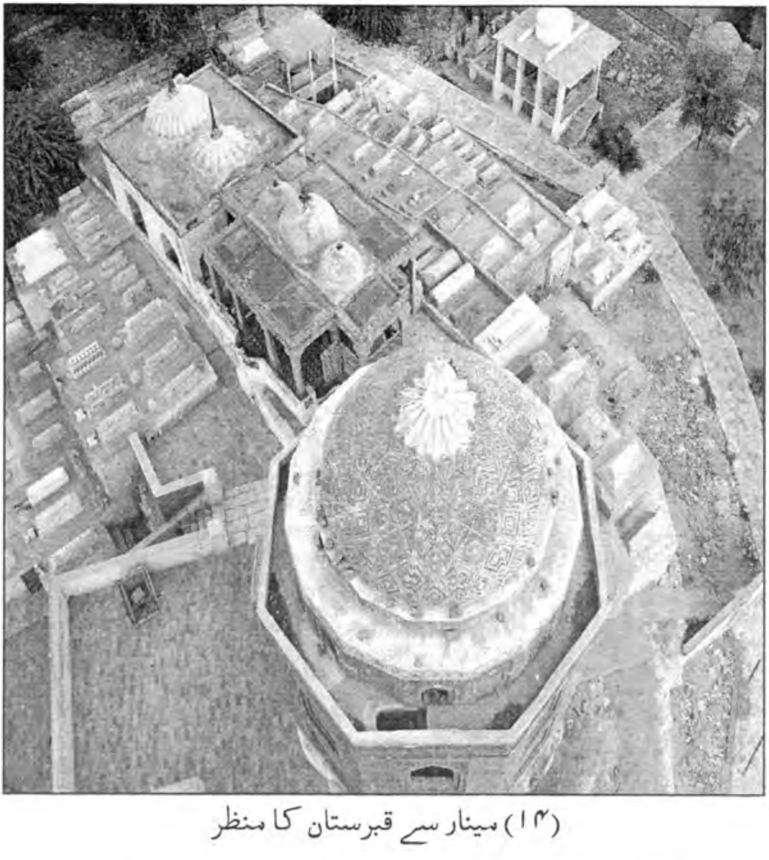

(۱۴) مینار سے قبرستان کا منظر

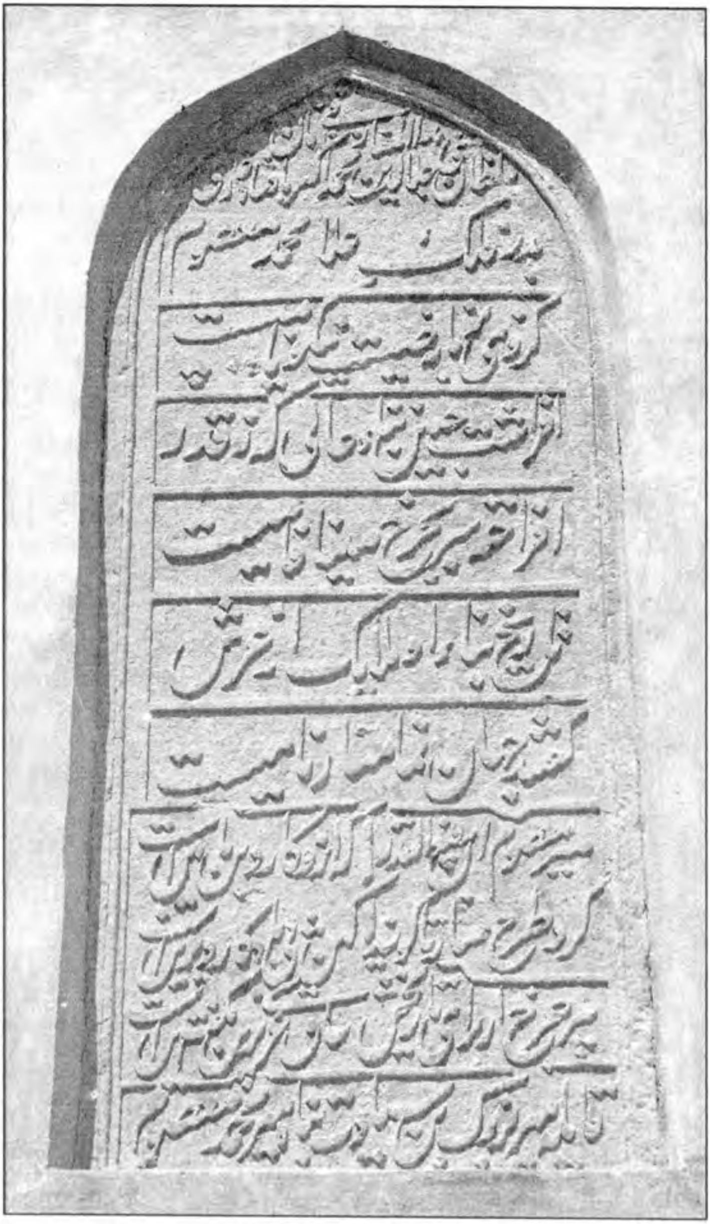

(۱۳) کتبہ (مینار کا)

(۱۲) کتبہ (مینار کا)

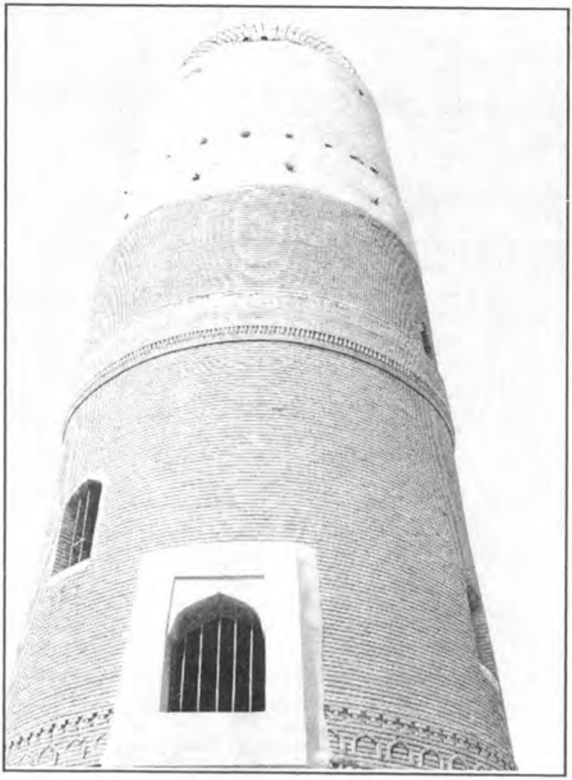

(۱۱) مینار، قریب سے

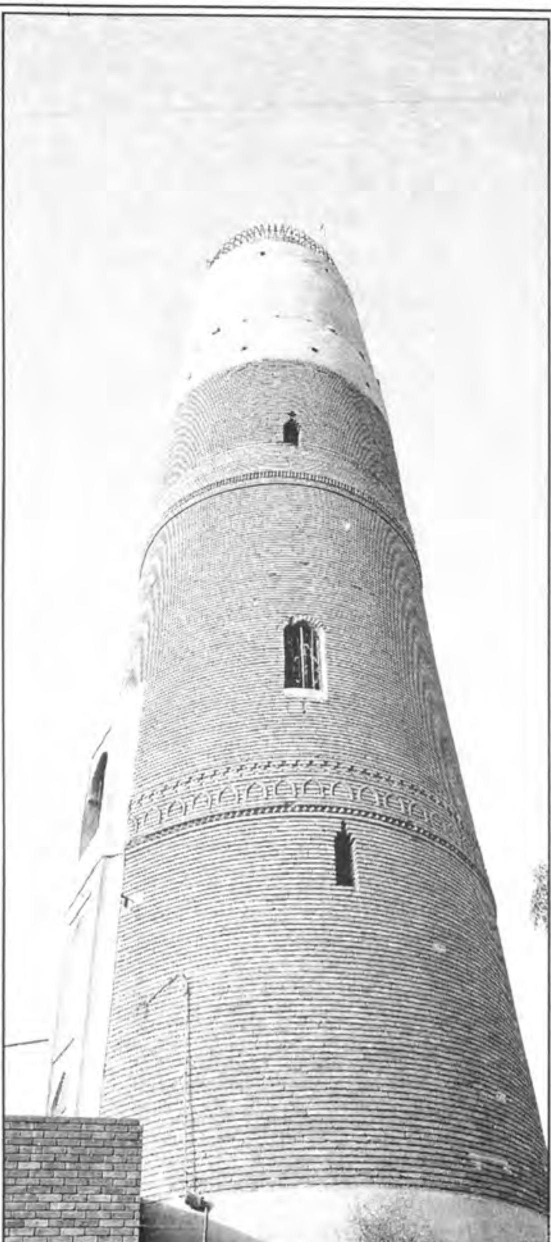

(۱۰) مینار، قریب سے

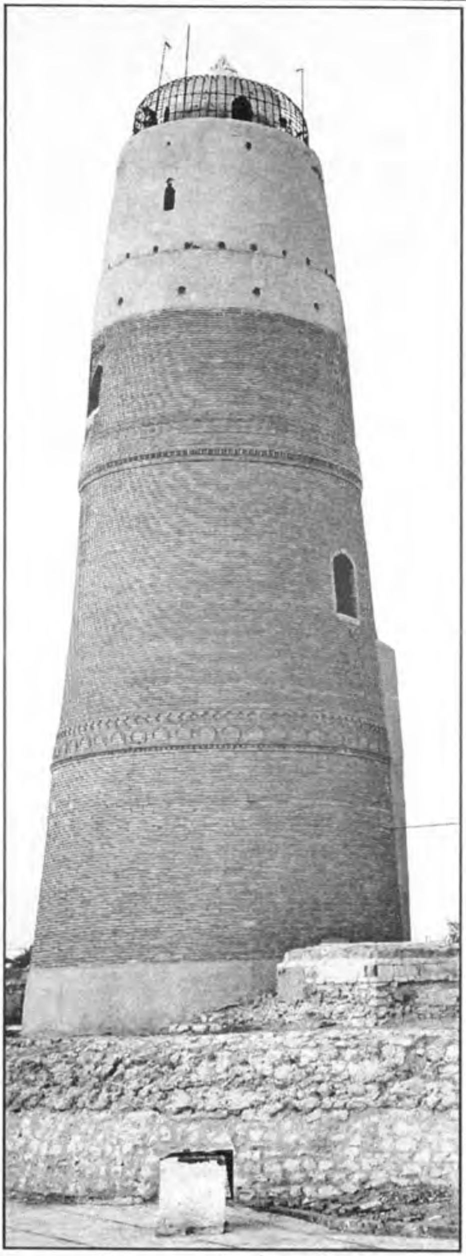

(۹) مینار، قریب سے

(۷) مینار، قریبی منظر

(۸) مینار، قریبی منظر

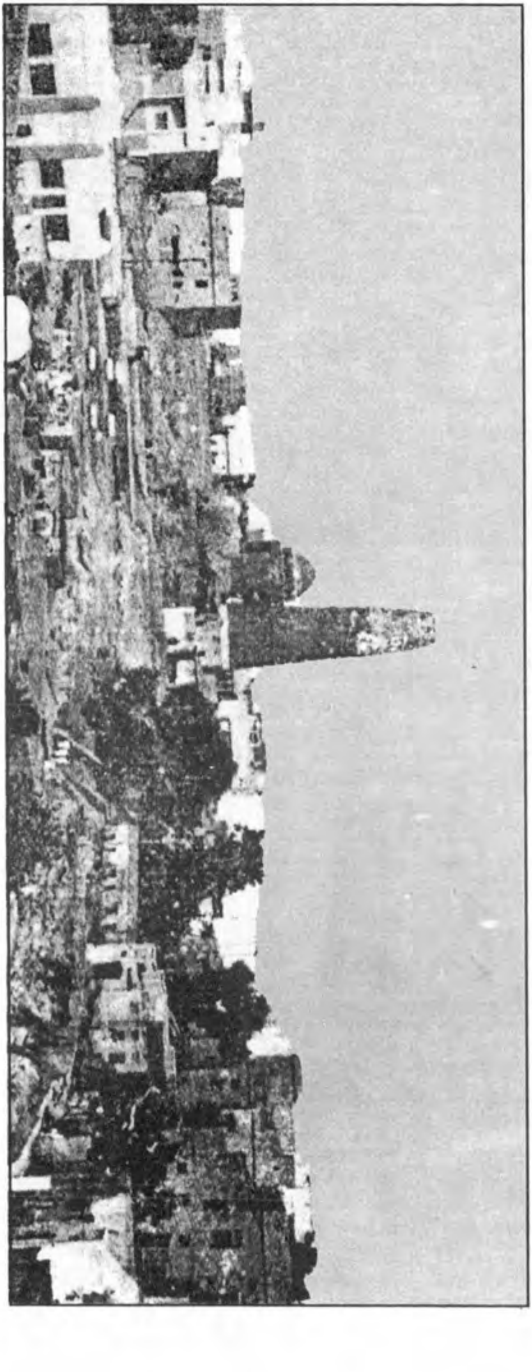

(۲) مینار کا منظر، انگریز دور میں

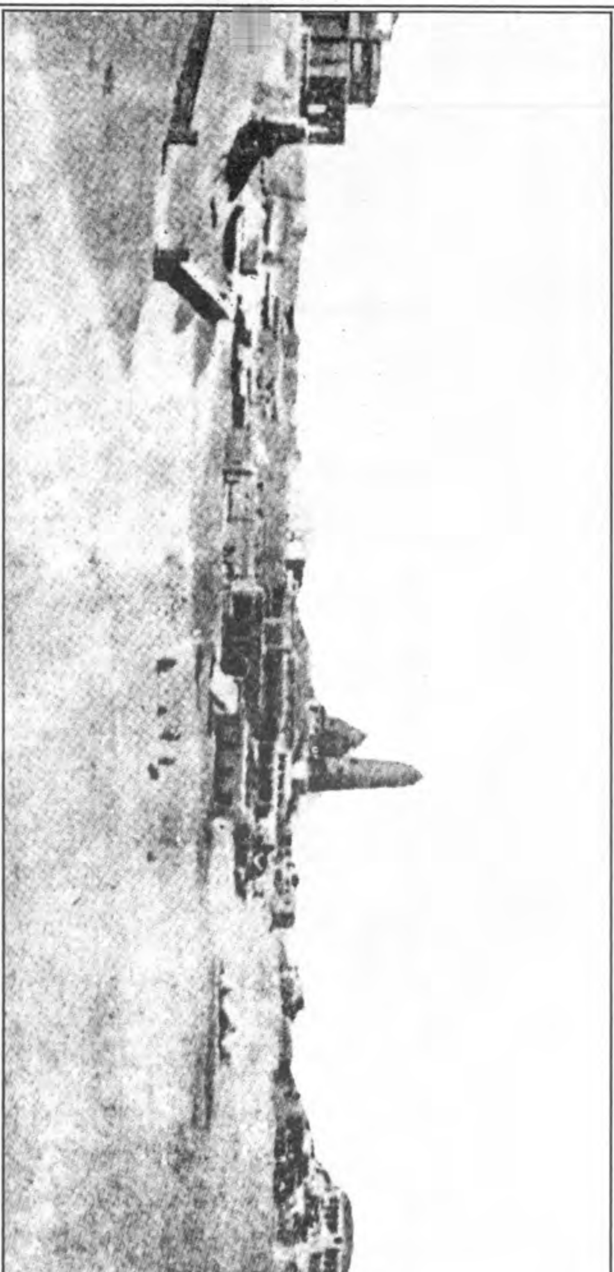

(۵) مینار کا منظر، ۱۵۰ برس قبل

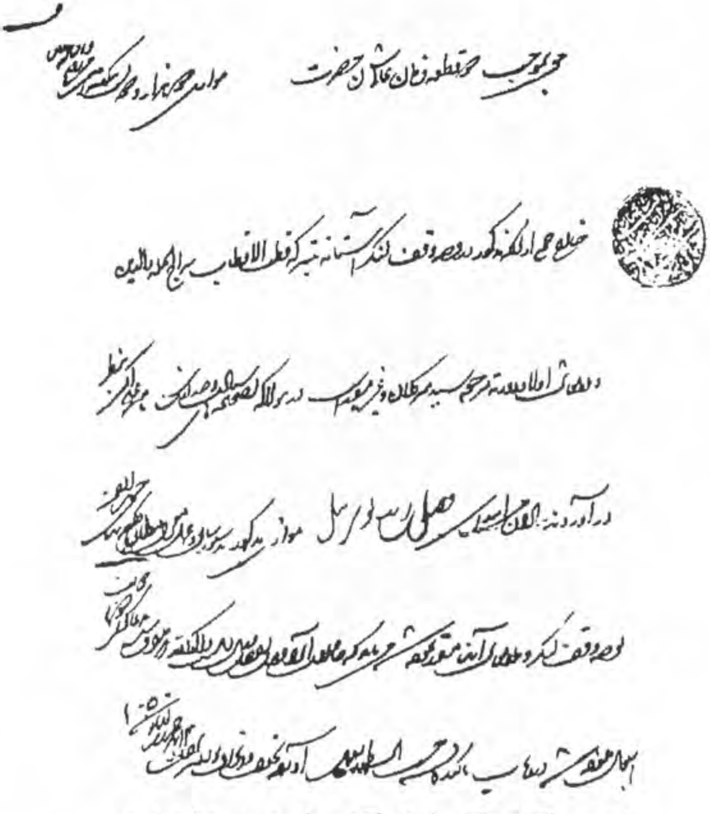

(۴) میر کلاں کی اولاد کا پروانہ (سنہ ۱۰۵۰ء)

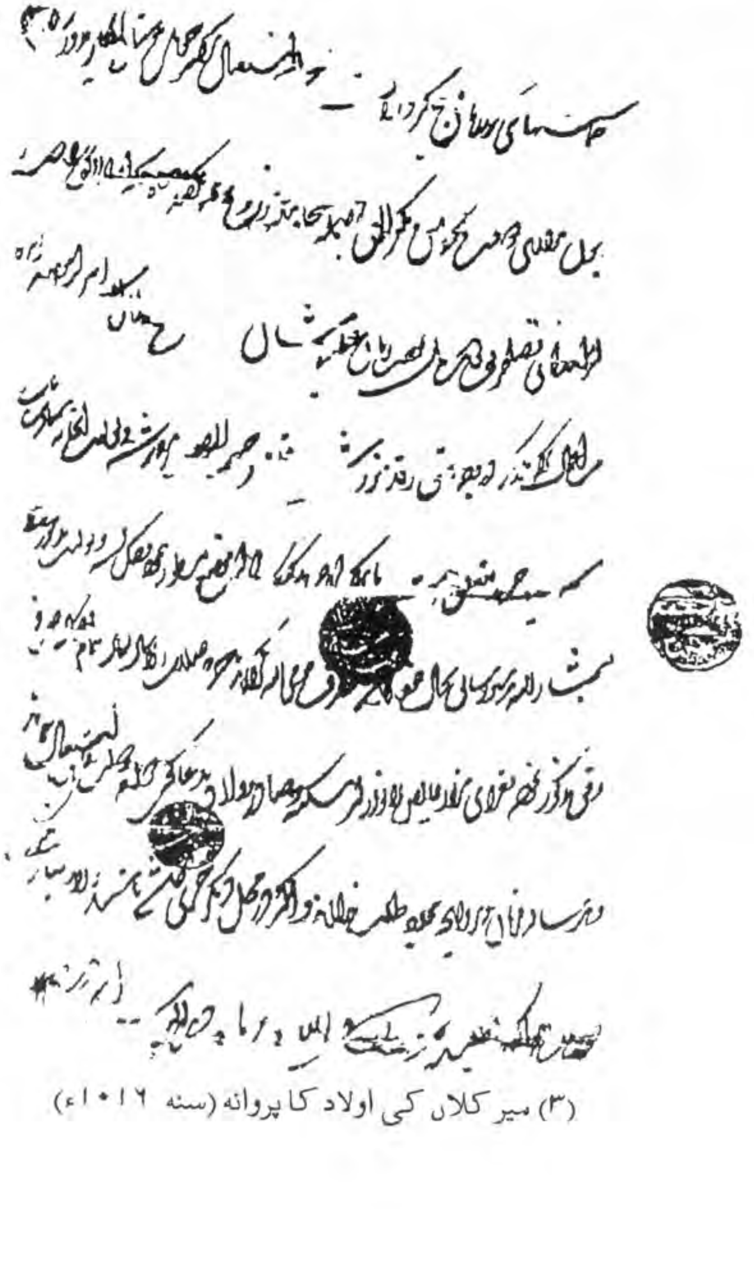

(۳) میر کلاں کی اولاد کا پروانہ (سنہ ۱۰۱۶ء)

(۱) سہون: میر کلاں کا مزار

(۲) سہون: میر کلاں کا مزار